مقالہ

برائے پی ایچ۔ڈی۔(اردو)

اردو ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کا تنقیدی تجزیہ

مقالہ نگار

حمران احمد

اندراج نمبر:1101010102

نگراں

پروفیسر ابوالکلام

صدر شعبۂ اردو

اسکول برائے السنہ،لسانیات اور ہندوستانیات

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، گچی باؤلی، حیدرآباد۔32

DECLARATION

hereby, delare that this Thesis entitled '' Urdu Noveloun Mein jad-o-Jahed-e-Azadi ki Akkasi ka Tanqeedi Tajziya '' is an original research carried out by me, No part of this Thesis was published, or submitted for any other University / institution for the award of any Degree / Diploma.

Humran Ahmad
Research Scholar
Enrolment No .1101010102

Place : Hyderabad
Date:30/08/2016

CERTIFICATE

This is certify that the Thises entitled " Urdu Noveloun Mein jad-o-Jahed-e-Azadi ki Akkasi ka Tanqeedi Tajziya "submitted for the award of the Degree of Doctor of Philosophy in Urdu, Dept. of Urdu at School of Language, Linguistics & Indology, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad, is the result of the orignal reasearch work carried out by Mr. Humran Ahamad under my supervision and to the best of my knowledge and belief , the work embodied in this dissertation does not from part of any thesis /dissertation already submitted to any University / institution for the award of any degree/ diploma.

Professor : Abul Kalam
Supervisor

Professor.Abdul Kalam
Head of Dept. of Urdu

Prof. Naseem uddin Farees
Dean , School of Languages, Linguistics & Indology

فہرست

نمبر شمار		صفحہ نمبر
	پیش لفظ	i
	اظہار تشکر	iv
باب اول: ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت		1
ذیلی ابواب		
(1)	ہندوستان میں مغربی اقوام کی آمد و یورش	2
(2)	سلطنتِ مغلیہ کا زوال	11
(3)	ہندوستان پر انگریزوں کا شرمناک دور	20
(4)	ہندوستان میں برطانوی حکومت کا تسلط	26
باب دوم: ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ہندوستان کا منظر نامہ		51
ذیلی ابواب		
(1)	سیاسی پس منظر	52
(2)	معاشی پس منظر	87
(3)	بین الاقوامی پس منظر	97
(4)	سماجی و ثقافتی پس منظر	110
باب سوم: مختلف تحریکات و رجحانات اور تحریکِ آزادی کی اردو ناول		125
ذیلی ابواب		
(1)	سرسید تحریک	126

(2) رومانوی تحریک 133
(3) ترقی پسند تحریک 136
(4) حلقۂ ارباب ذوق 146
(5) جدیدیت 151
باب چہارم: اردو ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ 155

ذیلی ابواب

(1) سماجی 156
(2) تاریخی 164
(3) سیاسی 170
(4) تہذیبی 181
(5) نفسیاتی 185
باب پنجم: اردو ناولوں میں جدوجہدِ آزادی کی عکاسی کا فنی تنقیدی تجزیہ 189

ذیلی ابواب

(1) پلاٹ 190
(2) کردار نگاری 199
(3) زمان ومکان 212
(4) اسلوب بیان 219
(5) مقصد حیات 226
حاصل مطالعہ 234
کتابیات 247

☆☆☆

پیش لفظ

مسلم سلطنت کا آفتاب غروب ہوجانے پر انگریزی سلطنت کا دور شروع ہوا اور ہمارا ملک ہندوستان ایک زمانے تک انگریزوں کی غلامی کی زنجیر میں جکڑا رہا۔ایک قوم جس نے تجارت کی غرض سے ہندوستان کا رخ کیا تھا، رفتہ رفتہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل کرلیا۔ طاقت کے نشے میں چور انگریز حکومت نے ہمیشہ ہندوستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور ہندوستانیوں کے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، دھیرے دھیرے ہندوستان کے اصل وارثوں کو دوسرے درجے کا شہری بنادیا۔لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ظلم کی انتہا مظلوموں کو حوصلہ عطا کرتی ہے، نتیجتاً ظالم کو مظلوم ہونا پڑتا ہے چنانچہ ظلم کی انتہاء نے ہندوستانی قوم کو بیدار کردیا اور ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ دھیرے دھیرے طوفان کی شکل اختیار کرتا گیا۔ لاکھوں ہندوستانیوں کے دلوں میں موجزن یہ طوفان ۱۸۵۷ء میں ایک انقلاب کی شکل میں رونما ہوا جس سے ملک کے بیشتر حصوں میں حکومت برطانیہ کے تسلط کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا، جس کو ہم پہلی جنگ آزادی کا نام دیتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ضرور ہوگئی ،لیکن اس سے ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ انگریز ناقابل شکست نہیں ہیں، اگر ان سے برابری کی سطح پر جنگ کی جائے تو ان پر فتح پائی جاسکتی ہے، چنانچہ رفتہ رفتہ ہندوستانی عوام انگریزوں کے خلاف مختلف صورتوں میں منظّم اور متحد ہونے شروع ہوگئے ۔آہستہ آہستہ ان میں غیر ملکی تسلط سے آزاد ہونے کا احساس تیز تر ہونے لگا۔انگریزی زبان کی تعلیم، نسلی تنازع اور ان کی معاشی ابتری کی وجہ سے ہندوستان کے عوام میں قومی شعور اور سیاسی احساس پیدا ہوا ۔ انیسویں صدی کی مذہبی اور اصلاحی تحریکوں نے اس شعور اور احساس کو بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پریس واخبارات نے لوگوں میں قومی جذبات واحساسات کی تبلیغ کی ،جن کے نتیجے میں لاکھوں ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کی ایک تڑپ پیدا ہوئی ۔۱۸۸۵ء میں انڈین

نیشنل کانگریس کا وجود سامنے آیا اور پھر آزادی حاصل کرنے کی ایک مکمل تحریک کی شروعات ہوئی۔اس طرح طویل جدوجہد کے بعد ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

آزادی سے قبل ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کا دور ہندوستان کی تاریخ کا اندوہ ناک باب ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے،جس میں غیر ملکی طاقت مختصر سے عرصے میں ہندوستان کے سیاہ وسفید کی مالک بن گئی تھی۔اس نے باشندگان وطن کے ساتھ ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے جس کی یاد آج بھی ہمارے اوپر لرزہ طاری کر دیتی ہے۔ ہندوستانیوں کو اپنے ہی گھروں میں زندگی گزارنا مشکل ہو گیا تھا۔ایسی صورت حال میں ظاہر ہے ایک ادیب کیسے خاموش رہ سکتا ہے۔ادیب حقیقت میں وہی ہوتا ہے جو اپنے گرد پائے جانے والے سماجی وسیاسی مسائل کی موثر اور فنکارانہ تصویر پیش کرتا ہے۔چنانچہ جب ہم اپنے ذخیرۂ ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تمام اصناف میں اس وقت کے سیاسی وسماجی مسائل اوران کے حل کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

اردو ادب کی ایک اہم صنف ناول ہے،جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ناول یہ ایک ایسا آئینہ ہے،جس میں انفرادی واجتماعی زندگی کے اندرونی وبیرونی سارے روپ دیکھے جاسکتے ہیں، لہٰذا ناول میں سیاسی وسماجی مسائل کی عکاسی جس خوبی کے ساتھ کی جاسکتی ہے،شاید ہی کسی صنف میں کی جاسکے۔چنانچہ جب ہم نے جدوجہد آزادی کے حوالے سے اردو ناولوں کا مطالعہ کیا تو یہ بات کھل کر سامنے آئی کی ہمارے ناول نگاروں نے آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد بہت سے ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کی ہے۔میرے لٹریچر سروے کے مطابق اب تک کسی نے اردو ناولوں پر جدوجہد آزادی کے حوالے سے باقاعدہ کام نہیں کیا ہے۔لہٰذا میں نے اس پر پی،ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا۔

یہ مقالہ پانچ ابواب،پیش لفظ،اظہار تشکر،حاصل مطالعہ اور کتابیات پر مشتمل ہے۔

اجمالی خاکہ

باب اول: ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت

باب دوم: ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک کے ہندوستان کا منظر نامہ

باب سوم: مختلف تحریکات ورجحانات اور تحریک آزادی کے اردو ناول

باب چہارم: اردو ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ

باب پنجم: اردو ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کا فنی تنقیدی تجزیہ

حاصل مطالعہ

باب اول کو ذیلی عناوین، ہندوستان میں مغربی اقوام کی آمد و یورش، سلطنت مغلیہ کا زوال، ہندوستان پر انگریزوں کا شرمناک دور اور ہندوستان پر برطانوی حکومت کا تسلط میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان سے متعلق بڑی جامعیت اور قطعیت سے بحث کی گئی ہے۔

باب دوم کو ذیلی عناوین سیاسی پس منظر، معاشی پس منظر، بین الاقوامی پس منظر اور سماجی وثقافتی پس منظر میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

باب سوم کو ذیلی عناوین سرسید تحریک، رومانوی تحریک، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور جدیدیت میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان تحریکات کے زیر اثر جدوجہد آزادی کی عکاسی کرنے والے ناولوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

باب چہارم کو ذیلی عناوین سماجی، تاریخی، سیاسی، تہذیبی اور نفسیاتی میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کے تحت جدوجہد آزادی کی عکاسی کرنے والے ناولوں کا فنی تنقیدی تجزیہ کیا گیا۔

باب پنجم کو ذیلی عناوین، پلاٹ، کردار نگاری، زمان ومکان، اسلوب بیان اور مقصد حیات میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کے تحت جدوجہد آزادی کی عکاسی کرنے والے ناولوں کا فنی تنقیدی تجزیہ کیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا ابواب کے بعد ''حاصل مطالعہ'' کے عنوان سے جدوجہد آزادی کا تفصیلی جائزہ لینے اور اردو ناولوں میں ان مسائل کا مطالعہ ومحاکمہ کرنے کے بعد جو نتائج برآمد ہوتے ہیں انہیں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سے یہ حصہ مقالہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ آخر میں کچھ صفحات کتابیات کے لیے مختص ہیں۔

اظہار تشکر

اللہ تعالیٰ کا بے انتہا شکر واحسان ہے کہ اس نے مجھے پی ایچ ڈی کے مقالے کی تکمیل کی توفیق بخشی۔

اس کے بعد میں اپنے نگراں ،صدر شعبہ، پروفیسر ابوالکلام صاحب کا حد درجہ شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنے گراں قدر علمی مشوروں سے نوازنے کے ساتھ ساتھ موضوع کے انتخاب سے لے کر تکمیل تک قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی اور دل سے دعاء کرتا ہوں کہ آپ اسی طرح علم وفن کے آفتاب وماہتاب بن کر چمکتے رہیں، تاکہ آپ کی ذات سے ہم طلباء زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں۔

میں اپنے شعبے کے دیگر اساتذہ پروفیسر نسیم الدین فریس صاحب، ڈاکٹر شمس الھدیٰ صاحب ،ڈاکٹر مسرت جہاں صاحبہ اور محترمہ بی بی رضا صاحبہ کا شکر ادا کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں جن کے گاہے بہ گاہے اکادمک مشورے میری رہنمائی کرتے رہے۔ علاوہ ازیں ان کی دعائیں اور نیک تمنائیں میرے ساتھ رہیں۔

میں اپنے بزرگ والدین، برادران حافظ عرفان احمد، فیضان احمد، غفران احمد اور دیگر تمام رشتہ داروں کا شکر گزار ہوں جو مجھے برابر دعاؤں سے نوازتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان تمام کو اپنے شایان شان اجر عطا فرمائے۔

شکریہ کی اس رسم میں اگر میں مولانا سہیل احمد صاحب قاسمی، مولانا سعید الظفر صاحب قاسمی، مولانا محامد ہلال صاحب قاسمی، مولانا رفیق احمد صاحب قاسمی ،ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب، ڈاکٹر زبیر احمد صاحب، ابوالمجاہد، محمد جعفر، توصیف احمد اور محمد عدنان کا نام نہ لوں تو بڑی ناانصافی ہوگی کیوں کہ ان میں سے ہر ایک سے کسی نہ کسی شکل میں تعاون ملتا رہا۔

مقالے کے مسودہ کی تکمیل کے بعد ایک بڑا مسئلہ اس کی کمپوزنگ کا تھا اس تعلق سے میں بالکل بے فکر تھا اس لیے کہ میرے دوست مولانا افضال الحق ندوی صاحب اس فن کے بے تاج بادشاہ ہیں۔

انھوں نے بہت قلیل مدت میں مقالے کی کمپوزنگ فرمائی، میں ان کا بھی ممنون ہوں۔

اس موقعے پر میں اپنی سلیقہ مند بیوی، سلیقہ خاتون کو کیسے بھول سکتا ہوں جو گھریلو تمام ذمے داریوں کو بحسن خوبی انجام دیتی ہیں اور مجھے لکھنے پڑھنے کے لیے فارغ رکھتی ہیں۔ میں اپنی چاروں بچیاں فاطمہ انجم، عائشہ انجم، آمنہ انجم، اور ماریہ انجم کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ ان بچیوں کو نیک صالح بنائے اور دنیا و آخرت دونوں جگہوں پر کامیاب و کامران کرے۔

مقالے کے آغاز سے اختتام تک مواد کی فراہمی کے تعلق سے مجھے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد، ادارۂ ادبیات حیدرآباد، کتب خانہ المعھد العالی حیدرآباد، جواہر لال نہرو یونیورسٹی دہلی، جامعہ ملیہ دہلی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، المعارف دارالمطالعہ پورہ معروف مئو کی خاک چھاننی پڑی، میں مذکورہ کتب خانوں اور ان کے منتظمین کا ان کے تعاون کے لئے ممنون ہوں۔

اخیر میں ان تمام محسنوں اور مشفقوں کا ایک بار پھر شکر گزار ہوں جنھوں نے کسی طرح مقالے کی تکمیل میں میری مدد فرمائی۔

☆☆☆

باب اول
ہندوستان میں انگریزوں کی
حکومت

باب اول..... ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت

ہندوستان پر مغربی اقوام کی آمد و یورش

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ مشرق و مغرب کے تعلقات بہت قدیم ہیں۔ پندرہویں اور سولہویں صدی کے ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہی تھا۔ صنعت و حرفت میں یہ اپنی مثال آپ تھا۔ دنیا کا کوئی ملک اس حوالے سے ہندوستان کی ہم سری کا دعویٰ نہیں کر سکتا ہے۔ ہندوستان کا صنعتی مال ساری دنیا میں نہایت ہی پسند کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خاص طور پر کاغذ، شکر، چینی کے برتن، چمڑے کی اشیاء، سوتی، روئی اور ریشمی کپڑے عرب، شام، ایران اور ایشیا کے کوچک تک جاتے تھے۔ اس وقت کا دستور یہ تھا کہ زر مبادلہ سونے کی شکل میں ادا کیا جاتا تھا، لہٰذا دنیا کا سونا کھینچ کھینچ کر ہندوستان پہونچ رہا تھا۔ اور پوری دنیا میں ہندوستان کو سونے کی چڑیا کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یورپ کے تاجر اس پین الاقوامی تجارت میں حصہ دار بننے کے لیے بے چین رہتے تھے۔ ہمارے ملک ہندوستان پر یورش کرنے والے تنہا وہ انگریز نہیں ہیں جنہوں نے تجارت کرتے کرتے ہندوستان کے تاجدار بن بیٹھے بلکہ انگریزوں کی آمد سے بہت پہلے متعدد یورپین ممالک برابر ہندوستان پر تاجروں کے بھیس میں چڑھائی کرتے رہے۔

یہ الگ بات ہے کہ میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا اور دیگر لوگ رفتہ رفتہ میدان سے ہٹ گئے یا انگریزوں نے ان کو مار مار کر بھگا دیا۔ انگریزوں کو مشرق کی طرف رہنمائی کرنے والے وہ پرتگالی تھے جن کے ملک پر مسلمانوں نے بڑی آن و بان کے ساتھ آٹھ سو برس تک زمام حکومت سنبھالے رہے اور وہاں کے لوگوں کو عرب ملاحوں نے سمندر کا سینہ چاک کرنے کے فن سے واقف کرایا تھا۔ عرب ملاحوں کی بدولت ہی سب سے پہلے انگریز ہندوستان میں قدم رکھے ان کے بعد ہی دیگر مغربی ممالک کے لوگوں نے ہندوستان کا رخ کیا۔

۱۴۹۸ء ہندوستان کی تاریخ میں نہایت ہی منحوس سال ہے۔اسی سال سفید رنگ کے پہلے انسان پرتگال کے مشہور ملاح واکسوڈی گاما نے ہندوستان کی مقدس سرزمین پر اپنا ناپاک قدم رکھا۔جس وقت واسکوڈی گاما نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنا قدم رکھا تھا۔اس وقت ہندوستان پر سکندر لودھی۔۱۴۸۸ء تا ۱۵۱۷ء نامی بادشاہ حکومت کر رہا تھا۔واسکوڈی گاما عرب ملاح کی مدد سے افریقہ کا چکر کاٹتا ہوا اور راس امید کے پاس سے گزرتا ہوا کالی کٹ کے مقام پر پہونچا۔کالی کٹ میں راجہ زمورن کی حکومت تھی ۔ بادشاہ نے اپنے اس سفید مہمان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور صنعت وتجارت کے تمام راستے پرتگیزوں کے لیے کھول دیئے ۔ زمورن نامی بادشاہ اور واسکوڈی گاما میں دوستی کے عہد و پیماں ہوگئے ۔ ہندوستان اور پرتگال میں ایک زبردست تجارتی رشتہ قائم ہوگیا۔

پرتگیزوں کے ہندوستان آنے سے قبل عرب اور مصری بغیر کسی کی شرکت کے ہندوستان کی تجارت پر حاوی تھے۔انہوں نے پرتگیزوں سے سخت مزاحمت کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پرتگیزوں کی مصریوں اور عربوں سے لڑائیاں چھڑ گئیں۔لیکن پرتگیزوں نے چند سال کے اندر ہی عربوں اور مصریوں کو ہندوستان کے سمندر سے نکال دیا۔

پرتگیزوں نے اتنا ہی نہیں کیا بلکہ انہوں نے ۱۵۷۰ء میں اپنے محسن راجہ کالی کٹ کے ساتھ غداری کرتے ہوئے اس کی حکومت کی بنیادیں کھود ڈالیں۔کالی کٹ اور گوا پر غاصبانہ قبضہ جمالیا اور وہاں پر اپنے تجارتی قلعے تعمیر کر لیے اور ان پر پرتگیزی جھنڈا لہرانے لگا۔

ہندوستان کی دولت کا چرچا چند ہی سالوں میں دیگر مغربی ممالک میں ہونے لگا تقریباً یورپ کا ہر ملک اس بات کا خواہش مند ہوا کہ کس طرح ہندوستان کی دولت سے فائدہ اٹھایا جائے چنانچہ پرتگالیوں کے بعد ولندیزی ،فرانسیسی اور برطانیہ کے لوگ بھی مشرقی ملکوں میں آنا شروع ہوئے ۔لیکن پرتگال کے بعد جن دو ملکوں نے سب سے پہلے ہندوستان پر پوری طاقت اور تیاری کے ساتھ حملہ کیا وہ انگلستان اور ہالینڈ تھے۔انگریز تاجر بھی ایشیا کی تجارت کو لالچ بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے ۔ پرتگالی جہازوں اور پھر ان تاجروں کے غیر معمولی منافع کو دیکھ کر

انگریز سوداگر بے چین ہورہے تھے اور اسی نفع بخش تجارت میں حصہ لینے کے لیے بے قرار تھے ۔آخر کار مشرق سے تجارت کرنے کے لیے ۱۶۰۰ء میں ایک تجارتی کمپٹی کا قیام عمل میں آیا اور اسی کمپنی کو انگلستان کی ملکہ الزبتھ کی سرپرستی حاصل تھی ۔اس کمپنی کو عام طور سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسی طرح ۱۶۰۲ء میں ہالینڈ کی ایک تجارتی کمپنی کو ہندوستان میں تجارت کرنے کے لیے سرکاری منظوری اور امداد حاصل ہوگئی اس کمپنی کو جنگ کرنے معاہدے کرنے ، علاقوں پر قبضے کرنے اور قلعے تعمیر کرنے کا حق حاصل ہوگیا۔

تجارت کرنے کی غرض سے دنیا کے ملکوں میں تجارتی کمپنیاں تو ضرور بنتی ہیں مگر ان کمپنیوں کو سرکاری سرپرستی اور امداد حاصل ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ان دونوں کمپنیوں کو شاہی سرپرستی اور امداد حاصل ہونا اسی بات کی علامت تھی کہ ان کمپنیوں کو ہندوستان سے صرف مالی تجارت ہی نہیں کرنی ہے بلکہ وہاں کے باشندوں کی بھی تجارت کرنی ہے ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا ان دونوں کمپنیوں نے مالی تجارت کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں کی بھی تجارت کی اور ہندوستان میں اپنی سیاسی سرگرمیاں باقی رکھیں ۔

پرتگالیوں نے مصریوں اور عربوں کو ہندوستان کے سمندر سے نکالنے کے بعد جس تجارتی یا ملکی اجارہ داری پر اپنا قبضہ جما لیا تھا اب اس میں دو نئے حصہ دار، انگریز اور ولندیزی بھی اس میدان میں کود پڑے ۔اسی طرح ہندوستان میں تین رقیب پیدا ہوگئے ۔ پہلے سے ہندوستان کی تجارت پر قابض پرتگیزیوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پرتگیزیوں نے گوا، کالی کٹ اور دوسرے چند مقامات پر قلعے تعمیر کرنے کے بعد ہندوستان میں حکمرانی کرنے کے خواب دیکھنے لگے تھے مگر انگریزوں اور ولندیزوں کے آنے کی وجہ سے ان کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکا۔

پرتگیزی ہوں یا دوسری مغربی قوم ہندوستان آنے کے بعد قلعے بنائے بغیر ان کا کام چل ہی نہیں سکتا تھا۔لہٰذا پرتگیزیوں کی طرح ولندیزوں بھی ہندوستان میں تجارتی کوٹھیاں قائم کر رکھی تھیں اور بنگال میں دریائے ہگلی کے کنارے چنسرا ان کی تجارت کا بڑا مرکز تھا۔سترھویں صدی

میں ولندیزوں (ڈچ) کی تجارت کا بڑا زور رہا مگر آخر یہاں انگریزوں کے مقابل میں ان کو شکست ہوئی اور رفتہ رفتہ ان کے تمام مقبوضات چھین گئے۔ ۱۷۵۹ء میں انگریزوں نے چنسرا بھی فتح کرلیا اور ولندیزوں کا خاتمہ ہوگیا۔

جس طرح انگریزوں نے اپنے رقیب ولندیزوں کا ہندوستان سے خاتمہ کردیا ویسے ہی اپنے ایک دوسرے رقیب پرتگیزوں پر بھی غلبہ حاصل کرلیا۔ انگریزوں کو پرتگالیوں پر غلبہ حاصل کرنے میں آسانی اس لیے ہوگئی کہ پرتگیزی افسر بڑے مغرور اور جابر تھے ان کا سلوک اپنی رعایا کے ساتھ بہت برا تھا۔ خاص کر وہ مسلمانوں سے بہت نفرت کرتے تھے۔ پرتگیزی مقبوضات میں مذہبی آزادی نام کو بھی نہ تھی اور یہ لوگ اپنی رعایا کو زبردستی مسلمان بناتے تھے۔ یہ لوگ بحری قزاق بھی تھے اور ہندوستانی جہازوں کو لوٹ لیا کرتے تھے اس کے علاوہ وہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے تھے اور انہیں غلام بنا کر فروخت کرتے تھے۔

انگریزوں کے ہندوستان آتے ہی پرتگیزوں سے جنگ چھڑ گئی پرتگیزوں کی ناشائستہ حرکات اور ظلم وستم سے مغل حکومت پہلے ہی سے نالاں تھی جب انگریزوں نے پرتگیزوں سے مقابلہ کرنا شروع کیا تو مغل حکومت کی ہمدردیاں انگریزوں کے ساتھ ہوگئیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انگریز پرتگیزیوں سے اچھے تھے۔ انگریز بھی لوگوں پر ظلم وستم ڈھانے میں پرتگیزوں سے کسی طرح بھی کم نہیں تھے۔ بس فرق صرف اتنا تھا کہ ایک سلیقہ سے ظلم وستم ڈھاتا تھا اور دوسرا بے سلیقہ سے۔

پرتگال ایک چھوٹا سا ملک ہے یہ صرف اتنی حد تک ہی فوقیت رکھ سکتا تھا جب تک مقابلے میں کوئی حریف نہیں تھا۔ جب ولندیز (ڈچ) اور انگریز وغیرہ آگئے تو پرتگال ان کا مقابلہ نہ کرسکا اور رفتہ رفتہ پرتگیزوں کی سلطنت کا خاتم ہوگیا اور انگریز ہندوستان کی تجارت کے واحد ٹھیکیدار بن گئے اور ان کی سیاسی اور تجارتی سرگرمیوں میں دن بہ دن اضافہ ہوتا چلا گیا۔

انگریزوں کے لیے حالات دکن میں سازگار تھے کیوں کہ وہاں انہیں طاقتور سرکار سے ٹکر لینا نہیں پڑتا تھا۔ وجے نگر کی عظیم ریاست کا تختہ ۱۵۶۵ء میں ہی الٹ چکا تھا اب اس کی جگہ ان

گنت چھوٹی اور کمزور ریاستیں قائم ہوچکی تھیں ۔فوجی طاقت کی مدد سے ان کا سر جھکانا بھی آسان تھا اوران کو لالچ دے کر کام نکالنا بھی مشکل نہ تھا۔انگریزوں نے دکن میں اپنی پہلی فیکٹری ۱۶۱۱ء میں مسولی پٹنم میں قائم کی لیکن جلد ہی سرگرمیوں کا مرکز مدراس کو بنالیا جس کا پٹہ ۱۶۳۹ء میں انہیں مقامی راجہ نے دیا تھا۔راجہ انہیں یہ بھی حق دیا تھا کہ وہ اس جگہ کی قلعہ بندی کریں اس کا نظم ونسق دیکھیں ۔ یہاں تک کہ اپنا سکہ جاری کریں لیکن اس کے عوض میں بندرگاہ پر لگنے والی کسٹم چنگی کا نصف حصہ راجہ کو دیں ۔ یہاں انگریزوں نے اپنی فیکٹری کے علاقے میں فورٹ سینٹ جارج نام کا ایک چھوٹا سا قلعہ بھی بنالیا تھا۔

مشرقی ہندوستان میں انگلش کمپنی نے اپنی پہلی فیکٹری ۱۶۳۳ء میں اڑیسہ میں قائم کی ۱۶۵۱ء میں اس نے ہگلی (بنگال) میں تجارت کرنے کی اجازت حاصل کرلی ۔انگریز ہندوستان میں سیاسی اقتدار قائم کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے تاکہ مغلوں پر زور ڈال کر تجارت کی کھلی چھوٹ حاصل کرلے اور ہندوستان کو اس پر مجبور کرسکے کہ وہ اپنا مال اس کے ہاتھوں سستے داموں میں فروخت کریں اوران کے مالوں کو زیادہ قیمت میں خریدیں ۔انگریز یہ بھی چاہتے تھے کہ دوسرے یورپی تجاروں کو ہندوستان سے باہر نکال دیں اور اپنی تجارت کو ہندوستانی حکومت کی سیاست اور باشندوں سے آزاد کرا سکے ۔سیاسی طاقت حاصل ہوگئی تو کمپنی کے لیے ہندوستانی لگان پر قبضہ کرنا ممکن ہوجائے گا اور تب وہ خود اپنے وسائل کی مدد سے ملک کو فتح کرسکے گی ۔اس دور میں اس قسم کے منصوبے کھلم کھلا پیش ہورہے تھے۔

۱۸۸۶ء میں انگریزوں نے ہگلی پر قبضہ کرکے سلطان کے خلاف اعلان جنگ کیا تو انگریز اور مغل سلطان کے درمیان دشمنی کھلم کھلا سامنے آگئی لیکن انگریز حالات کا صحیح اندازہ لگانے میں ناکام ہوگئے اورانہیں منہ کی کھانی پڑی۔

اورنگ زیب کے دور حکومت میں بھی مغل سلطنت میں اتنا دم خم تھا کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے حقیقت فوجوں کو نیچا دکھا سکے ۔چنانچہ انگریزوں کو بنگال کی فیکٹریوں سے نکال دیا گیا اور وہ گنگا کے دہانے پر ایک معمولی جزیرے میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ۔ جہاں تجار کا دور دورہ تھا

۔سورت ،میسولی ، پٹنم اور وشاکھا پٹنم میں ان کی فیکٹریوں پر مغلوں کا قبضہ ہوگیا۔اوران کے کمپنی کے قلعہ کا بھی محاصرہ کرلیا گیا جب انگریزوں کو اندازہ ہوا کہ وہ ابھی مغل سلطنت سے لوہا لینے کے قابل نہیں تو وہ ایک دفعہ سرکار کے سامنے روئے گڑگڑائے' معافیاں مانگیں۔

مغل حکام نے نہ خود انگریزوں کی غلطیوں کو معاف کردیا کیوں کہ انہیں قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ بظاہر بے ضرر غیر ملکی تاجر ایک دن ملک کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ کمپنی کی غیر ملکی تجارت سے ہندوستانی تاجروں اور دستکاروں ، دونوں کو بھی فائدہ پہونچ رہا ہے۔

اس طرح ریاستی خزانے میں مال کی فراوانی ہورہی ہے۔اس لیے اورنگ زیب عالمگیرؒ نے انہیں ایک لاکھ پچیس ہزار روپئے ہرجانہ ادا کرنے کی صورت میں تجارت جاری رکھنے کی اجازت دے دی ۔ چنانچہ ایک بار پھر انگریزوں کو ہندوستان میں ترقی کرنے اور وہی طاقت وقوت کو مضبوط کرنے کا سنہرا موقع مل گیا۔

فرانسیسی

دوسرے ملکوں کی تقلید میں فرانسیسیوں نے بھی ۱۶۶۴ء میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی اور جلد ہی موسلی پٹنم اور سورت میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرلیں ۔۱۶۷۴ء میں انہوں نے پانڈیچیری کے بنیاد ڈالی اور اسے اپنا صدر مقام بنایا اس کے بعد انہوں نے رفتہ رفتہ کئی مقامات حاصل کئے اور بحر ہند میں یوربن اور ماریشس کے جزیروں پر قبضہ جما کر اپنی پوزیشن خوب مضبوط کرلی تھی ۔غرض کہ فرانسیسیوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ انگریزوں کے مدمقابل کی حیثیت اختیار کرلی تھی ۔ چنانچہ انگریزوں کو فرانسیسیوں سے بہت زیادہ خطرہ پیدا ہوگیا۔

انگریزی اور فرانسیسی کمپنیاں ہندوستان کے ساتھ تجارت کرنے کی غرض سے قائم ہوئی تھیں لیکن جب انہوں نے سلطنت مغلیہ کی کمزوری کو دیکھا تو ہر دو نے اپنی اپنی سلطنت قائم کرنی چاہی ۔اسی خواہش کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی جو تقریباً بیس سال تک رہی اس میں انجام کار انگریزوں کو فتح ہوئی اس جنگ کی تفصیلات کچھ اس طرح ہے۔

یورپ کی عیار اقوام کا مقصد چونکہ تجارت کے آڑ میں ملک گیری کرنا تھا اس لیے انہوں نے ہندوستان میں سیاسی ریشہ دوانیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔فرانس اس معاملہ میں سب سے آگے آگے تھا۔فرانسیسی گورنر ڈپلے کی ساری سیاست کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف سارے جنوبی ہند پر قبضہ جمانا چاہتا تھا اور دوسری جانب وہ اپنے یورپین رقیب انگریزوں کو سرزمین ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتا تھا اسی مقصد کے حصول کے لیے اس نے پوری طرح فوج تیار کر رکھی تھی۔تاکہ جیسے ہی موقع ملے ہندوستان کے علاقوں کو اپنے قبضے میں کر لے۔

حسن اتفاق یہ ہوا کہ ۱۷۴۴ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں یورپ کے سرزمین پر جنگ چھڑ گئی اور ڈوپلے کو ہندوستان میں اپنی سیاسی سرگرمیوں کا موقع مل گیا۔چنانچہ ڈوپلے نے سب سے پہلے مدراس پر حملہ کر لیا اور وہاں سے انگریزوں کو باہر کر دیا۔اس طرح سے جنوبی ہند کے سب بڑے حصہ مدراس پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو گیا۔

کرناٹک کے نواب انورالدین عرصۂ دراز سے فرانسیسیوں کی ان حرکات کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔چنانچہ جب فرانسیسیوں نے مدراس پر حملہ کر کے اس پر اپنا قبضہ جما لیا تو نواب نے اس کو ناپسند کیا اور مطالبہ کیا کہ چونکہ مدراس کرناٹک کے علاقہ میں ہے اور اس پر ریاست کرناٹک کا حق ہے لہٰذا یہ شہر فوراً ہمارے حوالہ کر دیا جائے۔

ڈوپلے نے نواب کے اس مطالبہ کا کچھ بھی خیال نہیں کیا۔لہٰذا نواب نے فرانسیسیوں کی فوج پر حملہ کر دیا۔اس جنگ میں فرانسیسیوں کی فوج قلیل ہونے کے باوجود بھی نواب کو شکست دینے میں کامیاب ہو گئی اور ڈوپلے نے آگے بڑھ کر کرناٹک کی راجدھانی ارکاٹ پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یورپیوں کی یہ پہلی باقاعدہ جنگ ہے جو ہندوستان میں لڑی گئی اور تاریخ میں اسی جنگ کو کرناٹک کی پہلی جنگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔اس سے پہلے بھی مغربی ممالک کے لوگوں نے ہندوستان کے بہت سے حصہ پر قبضہ کر لیا تھا لیکن تلوار کے زور پر انہوں نے جو سب سے پہلا علاقہ ہندوستان میں فتح کیا وہ ارکاٹ تھا۔

اس فتح کا یورپیوں کے ذہن و دماغ پر یہ اثر ہوا کہ ہمارے اندر اتنی طاقت وقوت ہے کہ

ہم تعداد میں کم ہونے کے باوجود بھی ہندوستان کی بڑی سے بڑی فوج کو شکست دے سکتے ہیں۔

ارکارٹ کی فتح کے بعد فرانسیسی گورنر جنرل ڈوپلے نے سارے دکن میں ریشہ دوانیوں کا جال بچھا دیا تھا اور اسے یہ موقع اس لیے ہاتھ آ گیا کہ ۱۷۴۸ء میں نظام الملک آصف جاہ والی حیدرآباد کا انتقال ہوگیا۔ اسکے انتقال کے بعد اس کے بیٹے ناصر جنگ اور اس کے نواسے مظفر جنگ میں تخت نشینی کیلیے جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ عین اس وقت کرناٹک کی گدی کے لیے جھگڑا شروع ہوگیا چندا صاحب جو کرناٹک کے سابقہ نواب کا داماد تھا۔ انورالدین نواب کرناٹک کے مقابلہ میں تخت کا دعویدار بن بیٹھا۔ ڈوپلے نے ان حالات سے فائدہ اٹھانا چاہا اور اس نے مظفر جنگ اور چندا صاحب کی مدد کرنا منظور کرلیا۔

۱۷۴۹ء میں مظفر جنگ چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے مل کر انورالدین کو امیر کے مقام پر شکست دی۔ انورالدین لڑائی میں مارا گیا اور اس کا بیٹا محمد علی بھاگ کر ترچناپلی میں پناہ گزیں ہوا چندا صاحب فرانسیسیوں کی مدد سے کرناٹک کا نواب ہوگیا۔ اور مظفر جنگ کو صوبہ دار دکن کا خطاب دے دیا تاکہ آگے چل کر اس کے ذریعے حیدرآباد پر آسانی کے ساتھ قبضہ جمایا جاسکے۔

ان حالات میں نظام دکن ناصر جنگ نے فوراً مرہٹوں اور انگریزوں کو فرانسیسیوں کے مقابلے کے لیے بلالیا۔

نظام، مرہٹوں اور انگریزوں کا مشترکہ لشکر فرانسیسیوں کے مقابلے کے لیے تیار ہوگیا اور اس لشکر نے پوری طاقت کے ساتھ فرانسیسی لشکر پر حملہ کردیا۔ فرانسیسیوں نے انگریزوں کا سخت مقابلہ کیا۔ مگر انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ مظفر جنگ گرفتار ہوگیا۔ چندا صاحب بھاگ گیا۔ نظام نے پیش قدمی کر کے ارکاٹ فتح کرلیا اور مرحوم نواب انورالدین کے بیٹے محمد علی کو ارکاٹ کے تخت پر بٹھادیا۔ اس طرح ڈوپلے کی بنی بنائی اسکم خاک میں مل گئی۔

اس شکست اور ناکامی کے باوجود بھی ڈوپلے چین سے نہیں بیٹھا اس نے چند روز کے بعد ہی ایک بڑا لشکر فراہم کر کے جنرل بسی کی سرکردگی میں کرناٹک کے نئے نواب محمد علی کے خلاف حملہ کردیا۔ نیا نواب چونکہ ریاست کی بگڑی ہوئی حالت کو ابھی نہیں سنبھال پایا تھا اس لیے جنرل

بسی کو اس پر فتح حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ چنانچہ جنرل بسی نے کرناٹک پر دوبارہ فتح حاصل کرلی اور نواب مقابلہ کی تاب نہ لاکر وہاں سے فرار ہوگیا۔

نظام دکن ناصر جنگ کو جب محمد علی کی شکست کی خبر ہوئی تو وہ ایک بڑا لشکر لے کر فرانسیسیوں کے مقابلے کے لیے جا پہنچا۔لیکن فرانسیسیوں کی سازشوں اور عیارانہ چالوں کی وجہ سے نہ صرف نظام کے لشکر میں بغاوت پھیل گئی بلکہ ایک غدار نے لڑائی چھڑنے سے پہلے ہی ناصر جنگ کو قتل کر دیا نظام دکن ناصر جنگ کے قتل کے بعد فرانسیسیوں کے لیے میدان بالکل صاف تھا۔انہوں نے فوراً اپنے پرانے پٹھو مظفر جنگ کو قید خانہ سے نکال کر حیدرآباد کے تخت پر بٹھا دیا اور چندرا صاحب کو پانڈیچیری سے بلا کر کرناٹک کا نواب بنا دیا۔غرضیکہ پورا دکن فرانسیسیوں کے قبضہ میں آ گیا اور ڈوپلے کا دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔

کرناٹک اور حیدرآباد دکن پر اب فرانسیسی اقتدار پوری طرح مسلط ہوگیا تھا۔جنرل بسی نے مع اپنے فرانسیسی فوج کے حیدرآباد میں مستقل قیام کرلیا۔جنرل بسی اب نواب مظفر جنگ کا مصاحب خاص تھا اور حیدرآباد کی فرانسیسی فوجوں کا کمانڈر بھی۔اسی طرح حقیقت میں حیدرآباد پر فرانسیسیوں کی حکومت تھی۔مظفر جنگ صرف ایک رسمی نواب کی شکل میں کرسی اقتدار پر بیٹھا ہوا تھا۔لیکن مظفر جنگ زیادہ عرصہ تک اس اقتدار پر نہیں رہ سکا کیوں کہ چھ مہینوں کے بعد ہی اس کے پرانے ساتھیوں نے قتل کر دیا۔

مظفر جنگ کے قتل ہونے کے بعد بھی فرانسیسی اقتدار بدستور دکن میں قائم رہا کیوں کہ فرانسیسی جنرل بسی نے ناصر جنگ کے ایک بھائی صلابت جنگ کو نظام بنا دیا اور خود اس کی نگہبانی کے لیے ایک فوج کے ساتھ حیدرآباد میں رہا۔چنانچہ تخت پر بیٹھنے کے بعد نئے نظام نے شمالی سرکار کا سرسبز علاقہ فرانسیسیوں کو دے دیا۔

اس وقت سارے دکن میں فرانسیسی اقتدار عروج پر تھا اور انگریزوں کی حالت بڑی نازک تھی لیکن ایک انگریز افسر کلایو نے ایک تدبیر سے جنگ کا رخ بالکل پلٹ دیا اور ڈوپلے کے منصوبے خاک میں ملا دیئے اس وقت چندا صاحب اور فرانسیسیوں نے محمد علی کو ترچناپلی میں گھیر

رکھا تھا اور اسکے بچاؤ کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔

کلایو نے اسی موقع پر غیر معمولی دور اندیشی کا ثبوت دیا چندا صاحب کی توجہ ترچناپلی کے محاصرہ سے ہٹانے کے لیے اس نے پانچ سو سپاہیوں کی ایک مختصر سی فوج کو ساتھ لے چندا صاحب کی راجدھانی ارکاٹ پر ۱۷۵۱ء میں قبضہ کرلیا۔ چندا صاحب کو جب اس بات کا علم ہوا تو اس نے اپنے بیٹے رضا صاحب کے ماتحت ایک کثیر فوج روانہ کی جس نے ارکاٹ کا محاصرہ کرلیا ۔کلایو ۵۳ دن مقابلے پر ڈٹا رہا۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی مدد کے لیے چھ ہزار مرہٹوں کی کمک آ گئی اور کچھ امداد مدراس سے بھی مل گئی اور کلایو کو کامل فتح حاصل ہوگئی۔

ارکاٹ نکل جانے کے بعد چندا صاحب اور اس کے فرانسیسی ساتھیوں کا دل ٹوٹ گیا۔ ادھر ترچناپلی کے محصورین میں غیر معمولی ہمت وجرأت پیدا ہوگئی اس کے علاوہ محصورین کی امداد کے لیے مدراس سے مزید انگریز فوج پہونچ گئی ۔ چنانچہ ۱۱/جون ۱۷۵۲ء کو ترچناپلی بھی انگریزوں نے فتح کرلیا۔ دو دن کے بعد چندا صاحب کو قتل کردیا گیا اور سارا کرناٹک انگریزوں کے دوست نواب محمد علی کے قبضہ میں آ گیا۔ اس طرح ہندوستان سے فرانسیسی اقتدار کا بالکل خاتمہ ہوگیا۔ اس طرح اب ہندوستان کا ایک بڑا حصہ انگریزوں کے زیر اقتدار آ گیا اور دھیرے دھیرے پورے ہندوستان پر قابض ہوگئے۔

سلطنت مغلیہ کا زوال وخاتمہ

مغل وسط ایشیا کے علاقہ منگولیا کے رہنے والے تھے۔ یہ لوگ بڑے بہادر اور جنگ جو تھے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ان لوگوں نے ہندوستان پر حملے شروع کئے۔ ان کا ایک مشہور سردار چنگیز خان تھا جس نے التمش کے زمانے میں اس ہندوستان کی مغربی سرحد کو تاخت وتاراج کیا۔ اس کے بعد بھی مغل لوگ وقتاً فوقتاً سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان پر حملے کرتے رہے ۔۱۵۲۶ء میں بابر نے حملہ کیا اور ابراہیم لودھی کو شکست دے کر مغلیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔

ظہیرالدین بابر

بابر ہندوستان میں مغلیہ خاندان کا پہلا بادشاہ تھا اس کا پورا نام ظہیرالدین تھا۔ بابر کی عمر

ابھی گیارہ سال کی تھی کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ بابر کا باپ مرزا عمر شیخ ترکستان کی ایک چھوٹی سی ریاست ''فرغانہ'' کا حاکم تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد بابر فرغانہ کا حاکم بنا۔ بابر کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس کے رشتہ داروں نے اس کے اوپر بہت سختیاں کیں اور اس کا آبائی ملک بھی چھین لیا۔ چنانچہ بابر اپنا ملک چھوڑ کر کابل چلا آیا جہاں وہ ۱۵۰۴ء میں بادشاہ بن گیا۔ یہاں سے پھر باہر اپنے آبائی ملک کو فتح کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ کیا اور کئی بار دریائے سندھ کو پار کر کے پنجاب پر حملے کئے۔

ہندوستان کی فتح

بابر آخری مرتبہ ۱۵۲۵ء میں پنجاب کے حاکم دولت خان لودھی کی دعوت پر ہندوستان پر حملہ آور ہوا اس نے پہلے پنجاب پر قبضہ کیا اور پھر چار لڑائیوں میں تمام شمالی ہندوستان پر قابض ہوگیا۔

بابر کی موت

بابر کی وفات ۱۵۳۰ء میں ہوئی جس کی وجہ سے اس کو اپنی سلطنت مضبوط کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ہاں بعد کے مغل حکمرانوں نے ہمایوں سے لیکر حضرت عالمگیرؒ تک سلطنت کو استحکام بخشا۔ اور طویل عرصہ تک مغلوں نے پورے ہندوستان پر بڑی آن بان کے ساتھ حکومت کی۔

ہندوستان کی تاریخ میں سترہویں صدی مغل سلطنت کے عروج اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں اعلیٰ اقدار کی صدی ہے اور اٹھارہویں صدی اس سلطنت کے زوال کی داستان ہے۔

ڈاکٹر جمیل حالبی کے مختصر اور جامع الفاظ میں اصل صورت کو ملاحظہ فرمائیں وہ لکھتے ہیں۔

> ''اٹھارہویں صدی کی پہلی صبح کا سورج طلوع ہوا تو برعظیم میں رقبے، آبادی اور دولت کے اعتبار سے ایک عظیم سلطنت قائم تھی جس کے حدود کابل و کشمیر اور کوہ ہمالیہ کی فلک بوس چوٹیوں سے لیکر کم وبیش راس کماری تک پھیلے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر اس عظیم الشان سلطنت کا شہنشاہ تھا۔ خود برصغیر کی تاریخ میں اس سے پہلے ایسی عظیم سلطنت وجود میں نہیں آئی تھی۔ مغلوں نے برعظیم کو نہ صرف سیاسی اتحاد سے روشناس کر کے ایک نیا قوی تصور دیا تھا بلکہ ایک وسیع

تہذیبی ہم آہنگی پیدا کر کے ایک سیاسی وتہذیبی ڈھانچہ بھی تیار کیا تھا۔جس میں معاشرہ کی تخلیقی وفکری صلاحیتیں پھول پھل سکیں۔سترہویں صدی اس تہذیب کا نقطۂ عروج ہے اور اٹھارہویں صدی اس عظیم سلطنت کے زوال کی داستان ہے''(1)

مغل سلطنت کی عظمت پر اس دور کی دوسری سلطنتیں تقریباً دوصدیوں سے رشک کر رہی تھیں۔لیکن اٹھارہویں صدی کے نصف اول میں مغلطیہ سلطنت پر زوال آنا شروع ہوا اور اس کا شیرازہ بکھرنے لگا۔مغل شہنشاہوں سے ان کی طاقت وحشمت چھن گئی اور ان کی سلطنت سکڑتے سکڑتے دلی اور دلی کے گردونواح میں چندمیل کے دائرے تک محدود ہوگئی۔یہاں تک کہ ۱۸۰۳ میں خود دلی پر برطانوی فوجوں نے قبضہ کرلیا اور مغل شہنشاہ کی حیثیت گھٹ کر ایک غیر ملکی طاقت کے وظیفہ خور کی سی رہ گئی۔

اورنگ زیبؒ کے طویل اور طاقتور دور حکومت میں مغلطیہ سلطنت کے اتحاد پر یقیناً آنچ آئی تھی اور اس کے استحکام کی جڑیں ہلی تھیں لیکن اس کے باوجود ۱۷۰۷ میں اورنگ زیبؒ کی موت کے وقت تک مغل نظم ونسق میں بہرحال جان تھی اور مغل فوج ابھی ایک طاقتور فوج تھی اس کے علاوہ ملک میں خاندان مغلیہ کا نام اس وقت تک بڑے احترام سے لیا جاتا تھا۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیبؒ کی وفات کے بعد یعنی اٹھارہویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی پورے ہندوستان میں جگہ جگہ بغاوتیں شروع ہوگئیں۔مراٹھا،سکھ،راجپوت اور جاٹ حکمرانوں نے بغاوتیں شروع کردیں اور پورا ہندوستان الگ الگ حصوں میں بٹ گیا اور اپنے سیاسی اتحاد کے انتشار سے دوچار ہوا اور مغل بادشاہوں میں اب وہ طاقت وقوت مفقود تھی جس کی بدولت وہ اپنے پیش رؤں کی بنی بنائی حکومت باقی رکھ سکتے۔مغل بادشاہ اپنے گورنروں اور امراء کے ہاتھوں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے تھے اس کے باوجود ایک بجھتے ہوئے چراغ کے مانند مغل بادشاہ،تخت شاہی پر براجمان تھا۔

اورنگ عالمگیرؒ کی وفات اس صدی کا سب سے پہلا اور سب سے اہم واقعہ تھا۔جس کے بعد پچاس سال کے عرصے میں نااہل جانشینوں نے وسیع وعریض مغل سلطنت کو پارہ پارہ کردیا

ہے۔

اورنگ زیب کے جانشین

بہادر شاہ اول

مرنے سے کچھ پہلے اورنگ زیبؒ نے اپنی حکومت اپنے تینوں لڑکوں، معظم، اعظم اور کام بخش میں تقسیم کر دی تھی۔ ابھی اس کی آنکھ پوری طرح بند بھی نہ ہوئی تھی کہ تخت کی وراثت کے لیے ان میں اختلافات پیدا ہو گئے اور تخت نشینی کے لیے جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں شہزادہ معظم کامیاب ہوا اور بہادر شاہ (۱۷۰۷ء۱۷۱۲ء) کے لقب کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ اس کی حکومت بہت مختصر تھی صرف چار سال حکومت کر کے ۱۷۱۲ء میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔ یہ بادشاہ اتنا بوڑھا اور نکما تھا کہ لوگ اسے شاہ بے خبر کہا کرتے تھے۔

جہاندار شاہ

بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت و تاج کے لیے جنگ ہوئی۔ بہادر شاہ کے چاروں لڑکے تخت و تاج کے ایسے حریص تھے کہ بوڑھے باپ کی لاش ایک ماہ تک دفن نہ ہو سکی اور آپس میں لڑتے رہے۔ آخر میں جہاندار شاہ کامیاب ہوا۔ جہاندار شاہ عیاش اور نفس پرست انسان تھا۔ اس کا دور حکومت بہت ہی خراب تھا اس کا دور حکومت کیسا تھا اس کے بارے میں مشہور مورخ تاراچند لکھتے ہیں:

> ''جہاندار ناعاقبت اندیش اوباش اور فضول خرچ تھا۔ ایک پاگل بھنگ کھانے والا، اس نے ایک عیاش اور زنانہ شاہی درباری زندگی کی مثال پیش کی اور حکمراں جماعت کے اخلاق کو برباد کر دیا اس کے اثرات نے نہ صرف پرانی شہنشاہانہ عظمت کا پھر واپس آنا ناممکن بنا دیا بلکہ ایک معمولی رقبہ کی آزاد حکومت کی بقا کے تمام امکانات کو ختم کر دیا۔ بادشاہ کی حیثیت گھٹ کر ایک کھلونا بن گئی اور کل اختیارات وزیر اور وزرائے کے ہاتھ میں چلے گئے۔(2)

جہاندار شاہ کے عہد میں دو سید بھائیوں حسین علی، اور عبداللہ کا بول بالا شروع ہوا نتیجتاً انہوں نے ۱۷۱۳ء میں جہاندار شاہ کو قتل کرا دیا اور اس کے بیٹے فرخ سیر کو تخت پر بٹھایا اور

جہاندار شاہ کے بدنامِ زمانہ حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

فرخ سیر

فرخ سیر ۱۷۱۳ء سے ۱۷۱۹ء تک حکمراں رہا۔ فرخ سیر کی فتح کے پیچھے سید برادران عبد اللہ خان اور حسین علی خان کا ہاتھ تھا۔ چنانچہ ان دونوں کو بتدریج وزیر اور میر بخشی جیسے باوقار عہدوں سے نوازا گیا۔ بہت جلد ہی ان دونوں بھائیوں نے اپنی سیاسی بصیرت کے ذریعہ بہت کم وقت میں ہی پوری ریاست کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ فرخ سیر میں حکومت کرنے کی صلاحیت تھی ہی نہیں وہ بے حد بزدل، ظالم، ناقابل اعتماد اور بے ایمان آدمی تھا۔ یہی نہیں بلکہ ناکارہ خوشامدیوں اور مصاحبوں میں گھرا رہتا تھا اور ان کی باتوں کا گہرا اثر لیا کرتا تھا۔ فرخ سیر کے عہد کا سب سے مشہور واقعہ یہ ہے کہ سکھوں کا لیڈر، بندہ، بہادر گرفتار ہو کر قتل ہوا۔ سید برادران فرخ سیر کو کٹھ پتلی بنانا چاہتے تھے جب ان سے آزاد ہونے کی کوشش کی تو انہوں نے اسے بھی مروا دیا اور اس کی جگہ یکے بعد دیگرے دو نوعمر شہزادوں کو تخت پر بٹھایا لیکن وہ تپ دق سے مر گئے۔

محمد شاہ

محمد شاہ نے (۱۷۱۹ء۔۱۷۴۸) ۳۰ سال تک حکومت کی۔ سید برادران نے ہی ۱۸ سالہ محمد شاہ کو شاہ ہند بنایا فرخ سیر کے بعد تخت پر بیٹھنے والے یہ تین نوعمر بادشاہ سید برادران کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلیاں تھے اور تو اور وہ نہ تو ایک دوسروں سے آزادانہ طور پر مل سکتے تھے اور نہ ادھر ادھر آ جا سکتے تھے۔ مختصر یہ کہ ۱۷۱۳ء سے ۱۷۲۰ء تک یعنی ان کے دور حکومت کے آخر تک ریاست کا نظم و نسق اور اقتدار پورے طور پر سید برادران کے ہاتھ میں رہا ہے۔

محمد شاہ بڑا عیش پرست بادشاہ تھا اور رنگ رلیوں میں ہی مستغرق رہتا تھا۔ اسی وجہ سے اسے محمد شاہ رنگیلا کہتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کو تباہی سے نجات دلانے کا اگر امکان ہو سکتا تھا تو محمد شاہ کے تقریباً تیس سالہ دور حکومت (۱۷۱۹ء۔۱۷۴۸) ہی میں ہو سکتا تھا۔ اس دور میں آئے دن اقتدار کی تبدیلی نہیں ہوئی جب کہ ۱۷۰۷ سے ۱۷۲۰ء تک کے درمیانی عرصہ میں ہوتا رہا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تھا کہ اس وقت تک مغل سلطنت کا اثر و احترام عوام کے دل و دماغ میں قائم

ودائم تھا۔لیکن محمد شاہ حالات کا مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے کہ بادشاہ نے امور سلطنت میں غفلت برتی اور نظام الملک جیسے قابل وزیروں کی مکمل حمایت کرنے کے بجائے بدقماش اور ناکارہ خوشامدیوں کے پھندے میں پھنسا رہا۔تاراچند محمد شاہ کے انتظامی امور کے تعلق سے رقم طراز ہیں:

نوعمر محمد شاہ کو حکومت میں کوئی دلچسپی نہ تھی ذلیل قسم کے مصاحبوں میں گھرا وہ اپنے اوقات فضول کاموں میں صرف کرتا تھا اس نے سلطنت کا ہر کام اپنے وزیر فخر الدین خان پر جو محمد امین خان کا فرزند تھا چھوڑ دیا تھا لیکن وزیر کاہل الوجود، مست رو اور عیش پسند آدمی ثابت ہوئے۔دلی میں کوئی حکومت ہی نہیں رہی اسی لیے جب نادر شاہ کے لیے افغانستان سے خطرہ لاحق ہوا اور کابل کے گورنر نے فوجی کمک اور بقایا ادا کرنے کے لیے روپیہ مانگا تو اس کی درخواست پر کوئی توجہ نہ دی گئی۔

محمد شاہ کے عہد میں اکثر صوبے دار مغلیہ سلطنت سے آزاد ہو گئے اور مغلیہ سلطنت کا شیرازہ بکھرنے لگا۔۱۷۳۹ء میں نادر شاہ نے حملہ کر کے سلطنت کو بالکل تباہ کر ڈالا۔

نادر شاہ:

نادر شاہ ایران کا ایک مشہور فاتح گزرا ہے۔دراصل وہ خراسان کا ایک گڈریا تھا لیکن خداداد صلاحیت سے ترقی کرتے ہوئے ایران کا بادشاہ بن گیا۔۱۹۳۹ء میں اس نے ایک معمولی سے بہانے سے دہلی پر حملہ کیا ان دنوں دہلی کا بادشاہ محمد شاہ رنگیلا تھا۔چنانچہ نادر شاہ بغیر کسی روک ٹوک کے کرنال تک آپہونچا۔یہاں اس نے محمد شاہ کی فوج کو شکست دی اور پھر دہلی میں وارد ہوا۔کچھ دنوں بعد شہر میں یہ غلط افواہ پھیل گئی کہ نادر شاہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے اس پر وہاں کے باشندوں نے فوج کے کچھ سپاہیوں کو قتل کر دیا جب نادر شاہ کو اس معاملہ کا علم ہوا تو اس نے قتل عام کا حکم دے دیا اور ہزاروں لوگ موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔سید ابوظفر ندوی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

''اور سات روز تک دہلی میں قتل عام اور لوٹ مچی رہی۔آخر نادر شاہ ۱۵ کروڑ نقد، کوہ نور ہیرا

،اورشاہ جہاں کے وقت کا بنا ہوا تخت طاؤس لے کر ایران واپس چلا گیا''۔(3)

نادرشاہ کے اس حملے نے مغلیہ سلطنت کی جڑوں کو کمزور کر دیا اور کئی خود مختار ریاستیں قائم ہوگئیں جیسے علی وردی خان بنگال میں ،سعادت علی خان اودھ میں اور نظام الملک دکن میں خود مختار بن بیٹھے۔

واپسی کے چند سال بعد ۱۷۴۷ میں نادرشاہ اپنے دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا اور کابل کی حکومت اس کے سپہ سالار احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ میں آئی

احمد شاہ ابدالی

احمد شاہ افغانوں کے ابدالی یا درانی قبیلے کا سردار تھا اور نادرشاہ کا ایک جرنیل تھا۔اس نے ۱۷۴۸ سے ۱۷۶۴ تک ہندوستان پر کئی حملے کئے جن میں سب سے مشہور ۱۷۶۱ میں ہوا۔اس حملے میں اسنے مرہٹوں کو پانی پت کی تیسری لڑائی میں شکست فاش دی ۔احمد شاہ کے ان حملوں نے مغلیہ سلطنت کی رہی سہی طاقت کو بھی مٹا دیا۔

محمد شاہ کی وفات کے بعد جو بادشاہ ہوئے وہ سب کے سب صرف نام کے بادشاہ تھے ۔ان میں قابل ذکر صرف دو ہیں ایک شاہ عالم ثانی جس نے انگریزوں کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی اور دوسرا بہادر شاہ ظفر جو اسی خاندان کا آخری بادشاہ تھا اس نے ۱۸۵۷ کے غدر میں حصہ لیا اور انگریزوں نے اسے اسیر بنا کر رنگون بھیج دیا۔ جہاں اس نے ۱۸۶۳ء میں وفات پائی۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کے اسباب:

درحقیقت مغلیہ سلطنت کے زوال کا آغاز اورنگ زیبؒ کے زمانہ میں ہی ہوگیا تھا لیکن جب تک اورنگ زیب زندہ رہا اس کا دبدبہ بنا رہا اس کے مرتے ہی اس عظیم سلطنت کو زوال آ گیا زوال کے بڑے بڑے اسباب مندرجہ ذیل تھے۔

اورنگ زیب کی مذہبی پالیسی

اورنگ زیبؒ ہر کام اسلامی نقطۂ نظر سے کیا کرتا تھا۔اس نے ہندوؤں پر جزیہ از سر نو عائد

کیا ان کے اس طرز عمل سے ہندو، برگشتہ ہوگئے اور ان کی ہمدردی ان کے دشمنوں یعنی مراٹھوں اور سکھوں سے ہوگئی راجپوت بھی جو مغلیہ سلطنت کے پشت پناہ تھے۔اس کے دشمن بن گئے۔

بیجاپور اور گولکنڈہ کی فتح

بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں کو فتح کر کے اورنگ زیبؒ نے ایک سیاسی غلطی کی کیوں کہ اس کے بعد مرہٹے بڑھ چڑھ کر مغلیہ علاقے پر ہاتھ مارنے لگے اور ان ریاستوں کے بیکار سپاہی بھی مرہٹوں سے آ لگے۔

مہمات دکن

اورنگ زیبؒ کو تقریباً ۲۶ سال دارالخلافہ سے دور دکن کی مہمات میں صرف کرنے پڑے اور وہ وہاں ایسا گیا کہ واپس دہلی آنا نصیب ہی نہ ہوا۔اس طرح سے حکومت کا نظام جو اس کی ذاتی نگرانی پر منحصر تھا کھوکھلا ہوگیا۔ساتھ ہی ان لگاتار مہمات کی وجہ سے فوج کمزور اور سلطنت کی مالی حالت خراب ہوگئی۔سپاہیوں نے سابقہ تنخواہ نہ ملنے کی وجہ سے بغاوتیں شروع کر دیں۔

مطلق العنان حکومت

مغلیہ حکومت مطلق العنان حکومت تھی اور اس قسم کی حکومت تب قائم ہوسکتی ہے جب ملک کے بادشاہ عقل مند اور زبردست ہو، جونہی حکومت کسی کمزور یا کم عقل بادشاہ کے ہاتھ آ جاتی ہے تو زوال یقینی ہوتا ہے۔خاندان مغلیہ میں اورنگ زیب تک تو سب بادشاہ عقل مند اور زبردست تھے لیکن اس کے جانشین سب کے سب کمزور اور نکمے تھے۔یہ بات بھی زوال کا ایک اہم سبب بنی۔

قانون وراثت کا نہ ہونا

مغلوں کا کوئی خاص قانون وراثت نہیں تھا۔چنانچہ جب بھی کسی بادشاہ کا انتقال ہوتا تو اس کے بیٹوں کے درمیان تخت نشینی کے لیے جنگ چھڑ جاتی تھی۔جہانگیر،شاہ جہاں،اورنگ زیب کی وفات کے بعد تخت نشینی کے لیے خانہ جنگیاں ہوئیں جو سلطنت مغلیہ کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوئیں۔یہ خانہ جنگیاں اورنگ زیبؒ کی وفات کے بعد تیس سال کے عرصہ میں تو خاص کر بڑی کثرت سے ہوتی رہیں اور ان میں کئی شہزادے،امراء اور تربیت یافتہ سپاہی کام

آئے۔

مغلیہ فوج کی کمزوری

بے انتہا دولت اور عیش وعشرت کی وجہ سے مغلیہ فوج بھی آرام طلب اور کمزور ہوگئی تھی ۔افسر پالکیوں میں سوار ہوکر میدان جنگ میں جاتے تھے۔ سپاہی اپنے ساتھ، اپنی عورتیں لے جاتے تھے۔ بابر کے زمانے کی بہادری اور شجاعت ان میں نام کو نہ تھی۔ مغلیہ فوج کی کمزوری شاہ جہاں کے عہد میں عیاں ہوگئی تھی جب کہ مغل فوجیں قندھار کا علاقہ ایرانیوں سے واپس فتح کر لینے میں بری طرح ناکام رہی تھیں ۔اورنگ زیبؒ کے زمانے میں یہ کمزوری بہت نمایاں ہوگئی تھی۔

صوبوں کی خودمختاری

اورنگ زیب کی موت کے بعد جب کوئی قابل حکمراں نہ رہا تو اپنے اپنے صوبوں میں صوبے دار خودمختار ہو بیٹھے۔ بنگال میں علی وردی خان اودھ میں سعادت علی خان، دکن میں نظام الملک، آصف جاہ اور روہیل کھنڈ میں روہیلے محمد شاہ کے زمانے میں ہی خودمختار بن بیٹھے۔

بیرونی حملے

مغلیہ سلطنت کی کمزوری کا فائدہ اٹھا کر ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے ۱۷۳۹ء میں ہندوستان پر حملہ کیا اور سندھ بار کے علاقے اور افغانستان کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔اس کے بعد افغان سردار احمد شاہ ابدال نے ہندوستان پر حملے کئے اور اس سلطنت کی رہی سہی طاقت کو بھی مٹا دیا۔

وسعتِ سلطنت

اورنگ زیبؒ کے زمانہ میں مغلیہ سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی اور اس زمانے میں جب کہ نہ کوئی ذرائع آمد ورفت رہی اچھے تھے اور نہ کوئی خبر رسانی کا خاطر خواہ انتظام تھا۔ اتنی بڑی سلطنت قابو میں رکھنا نہایت مشکل کام تھا۔ چنانچہ سلطنت کی وسعت بھی زوال کا باعث ثابت ہوئی۔

نئی طاقتیں

مرہٹے اور سکھ بڑی تیزی سے اپنی طاقت کو بڑھا رہے تھے۔مرہٹے دکن سے شروع ہو کر شمالی ہند پر چھا گئے تھے اور سکھوں نے پنجاب پر تسلط جما لیا تھا اسکے علاوہ یورپین اقوام نے بھی ہندوستان میں اپنے قدم جما لیے تھے۔اس سے سلطنت کا شیرازہ بالکل ہی بکھر گیا۔

ہندوستان پر انگریزوں کا شرمناک دور

اٹھارہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہوتے ہی جا بجا نئی طاقتیں ظہور میں آ گئیں اور ملک چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بٹ گیا۔مہاراشٹر، گجرات، مالو، اور وسط ہند میں مرہٹے، بنگال میں علی وردی خان، اودھ میں برہان الملک، روہیل کھنڈ میں افغان سردار، حافظ رحمت خان، اور دکن میں نظام الملک آصف جاہ نے خودمختار حکومتیں قائم کر لیں۔اس طرح مرکزی مغلیہ حکومت کی عظیم الشان فوجی اور مالی قوت چھوٹی چھوٹی کمزور اکائیوں میں تقسیم ہو گئی اور اس کا فائدہ انگریزوں نے اٹھایا۔بہت قلیل عرصہ میں ہی انگریزوں نے ہندوستان کی سرزمین پر اپنے اقتدار کا سکہ جما لیا۔جب ہم تاریخ کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کرناٹک کی تیسری جنگ جو انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان ہوئی تھی اور اس میں کامیابی کا سہرا انگریزوں کو ملا تھا اس وقت سے ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کی ابتدا شروع ہو گئی۔کرناٹک کی اس تیسری جنگ کے بعد فرانسیسیوں کی ایسی خراب حالت ہو گئی تھی جسے انگریزوں کی ایک سال قبل فرانسیسیوں کا سب سے بڑا مرکز پانڈیچیری انگریزوں کے رحم وکرم پر تھا۔فرانسیسیوں کو اس وجہ سے اور بھی نقصان پہونچا کہ فرانسیسی حکومت نے ڈوپلے سے ناراض ہو کر اس وقت واپس چلے آنے کو کہا جب اس جیسے شاطر کی موجودگی ہندوستان میں اشد ضروری تھی۔اس سے ڈوپلے کے فرانسیسی سلطنت قائم کرنے کے منصوبوں پر پانی پھر گیا۔یہی نہیں ہوا بلکہ ڈوپلے جس نے ہندوستان کو فرانسیسی مقبوضہ بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا جب فرانس پہونچا تو اسے خوب ذلیل کیا گیا اور اسے گمنامی کے گڑے میں ڈھکیل دیا گیا۔

جنوبی ہند پر انگریزوں کا قبضہ

انگریزوں کے سب سے بڑے رقیب فرانس کے میدان سے ہٹتے ہی انگریزوں کو جنوبی ہند میں کامل اقتدار حاصل ہو گیا۔ زمانہ کا انقلاب دیکھئے کہ وہی انگریز جو ۱۷۵۱ء میں دشمنوں کے رحم وکرم پر زندگی کے آخری سانس گن رہے تھے وہ دو سال کے اندر اندر جنوبی ہند کی ایک بڑی طاقت بن گئے چڑھتے سورج کو سب ہی پوجتے ہیں۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے متاثر ہو کر نظام دکن جو پہلے فرانسیسیوں کا دوست تھا انگریزوں کا بہی خواہ اور وفادار بن گیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کلایو کا ارکاٹ پر حملہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اگر کلایو نے یہ جسارت نہ کی ہوتی تو شاید ہندوستان کی تاریخ میں دور دور تک انگریزوں کا نام تک نہیں ہوتا۔

کلایو نے کرناٹک کی جس ریاست پر قبضہ جمایا تھا وہ کوئی چھوٹی ریاست نہیں تھی بلکہ وہ تو جنوبی ہند میں راس کماری سے لے کر اڑیسہ تک تقریباً دو ہزار مربع میل میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ کرناٹک کو جنوبی ہند میں اہم ترین جغرافیائی حیثیت بھی حاصل تھی گویا انگریز اپنے پہلے ہی حملہ میں ہندوستان کے ایک ایسے خطے پر قابض ہو گئے جہاں سے وہ رفتہ رفتہ پورے ہندوستان میں پھیل سکتے تھے۔

انگریز جیسی عیار قوم کے ہاتھوں کرناٹک جیسے کلیدی مقام کا آ جانا تھا کہ انہوں نے فوراً اپنا دیرینہ خواب پورا کرنے کے لیے جوڑ توڑ کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اس خطہ سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ یہ کرناٹک کے بعد بنگال اور بہار کی جانب بڑھے اس کے بعد انہوں نے اودھ پر تسلط قائم کر لیا اور شاہ عالم ثانی کے دور حکومت میں ہی یہ ہندوستانیوں کی نالائقی کی بنا پر سارے ہندوستان کے مالک ومختار بن گئے۔

کرناٹک کی فتح کے بعد انہوں نے کس طرح بنگال میں جوڑ توڑ کر کے اپنے ہاتھ پاؤں پھیلانا شروع کئے ان کا اندازہ ان واقعات سے ہوگا جو ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔

فتح بنگال

۱۷۵۶ء میں اللہ وردی خان نواب بنگال جس نے صوبہ پر پندرہ سال حکومت کی انتقال کر گیا۔ اس کی موت نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک منحوس دروازے کو کھول دیا۔ بنگال اٹھارہویں صدی کے نصف تک گورنروں کے معاملہ میں بہت ہی تقدیر والا رہا۔ مرشد علی خان ۱۷۰۰ء میں بنگال کا دیوان مقرر کیا گیا۔ اپنی موت تک جو ۱۷۲۷ء میں واقع ہوئی حکمرانی کرتا رہا ۔اس کے بعد اس کے داماد سوجا خاں نے چودہ سال تک صوبہ پر حکمرانی کی ۔تقریباً ایک سال کی درمیانی مدت کے بعد جب کہ مرشد علی خان کا بیٹا فرماں روا رہا۔ اللہ وردی خان نے باگ چھین لی اور ۱۷۵۶ء تک حکمران رہا۔ یہ تینوں بڑے طاقت ور اور لائق منتظم تھے ان کی ماتحتی میں بنگال بہت زیادہ خوش حال ہوا یہاں تک کہ اسے ہندوستان کی جنت ،تصور کیا جاتا تھا۔

بنگال کا صوبہ جس کا دار الخلافہ مرشد آباد تھا محمد شاہ رنگیلا کے زمانے میں صوبے دار علی وردی خان کے ماتحت سلطنت مغلیہ سے خود مختار ہو گیا تھا۔ ۱۷۵۶ء میں نواب علی وردی خان نے وفات پائی اس کے بعد اس کا نواسہ سراج الدولہ بنگال کا نواب بنا۔تخت نشین ہوتے ہی نواب کا انگریزوں سے جھگڑا ہو پڑا۔اس جھگڑے کی ایک وجہ یہ تھی کہ علی وردی خان کے انتقال کے بعد انگریزوں نے فوجی تیاریاں شروع کر دیں۔فورٹ ولیم کالج کو وسعت دے کر زبردست فوجی چھاؤنی بنا دیا گیا۔سراج الدولہ نے انگریزوں کو فوجی تیاری ختم کرنے کا حکم دیا لیکن وہ باز نہیں آئے تو سراج الدولہ نے فورٹ ولیم کالج پر حملہ کر کے وہاں سے انگریزوں کو نکال دیا ۔انگریز گورنر اپنی فوج لیکر بحری بیڑے کے ساتھ جزیرہ فلٹا چلا گیا اور مدراس کو مدد کے لیے اطلاع دی ۔ مدراس سے کلایو کی سرکردگی میں فوجی امداد روانہ کی گئی ۔ یہ فوج کلکتہ پہونچتے ہی کلکتہ فتح کر لیا۔اس پر نواب نے گھبرا کر صلح کر لی۔

نواب کے خلاف سازش

صلح کے باوجود نواب در پردہ فرانسیسیوں کے ساتھ ساز باز کر رہا تھا یہ دیکھ کر کلایو نے اس کی نوابی کا خاتمہ کرنا چاہا اور موقع بھی بہت اچھا تھا امراء، وزراء اس کی حکومت سے تنگ آ چکے

تھے اور وہ میر جعفر کو جو علی وردی خان کا بہنوئی اور سراج الدولہ کی فوج کا سپہ سالار تھا نواب بنانا چاہتے تھے پہلے کلایو نے جنگ سیٹھ رومی چند کو ملا کر اس کے ذریعہ نواب کے سپہ سالار میر جعفر کو غداری پر آمادہ کرلیا اس کے بعد کلایو کی سرکردگی میں ۱۳ جون ۱۷۵۷ کو انگریز فوجیں کلکتہ سے نکلیں اور ۲۳ جون ۱۸۵۷ء کو پلاسی کی مشہور لڑائی ہوئی لیکن نواب سراج الدولہ اپنے وزیر میر جعفر کی غداری کی وجہ سے پلاس کے مقام پر شکست کھا گیا۔اس جنگ کے تعلق سے محمد الیاس ندوی لکھتے ہیں:

''اس جنگ میں انگریزوں کی فوج صرف تین ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جب کہ سراج الدولہ کے پاس ستر ہزار کی فوج تھی۔سراج الدولہ کو جنگ کے بعد انگریزوں نے گرفتار کرلیا۔ان کی شکست کی بنیادی وجہ فوج میں شامل منافقوں اور غداروں کی موجودگی تھی جن کا عبرتناک انجام چند ہی دنوں میں دنیا نے دیکھ لیا میر جعفر جذام کے مرض میں تڑپ تڑپ کر مرا۔امی سیٹھ پاگل ہوگیا اور راجہ دریا میں غرق ہوکر مرا اس کے بعد انہوں نے بنگال میں چوبیس پرگنہ، پر قبضہ کرلیا جو ہندوستان میں انگریزوں کا پہلا باضابطہ قبضہ تھا''۔(4)

پلاسی کی لڑائی انگریزوں نے بہت کم سپاہیوں کے جانی نقصان سے جیتی تھی ڈاکٹر تارا چند اسی تعلق سے لکھتے ہیں:

''جس طریقے پر لڑائی جیتی گئی اس کی کوئی دوسری مثال ملنا مشکل ہے پلاسی میں انگریزوں کا نقصان یہ تھا کہ سات یورپین اور ۱۷ سپاہی قتل ہوئے اور ۱۳ یورپین اور ۳۶ سپاہی زخمی ہوئے اور منافع یہ ہوا کہ ہندوستان کے سب سے دولت مند صوبہ پر حاکمانہ اقتدار حاصل ہوا۔جس سے ۲۵ ملین روپیہ کے سالانہ کے محاصل ملتے تھے اور جس میں ۳۰ ملین لوگ تھے۔''(5)

میر قاسم

بنگال کو انگریزی تسلط سے بچانے کی آخری کوشش میر قاسم نے کی۔میر قاسم میر جعفر کا داماد تھا کمپنی نے ۱۷۶۰ء میں میر جعفر کو معزول کر کے بنگال کا نواب مقرر کیا۔چند سال کے بعد ہی کمپنی ناراض ہوگئی اور ۱۷۶۳ء میں میر قاسم کو ہٹا کر دوبارہ میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا گیا

۔میر قاسم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کو چیلنج کیا۔اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور مغل بادشاہ شاہ عالم کے ساتھ مل کر بنگال پر چڑھائی کی اور بکسر کے مقام پر ۱۷۶۵ء میں انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔انگریزوں نے انہیں شکست فاش دی۔ یہاں میر جعفر کا کردار میر قاسم کے فوجی سردار نجف خان نے ادا کیا۔

جنگ کے بعد میر قاسم بھاگ گیا اور لا پتہ ہوگیا۔شاہ عالم اور شجاع الدولہ نے اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیا بادشاہ شاہ عالم کو انگریزوں نے الہ آباد میں نظر بند کر دیا۔اور مغل شہنشاہ سے بنگال اور بہار کی دیوانی کی سند حاصل کر لی۔ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

> ''بکسر کی لڑائی نے انگریزوں کو بنگال کا قانونی حکمراں بنا دیا اس نے جواب اودھ کو ایک ایسے معاہدہ کا پابند کر دیا جسے بنگال کی مغربی سرحد میں محفوظ ہوگئیں اس نے شہنشاہ کی پوزیشن کو گھٹا کر ان کو ایک وظیفہ خوار بنا دیا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مغل حکومت کے دوبارہ واپس آنے کے امکان کو ختم کر دیا۔''(6)

اس طرح سارے بنگال میں انگریزی عملداری ہوگئی اور اس کے بعد انگریز تمام ہندوستان میں سب سے طاقتور شمار ہونے لگے۔حقیقت یہ ہے کہ پلاس کی رہی سہی کسر بکسر نے پوری کر دی کیوں کہ اس لڑائی میں ہندوستان کا شہنشاہ بھی ہار گیا تھا۔

اودھ پر بھی انگریزوں کا اقتدار

بکسر کے خاتمہ کے بعد نواب شجاع الدولہ چاہتا تھا کہ انگریزوں سے اس کا قبضہ ختم ہو جائے لیکن انگریزوں نے ایسی سخت شرائط پیش کیں جن کو نواب نے تسلیم نہیں کیا۔چنانچہ جنگی سرگرمیاں دوبارہ شروع ہوگئیں۔انگریز سپاہیوں نے الہ آباد کا رخ کر کے اسے فتح کر لیا۔میر قاسم کی طرح شجاع الدولہ کو بھی فرار ہونا پڑا۔اس نے مرہٹوں اور روہیلوں سے مدد چاہی۔ملیاراؤ ہلکر تو شجاع الدولہ کی امداد کے لیے آ گیا۔مگر روہیلوں نے کوئی مدد نہ کی۔شجاع الدولہ کو ناکامی ہوئی۔اسکی ساری مملکت انگریزوں کے قبضہ میں چلی گئی اور اسے انگریزوں سے مندرجہ ذیل شرائط پر دب کر صلح کرنی پڑی۔

''شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپیہ بطور تاوان جنگ ادا کرنا ہوگا۔الہ آباد کا صوبہ مغل بادشاہ شاہ عالم کے ذاتی اخراجات کے لیے علیحدہ کر دیا جائے گا۔ نیز الہ آباد کا قلعہ بھی بادشاہ کے لیے خالی کرا دیا جائے گا۔انگریز سپاہیوں کا یک فوجی دستہ بادشاہ کی حفاظت کے لیے الہ آباد میں رہے گا۔شجاع الدولہ کو اپنے دربار میں انگریز وکیل رکھنا ہوگا۔''اس طرح انگریز فوج بھی اودھ میں پہونچ گئی۔مغل بادشاہ بھی انگریزوں کا نظر بند ہوگیا اور انگریزوں کا نمائندہ بھی اودھ کے دربار میں دخیل ہوگیا۔غرضیکہ انگریزوں نے اودھ پر بھی ہاتھ رکھ دیا اور مغل بادشاہوں کو بھی قبضہ میں لے لیا''۔(7)

کلایو دوسری بار بنگال کا گورنر

۱۷۵۸ء سے ۱۷۶۰ء تک کلایو پہلی مرتبہ بنگال کا گورنر رہا۔اس دور میں کلا پو نے بنگال اور دکن میں انگریزوں کی طاقت کو مضبوط کر دیا۔کام کی زیادتی کی وجہ سے چونکہ اس کی صحت خراب ہوگئی تھی اس لیے ۱۷۶۰ء میں وہ انگلینڈ واپس چلا گیا۔کلایو کے خلاف اگر چہ انگلستان میں عام ناراضگی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی بے ایمانی اور بد دیانتی کے افسانے انگلستان کے بچے بچے کی زبان پر تھے لیکن پھر بھی کلایو انگلستان کے لیے ایک لائق چور اور ہونہار ڈاکو تھا جس نے بڑی قابلیت کے ساتھ ہندوستانی علاقوں پر قبضہ پا کر سات سمندر پار کے ماہی گیروں کے لیے ہندوستان کے خزانے کا دروازہ کھول دیا تھا۔چنانچہ پانچ سال انگلستان رہنے کے بعد کلایو کو برطانوی ہائی کمانڈر نے دوبارہ بنگال کا گورنر بنا کر ۱۷۶۵ء میں لارڈ کا خطاب عطا کر کے مزید لوٹ اور غارت گری کے لیے ہندوستان بھیج دیا۔

کلایو کی عدم موجودگی میں اس کے جانشینوں نے ہندوستانیوں کے گلے پر چھری پھیرنے کے معاملہ میں کلایو کی صحیح معنوں میں تقلید کی تھی۔کلا پو کے پیچھے نہایت عیاری اور مکاری کے ساتھ نئے نئے نوابوں کو تخت نشین اور معزول کر کے کمپنی کے لیے علاقوں پر علاقے ہتھیا رہے تھے۔بکسر جیسی اہم لڑائی یہ جیت گئے تھے اودھ پر بھی انہوں نے ہاتھ رکھ دیا تھا اور مغل بادشاہ پر قابو پالیا تھا۔غرضیکہ انہوں نے کلایو کی مکارانہ پالیسی کے لیے اچھا خاصا میدان تیار کر دیا تھا۔انگریزوں کی سرگرمیاں اس وقت تک صرف صوبوں کے نوابوں تک ہی محدود تھیں۔لیکن کلایو

جواس مرتبہ اپنی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں لارڈ بنکر لندن سے آیا تھا اس کے سامنے ایک نہایت ہی وسیع پروگرام تھا۔ ہندوستانیوں کو ہمیشہ کے لیے غلام بنانے کا اور مغل بادشاہ سے شاہی اختیارات چھیننے کا کلایو نے سب سے پہلے شاہ عالم اور شجاع الدولہ کے ساتھ الہ آباد کے مقام پر ۱۷۶۵ء میں عہد نامہ کیا جس کی رول سے مغل بادشاہ شاہ عالم نے کمپنی کو بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی عطا کی۔اسی سے سارے بنگال پر انگریزی عمل داری ہوگئی اس کے بدلے میں کمپنی نے اسے ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ دینا منظور کر لیا شجاع الدولہ کو پچاس لاکھ روپیہ کے بدلے اودھ کا صوبہ واپس کر دیا گیا لیکن کڑا اور الہ آباد کے دو اضلاع اسے لے کر شاہ عالم کو دے دیئے گئے۔

زمانہ کا انقلاب دیکھئے وہ مغل بادشاہ جنہوں نے ہندوستان کی زمین کے ایک ایک چپہ کے لیے اپنے خزانے کھول دیئے ہوں اور لاکھوں جانوں کو بھینٹ چڑھا دیا ہو، ان ہی مغل بادشاہوں کا ایک نالائق بیٹا اپنے ملک کو انگلستان کے ان ماہی گیروں کو سستے داموں میں دے ڈالتا ہے جن کا ہندوستان سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا اور جو ہندوستان میں صرف ہندوستانیوں کا خون چوسنے آئے تھے۔

ہندوستان پر برطانوی حکومت کا تسلط

انگریزوں نے ہندوستانی کی مقدس سرزمین پر اپنے ناپاک قدم رکھنے کے بعد کس عیاری اور مکاری سے اپنے ناپاک قدم جما لیے گذشتہ صفحات میں اس پر کچھ روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انگریز نے کس عیاری کے ساتھ محبّ وطن، بنگال کے نواب سراج الدولہ کو ختم کیا اور ان کے جانشینوں کے ساتھ کیسی کیسی مکاریاں کیں۔

انگریزوں کی مکاریوں کا سلسلہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا بلکہ ان کی عیاری اور مکاری کے بہت سے واقعات ہیں جن کو ہم آگے قلم بند کرنے جا رہے ہیں۔جن سے اس بات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انگریزوں نے بنگال، بہار، اڑیسہ اور ملک کے دوسرے حصوں پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد کس طرح ان تمام اہم طاقتوں کا خاتمہ کر دیا جو کبھی نہ کبھی ہندوستان میں ابھر سکتی تھیں اور ملک کو انگریزوں کے ناپاک قدم سے پاک کر سکتی تھیں۔

شاہ عالم جوالہ آباد میں انگریزوں کا پینشن خور تھا باضابطہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوان چندنئ شرائط کے ساتھ انگریزوں کے حوالہ کی اسی سے انگریزان ملکوں کے حقیقی مالک بن گئے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ کا نواب ان کے ماتحت پنشن پانے لگا۔

ہندوستان کے اہم ترین حصوں پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد انگریزوں کو سب سے پہلے یہ فکر ہوئی کہ برصغیر کی ان تمام طاقتوں کو جن کو تھوڑا بہت اقتدار حاصل تھا ختم کر دیا جائے ۔انگریزوں نے حکومت کے ہاتھ میں آتے ہی ان تمام طاقتوں کو کچلنے کا ایک بہت وسیع پروگرام بنایا جن سے کہ انہیں کسی بھی طرح کا اندیشہ تھا۔

دکن میں دفاعی کارروائیاں

جن دنوں سراج الدولہ پلاسی کے میدان میں اپنی جان اور مال کی قربانی پیش کر رہے تھے ۔انہیں دنوں جنوبی ہند کی چھوٹی سی جاگیردار میسور کا ہندو راجہ کرشنا اوڈیر حیدر علی کی فوجی صلاحیت سے متاثر ہوکر اسے فتح حیدر کا خطاب دیکر اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کر رہا تھا۔ یہ وہی حیدر علی اور اس کا نامور بیٹا ٹیپو سلطان ہے جن کی شہادت سے پہلے انگریزوں کو یقین نہیں تھا کہ وہ ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان کو زنجیر غلامی میں پوری طرح جکڑنے اور مکمل اقتدار حاصل کرنے کے لیے انگریزوں کو جنوبی ہند میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان سے مسلسل تیس ۳۰ سال تک چار بڑی جنگیں لڑنی پڑیں۔

حیدر علی ایک بڑا قابل حکمراں اور زبردست فوجی جرنیل تھا۔ حیدر علی سلطنت کے کام کو نہایت باقاعدگی اور پھرتی سے انجام دیتا تھا۔ ہر محکمہ کی دیکھ بھال بذات خود کرتا تھا اور کبھی بیکار نہیں بیٹھتا تھا۔ حیدر علی انگریزوں کا زبردست حریف تھا اس نے انگریزوں کے خلاف دو جنگیں کیں۔ جنہیں میسور کی پہلی اور دوسری جنگ کہتے ہیں۔

میسور علی کی پہلی جنگ

تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ غریب حیدر علی کا وہ کونسا قصور تھا جن کی پاداش میں گورے سپاہیوں نے اس کے ملک پر اچانک آ چڑھے۔ انگریز مورخ اس کی

وجہ یہ بتاتے ہیں کہ اس جنگ میں انگریز صرف نظام اور مرہٹوں کے کہنے کی وجہ سے شریک ہو گئے تھے۔مگر حیرت ہوتی ہے اس بات پر کہ اگر نظام اور مرہٹے اس جنگ کے اصل محرک تھے تو انگریز جیسی مضبوط طاقت کے مل جانے کے بعد ان کی ہمت اور بھی بڑھ جانی چاہیے تھی نہ یہ کہ وہ انگریزوں کو میدان جنگ میں اکیلا چھوڑ کر بھاگ جاتے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ حیدر علی کی ترقی دکن کی دوسری طاقتیں اپنے لیے باعث خطرہ سمجھتی تھیں۔ چنانچہ نظام، مرہٹوں اور انگریزوں نے اس کے خلاف اتحاد قائم کر لیا۔

انگریزوں نے اپنے ناپاک مقصد کی تکمیل کے لیے دباؤ ڈال کر پہلے تو نظام اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ اس جنگ میں شامل کر لیا پھر بلا وجہ میسور پر یورش کر دی۔نظام اور مرہٹے یا تو انگریزوں کی چال کو سمجھ گئے یا اور کسی خاص وجہ سے انہوں نے اس طویل جنگ میں زیادہ مدت تک انگریزوں کی خاطر اپنے آدمی اور روپیہ برباد کرنا نہیں چاہا۔ چنانچہ انگریز شکست کھا کر بھاگے اور حیدر علی ان کا پیچھا کرتے ہوئے مدراس تک جا پہونچا۔انگریزوں نے اس فیصلہ کن شکست سے گھبرا کر مکمل تباہی کو دعوت دینے سے پہلے حیدر علی سے صلح کی درخواست کی۔حیدر علی نے اپنے مطلب کی شرائط پر ۱۷۶۹ء میں مدراس کے صلح نامہ پر دستخط کر دیئے۔جس کی اہم شرط یہ تھی کہ انگریز کبھی ریاست میسور پر حملہ نہیں کریں گے اور دونوں فریقوں میں سے کسی تیسری طاقت کے حملہ کی صورت میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

حیدر علی سے انگریزوں کی بدعہدی

حیدر علی سے شکست کھانے کے بعد انگریزوں میں اتنی ہمت تو نہیں تھی کہ وہ خود حیدر علی سے ٹکر لیتے۔لیکن انہوں نے اپنی ریشہ دوانیوں سے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ۱۷۷۱ء میں مرہٹوں نے میسور پر چڑھائی کی۔حیدر علی نے انگریزوں سے مدد کی درخواست کی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔حالانکہ حیدر علی اور انگریزوں کے سابقہ معاہدہ کے مطابق انگریزوں کا فرض تھا کہ وہ مرہٹوں کے مقابلہ میں حیدر علی کی امداد کرتے۔مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا اس لیے کہ انہوں نے ہی مرہٹوں کو حیدر علی کے خلاف ابھارا حیدر علی محض انگریزوں کی ریشہ دوانی اور بد

عہدی کی بنا پر مرہٹوں کے مقابلہ میں شکست ہوگئی ۔غریب حیدرعلی کی ۳۶ لاکھ روپیہ اور اپنی حکومت کے کچھ علاقے دیگر مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی ۔ انگریز خوش تھے کہ ان کے سب سے بڑے دشمن کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور حیدرعلی کے تن بدن میں آگ لگ رہی تھی کہ انگریزوں نے عین وقت پر اس کے ساتھ دغا کی ۔اس وعدہ خلافی کی وجہ سے حیدرعلی انگریزوں کا جانی دشمن بن گیا۔

وارن ہسٹنگز گورنر بنگال۱۷۷۲سے۱۷۷۴تک)۔

وارن ہسٹنگز بھی کلایو کی طرح تقریباً ۱۸ سال کی عمر میں ایک کلرک کی حیثیت سے ہندوستان آیا لیکن اپنے حسن لیاقت اور قابلیت کی وجہ سے رفتہ رفتہ ترقی کرتا ہوا اعلیٰ عہدہ پر پہونچ گیا ۔۱۷۷۲ء میں وہ بنگال کا گورنر ہوا۔ انگریزوں نے وارن ہسٹنگز کی قابلیت اور اعلیٰ استعداد کے خوب گن گائے ہیں اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیے تھا کیوں کہ لارڈ کلایو کے بعد وارن ہسٹنگز ہی وہ دوسری شخصیت تھی جس نے فاقہ زدہ ہندوستانیوں کی لاشوں پر کھڑے ہوکر انگریزی اقتدار کا جھنڈا لہرایا۔

ہیسٹنگز کی تقرری کے وقت بنگال کی حالت بہت خراب تھی ۔ دوعمل کی وجہ سے سارا نظام درہم برہم ہو چکا تھا لگان وصول کرنے کا کوئی خواطر خواہ نظام نہیں تھا۔خزانہ تقریباً خالی پڑا تھا ۔ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔محکمہ انصاف کی حالت ناگفتہ بہ تھی اور ہر علاقہ میں ڈاکو اور رہزن پھر رہے تھے ۔ چنانچہ وارن ہسٹنگز نے سب سے پہلے دوعملی کا خاتمہ کیا اور انتظام حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے سدھارنے کے لیے کئی اصلاحات رائج کیں ۔

اصلاحات

وارن ہسٹنگز نے اپنے گورنری کے دور میں کئی اصلاحات کیں ۔ہسٹنگز نے کلایو کی دوعملی کی پالیسی کو ختم کر دیا۔ دیوانی اور فوجداری کے دفاتر مرشدآباد سے کلکتہ منتقل کر دیئے گئے ۔شاہی خزانہ بھی کلکتہ منتقل ہوگیا ہر ضلع میں ایک دیوانی اور فوجداری عدالت قائم کی گئی دیوانی عدالت کا جج انگریز کلکٹر ہوتا تھا جو لگان وصول کیا کرتا تھا۔فوجداری عدالت میں انصاف کا کام مفتی اور

قاضی کرتے تھے کلکتہ ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا دارالسلطنت قرار دیا گیا جو ۱۹۱۰ء تک باقی رہا۔ ہسٹنگز نے کمپنی کا خزانہ پر کرنے کے لیے نواب بنگال کے جانشین کا سالانہ وظیفہ بھی نصف کر دیا اور شاہ عالم کا ۲۶ لاکھ روپیہ سالانہ کا خراج ایک سرے سے اڑا دیا۔ کڑا اور الہ آباد کے اضلاع شاہ عالم سے واپس لے لیے گئے اور شجاع الدولہ، نواب اودھ کے ہاتھ ۵۰ لاکھ روپیہ میں بیچ دیئے گئے روہیلوں کے خلاف شجاع الدولہ کی مدد کرنے کے عوض ۴۰ لاکھ روپئے کمپنی کے لیے حاصل کیا۔

روہیلوں کی لڑائی

روہیلے جنگجو افغان تھے اور افغانستان سے یہاں آئے تھے۔ وہ اودھ کے شمال مغربی علاقہ میں جسے ان کے نام پر روہیل کھنڈ کہتے ہیں رہا کرتے تھے ان کا سردار ایک شخص حافظ رحمت خان تھا۔ مرہٹے ان کے زرخیز ملک پر اکثر حملے کرتے رہتے تھے اس لیے انہوں نے شجاع الدولہ نواب اودھ سے مرہٹوں کے خلاف مدد مانگی اور اس کے بدلے میں چالیس لاکھ روپئے دینے کا وعدہ کیا۔

۱۷۷۳ء میں مرہٹوں نے روہیل کھنڈ پر حملہ کیا لیکن نواب کی فوجوں سے ڈر کر وہ بغیر لڑائی لڑے واپس چلے گئے۔ اب نواب شجاع الدولہ نے اپنی رقم کا مطالبہ کیا لیکن روہیلوں نے ٹال مٹول کی اس پر نواب نے انتقام لینے کے لیے ہیسٹنگز سے مدد مانگی اور وعدہ کیا کہ میں جنگ کا تمام خرچ بھی برداشت کروں گا اور کمپنی کو ۴ر لاکھ روپئے بھی دوں گا چنانچہ ہیسٹنگز نے انگریزی فوج کا ایک دستہ بھیج دیا۔ بہادر روہیلوں نے دشمن وطن، نواب اودھ اور انگریزوں کا بڑی بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ انہوں نے روہیل کھنڈ کی آزادی برقرار رکھنے کے لیے اپنے ہزاروں سرفروش قربان کر دیئے لیکن پھر بھی روہیلوں کو میراں پور کٹرہ کے مقام پر شکست ہوگئی شکست بھی ایسی کہ ہزاروں روہیلہ خاندان برباد ہو گئے جو باقی رہ گئے وہ ہجرت کر کے جدھر کو منہ اٹھا چلے گئے۔ اور روہیل کھنڈ کا علاقہ اودھ میں شامل کر لیا گیا۔

ہیسٹنگز کا روہیلوں کے خلاف نواب اودھ کی مدد کرنا اخلاقی طور پر سراسر ناجائز تھا کیوں کہ

روہیلوں نے کمپنی کے خلاف کبھی بھی کوئی کارروائی نہیں کی تھی ۔ چنانچہ پارلیمنٹ کے ممبروں سے لے کر کلکتہ کونسل کے ممبروں تک ہیسٹنگز کی اس ظالمانہ اور جابرانہ حرکت کے خلاف سخت نکتہ چینی کی ۔البتہ سیاسی لحاظ سے اس کی صفائی میں اتنا کہا جا سکتا ہے کہ کمپنی کو ایک معقول رقم مل گئی اور روہیل کھنڈ کا علاقہ نواب اودھ کے قبضہ میں آ جانے سے انگریزوں کی شمالی مغربی سرحد مضبوط ہوگئی۔

مرہٹوں کی پہلی جنگ

انگریزوں کے ابتدائی دور میں مرہٹے ملک کی سب سے بڑی طاقت تھے گو یہ ضرور ہے کہ پانی پت کے میدان میں احمد شاہ ابدالی نے ان کی کمر توڑ دی تھی اور لوگ لاکھوں کی تعداد میں اس جنگ میں کام آ گئے تھے۔ پھر بھی ان کے اثرات جنوبی ہند اور وسطیٰ ہند سے لیکر شمالی ہند تک پھیلے ہوئے تھے۔

۱۷۷۲ء میں نارائن راؤ، مرہٹوں کا پانچواں پیشوا بنا لیکن اس کے چچا رگھوناتھ راؤ جو پیشوا بننے کا بڑا خواہش مند تھا اسے قتل کروا دیا اور خود پیشوا بننے کی کوشش کرنے لگا۔ نانا فرنویس جو ایک لائق مرہٹہ سردار تھا اس کی مخالفت کی اور نارائن راؤ کے بیٹے مادھوراؤ نارائن کو جو اپنے باپ کی وفات کے بعد پیدا ہوا تھا پیشوا کی گدی پر بٹھا کر خود اس کا سرپرست بن گیا اور بہت سے سردار نانا فرنویس کے ساتھ مل گئے۔

۱۷۷۸ء میں مرہٹوں اور انگریزوں میں جو جنگ چھڑی تھی اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کا کیرکٹر کس قدر پست تھا۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ مرہٹوں میں خانہ جنگی برپا ہے تو انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اس خانہ جنگی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس جنگ کے تعلق سے مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''پہلی لڑائی مرہٹوں اور انگریزوں میں چوتھے اور پانچویں پیشوا مادھوراؤ اور نارائن راؤ کے چچا رگھوناتھ راؤ کی حوصلہ مندی کا نتیجہ تھی۔ مادھوراؤ ایک ایسی بیماری میں ہلاک ہوا جو جسم کو گھلا دیتی ہے اور نارائن راؤ نسوانی رقابتوں اور محل کی رقابتوں کا شکار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ رگھوناتھ راؤ

گدی کا دعویدار تھا۔لیکن نارائن راؤ کے مرنے کے بعد اس کا ایک جانشین پیدا ہو جائے وہ جس متاع عزیز کی لالچ رکھتا تھا اس سے محروم رہا اسی لیے سورت کے مقام پر ۱۷۷۵ء میں اس نے ایک صلح نامہ پر دستخط کر کے مرہٹوں کی آزادی اس لیے قربان کر دی کہ وہ انگریزوں کا پٹھو، پیشوا بن جائے انگریز تو نہایت ہی رغبت سے اسی تاک میں تھے ہی کہ طاقت حاصل کرنے کا اب موقع حاصل کریں لیکن ہر حال میں یہ کوشش قبل از وقت ثابت ہوئی۔مرہٹوں کے وفاق کی وحدت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی اور لائق اور معتدل مشیر مادھوراؤ سندھیا اب بھی اثر انداز ہو سکتے تھے اسی لیے جولڑائیاں ہوئیں ان میں سہرا دونوں کے سر برابر باندھا گیا۔انگریزوں کو ذلتیں برداشت کرنی پڑیں لیکن گارڈرد نے وسط ہندوستان سے مارچ کر کے سندھیا کو شکست دی اسی لیے ان کا وقار بحال ہو گیا''۔(8)

اب وارن ہیسٹنگز جنگ ختم کرنا چاہا تھا کیوں کہ ایک تو خرچ بڑا ہو رہا تھا اور دوسرے دکن میں حیدر علی کا اقتدار بڑھتا جاتا تھا۔چنانچہ ۱۷۹۲ء میں صلح نامہ سے جنگ کا خاتمہ ہو گیا۔

اس صلح نامہ کی رو سے مادھوراؤ کو پیشوا تسلیم کر لیا گیا۔سالسٹ کا جزیرہ انگریزوں کو مل گیا اور راکھوناتھ راؤ کے لیے تین لاکھ روپئے پنشن مقرر کر دی گئی۔

میسور کی دوسری جنگ

میسور کی پہلی جنگ کے بعد (۱۷۶۹ء) انگریزوں نے حیدر علی سے وعدہ کیا تھا کہ اگر کسی دشمن نے اس پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تو ہم آگے بڑھ کر آپ کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔ مگر اس وعدہ کے کچھ دنوں بعد ہی جب مرہٹوں نے حیدر علی پر حملہ کیا تو انگریزوں نے اس کی مدد نہ کی انگریزوں کے اس رویہ سے حیدر علی بہت زیادہ ناراض ہوا۔اسی زمانہ میں اتفاق ایسا ہوا کہ انگلستان اور فرانس میں جنگ چھڑ گئی اور اس جنگ کے چھڑتے ہی انگریزوں نے فرانس کے ہندوستانی مقبوضات پر قبضہ کر کے فرانسیسوں کو بے دخل کر دیا اور پانڈ چیری کا محاصرہ کر کے انگریزوں نے اسے لے لیا اور ماہی کی بندرگاہ پر قابض ہو گئے۔

ماہی چونکہ میسور کے علاقہ میں آتا تھا اس لیے حیدر علی کو ایک بہانہ ہاتھ آ گیا۔چنانچہ اس نے انگریزوں سے مطالبہ کیا کہ ماہی خالی کر دیا جائے لیکن انگریزوں نے اس کی کچھ بھی پرواہ نہ

کی ۔غرضیکہ ماہی کے معاملہ پر انگریزوں اور حیدر علی میں ۱۷۸۰ء میں وہ تاریخی جنگ چھڑ گئی جو دوسری جنگ میسور کے نام سے مشہور ہے۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے مل کر ۱۷۸۱ء میں بکسر کے فاتح میجر منرو اور کرنل بیلی کی مشترکہ فوج کو زبردست شکست دی۔اس جنگ میں مرہٹے اس امید پر حیدر علی کا ساتھ دے رہے تھے کہ وہ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرسکتا ہے ۔ابھی جنگ جاری تھی کہ ۷/دسمبر ۱۷۸۲ء کے دن حیدر علی کا میدان جنگ میں انتقال ہوگیا۔حیدر علی کے انتقال سے مرہٹے بددل ہوگئے اور گھبرا کر نانا فرنویس نے انگریزوں سے دب کر صلح کرلی اس طرح انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دینے کا ایک اور موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

حیدر علی کے انتقال کے بعد اسی کے لڑکے ٹیپو سلطان نے جنگ جاری رکھی اور کئی ایک علاقے بھی فتح کئے آخر ۱۷۸۴ء میں عہد نامہ منگلور کی رو سے فریقین میں صلح ہوگئی عہد نامہ منگلور کی رو سے ایک دوسرے کے مفتوحہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کردیئے گئے ۔

لارڈ کارنکوالس ۱۷۸۶ سے ۱۷۹۳ء

لارڈ کارنوالس کو ۱۷۸۶ء میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا کر بھیجا گیا۔یہ وہی کارنوالس تھا جس کو امریکہ نے اپنی آزادی کے دوران شکست دی تھی جب امریکہ میں کارنوالس ناکام ہوا اور امریکہ انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل گیا تو اسے ہندوستان بھیجا گیا تاکہ وہ ہندوستان پہونچنے کے بعد اس نقصان کی تلافی کرسکے جو انگلستان کو امریکہ کے قبضہ سے نکل جانے سے ہوا تھا۔یہ وہی لارڈ کارنوالس ہے جو اپنے ساتھ ''انڈیا بل'' لایا تھا جو امن پسندی کا چارٹر تھا اور جس میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ ملک گیری نہیں چاہتا ہے۔

لارڈ کارنوالس جیسے ہی ملک کے اندرونی انتظامات سے فرصت ملی اس نے ملک گیری کے لیے جوڑتوڑ شروع کردیا یا بالفاظ دیگر انڈیا بل کی امن پسندی کی دھجیاں اڑانی شروع کردی اور ٹیپو جیسے محبّ وطن کو کچلنے کے لیے وسیع پیمانے پر تیاریاں ہونے لگیں۔

میسور کی تیسری جنگ

لارڈ کارنوالس کی نظر سب سے پہلے ٹیپو سلطان پر پڑی کیوں کہ وہی ایک ایسی آہنی دیوار تھی جس کو گرے بغیر کارنوالس کو اپنی کامیابی کا یقین نہیں تھا ہندوستان پہونچتے ہی کارنوالس نے سب سے پہلے نواب اودھ پر بے انتہا مظالم ڈھا کر اودھ کی کی ساری دولت چھین لی۔اس کے بعد کارنوالس کلکتہ سے مدراس پہونچا۔نظام حیدرآباد اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک زبردست فوج کے ساتھ ریاست میسور پر حملہ کر دیا۔اس جنگ میں سلطان کو انگریزوں ،نظام اور مرہٹوں کی مشترکہ فوج سے لڑنا پڑا۔سلطان نے کئی مقامات پر اتحادی فوجوں کو شکست دی اور پیچھے ہٹتا ہوا سرنگا پٹنم پہونچ گیا۔انگریز فوجوں نے سلطان کے پایۂ تخت کا محاصرہ کرلیا۔آخر ٹیپو نے مقابلہ کی تاب نہ لاکر صلح کر لی اور عہدنامہ سرنگا پٹنم قرار پایا۔

عہدنامہ سرنگا پٹنم ۱۷۹۲ء

اس عہدنامہ کی رو سے ٹیپو نے اپنی آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کر دی اور تین کروڑ روپئے تاوان جنگ ادا کیا اور دو بیٹوں کو ضمانت کے طور پر دیا۔

مرہٹے سلطان کے اس بے مثال ایثار سے بہت متاثر ہوئے کہ سلطان نے اپنے لخت جگر کو تاوان جنگ میں دینا قبول کیا لیکن مادر وطن کی غلامی قبول نہیں کی۔اس واقعہ سے متاثر ہوکر مرہٹہ سردار نے کہا کہ سلطان سے جنگ کرنا مادر بھومی سے غداری کرنے کے برابر ہے،لیکن نظام علی خان فرماں روائے سلطنت آصفیہ غیرت وحمیت سے اتنا تہی دامن ہو چکا تھا کہ اس کے ماتھے پر شکن تک نہیں آئی۔مرہٹوں نے اپنا کہا پورا کیا اور میسور کی چوتھی جنگ میں انگریزوں کا ساتھ نہیں دیا۔

لارڈ ولزلی ۱۷۹۸ء سے ۱۸۰۷ء

لارڈ ولزلی کا دور حکومت ہندوستان کی برطانوی تاریخ کا تاریک ترین دور ہے جس دور میں انتہائی مکاری، دجل اور فریب کے ذریعے ہندوستان کی تقریباً تمام طاقتوں کو مٹا کر رکھ دیا گیا۔یہ گورنر جنرل ۱۷۹۸ء میں ہندوستان آیا اور ۱۸۰۵ء تک اس ملک میں قہر بن کر رہا۔ولزلی

عیاری اور مکاری میں کسی طرح اپنے پیش رو گورنر جرنلوں سے کئی درجے آگے رہا۔اس سے قبل جان شور کا دور دکن میں نسبتاً امن کا دور تھا۔ نئے گورنر جنرل کے آتے ہی میسور پر فوج کشی کی تیاریاں شروع ہوگئیں ۔ٹیپو سلطان کی آدھی حکومت چھین چکی تھی ۔اس کی سرحدیں سمندر سے دور ہو چکی تھیں ۔ پھر بھی سلطان نے ہمت نہیں ہاری۔

میسور کی چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء

میسور کی چوتھی جنگ انگریزوں اور ٹیپو سلطان کے درمیان ہوئی ٹیپو سلطان انگریزوں سے اپنی سابقہ شکست کا انتقام لینے کے لیے فرانسیسیوں سے ساز باز کر رہا تھا اور آزادی کے جدوجہد کو ایک پین الاقوامی مسئلہ بنانا چاہتا تھا۔ ولزلی نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان کے علاقائی رجواڑے پین الاقوامی تعلقات سے پیدا کر کے حکومت برطانیہ کو اپنے سامراجی عزائم پورا کرنے کے راستے میں مشکلات کھڑی کریں۔ چنانچہ سلطان کی سفارتی سرگرمیوں کو وہ ایک باغی کی ناقابل معافی حرکتوں سے تعبیر کرتا تھا ولزلی ایک کٹر شاہ پرست پارلمنٹری طرز حکومت کا مخالف اور فرانس کا سخت دشمن تھا۔سلطان کے دربار میں فرانسیسی اثر ورسوخ اور نپولین کی مخالف برطانوی پالیسی سے خوف زدہ تھا۔چنانچہ اس نے زیادہ انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا ۔نظام حیدرآباد۔ ریاست میسور کے مشرقی اضلاع کڑپہ اور کرنول کو ہڑپ کرنے کے لیے بے چین تھا۔مرہٹے ٹیپو سے لڑنا نہیں چاہتے تھے اور نہ اس کی مدد کرنے کے لیے تیار تھے لہذا نظام حیدرآباد کی کثیر فوج کو ساتھ لیکر ولزلی نے ۱۷۹۹ء میں میسور پر حملہ کر دیا۔حملہ دو طرف سے کیا گیا مدراس کی طرف سے جنرل پارس' ملیبار اور کورگ کے راستے سے جنرل اسٹورٹ سرنگا پٹنم کی طرف بڑھے۔حیدرآبادی فوج میر عالم کی کمان میں جنرل بارس کے ساتھ تھی سلطان نے چند طوفانی دستے دونوں طرف روانہ کئے تاکہ انگریزی فوج کی پیش قدمی کی رفتار کو قابو میں رکھا جائے اور اپنی بیشتر عسکری قوت کو یکجا کر کے سرنگا پٹنم میں انتظار کرنے لگا۔ برسات میں دریائے کاویری کی طوفانی موجیں کسی کو سرنگا پٹنم میں داخل ہونے نہیں دیتی ہیں ۔سلطان کی جنگی چال تھی کہ موسم برسات میں انگریزی فوجوں کو ایک لمبے عرصہ تک روک کر انہیں ہراساں کرے اور

کاویری کے کنارے انہیں عبرت ناک شکست دے کر بھاگیرتی کے کنارے انہوں نے جو کچھ حاصل کیا تھا اسے کاویری کے کنارے کھودیں۔ جوطوفانی دستے انگریزوں کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے روانہ کئے گئے تھے ان کے سالار پہلے غداروں کی ناپاک فہرست میں اپنا نام لکھوا چکے تھے۔لہٰذا انگریزی فوجیں دونوں طرف سے بغیر کسی مزاحمت کے تیزی کے ساتھ پائے تخت پہونچ گئیں۔سرنگا پٹنم کے قلعے کو جب انگریزی فوجوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور قلعہ پر مسلسل گولہ باری ہونے لگی تو اس وقت سلطان کو اندازہ ہوگیا کہ اس کے اعلیٰ فوجی افسروں کی صف میں چند غدار افسر بھی موجود ہیں جو انگریزوں سے ملے ہوئے ہیں تاریخ نے ایک بار پھر پلاسی کا ڈراما سرزمین میسور پر دہرایا۔میر جعفر، ولبھ رام، امی چندر اور نجف خان کی روحیں میر صادق، میر معین الدین، میر قاسم، میر قمرالدین اور بدرالزماں کی شکل میں نمودار ہوئیں۔

جنہوں نے اپنے ملک و مالک دونوں سے غداری کی ان کی مدد اور رہنمائی میں انگریزی فوجیں فصیل توڑ کر شہر میں داخل ہوگئیں۔ٹیپو سلطان نے ہتھیار ڈال کر گرفتار ہونے سے انکار کردیا اور اپنے بے شمار ہندو مسلم سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں سے لڑتے ہوئے ۱۷۹۹ کو جام شہادت نوش فرمایا۔سلطان کی شہادت کے ساتھ ہی آزادی کا چراغ گل ہوگیا اور قوم اور وطن کے دشمنوں کو للکارنے والا کوئی مجاہد باقی نہ رہا تو انگریز فرط و مسرت سے چلا اٹھے کہ

''آج ہندوستان ہمارا ہے''

مرہٹوں کا زوال

ٹیپو سلطان کے بعد مرہٹے ایک قوت رہ گئی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہوس ملک گیری پر بند باندھ سکتے تھے۔لیکن مرہٹوں کی باہم خانہ جنگی نے جو نانا فرنویس کی موت پر شروع ہوئی۔ولزلی کو ان کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔۱۸۰۲ء میں آخری پیشوا باجی راؤ ثانی نے ہٹلر کے ہاتھوں شکست کھا کر انگریزی حکومت کے ساتھ عہد نشین کرلیا۔جس کی رو سے اس نے سبسیڈی ایری سسٹم کی تمام شرائط کو مان لیا اس طرح مرہٹوں کی مرکزی حکومت کا وجود ختم ہوگیا۔

سندھیا اور بھونسلا نے عہد نامہ بسین کو قومی توہین خیال کرتے ہوئے انگریزوں سے جنگ

چھیڑ دی جسے مرہٹوں کی دوسری جنگ کہتے ہس ۔ اس میں انہیں شکست ہوئی اور انہوں نے سبسیڈری ایر سسٹم قبول کرلیا ۔ اس کے بعد ہٹلر نے جو مرہٹوں کی دوسری جنگ میں الگ تھا انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی جسے بعض مورخ مرہٹوں کی تیسری جنگ کہتے ہیں ۔اس میں ملکر کو کافی نقصان کا سامنا کرنا پڑا اس طرح مرہٹوں کی سیاسی طاقت کا زوال ہو گیا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ولزلی نے نہ صرف کمپنی کے دشمنوں کو ہی ایک ایک کر کے ختم کیا بلکہ انگریزی سلطنت کو بہت وسعت دی ۔کرناٹک ،منجور اور سورت کے علاقے انگریزی سلطنت میں ملا لیے گئے اس کے علاوہ کئی ایک علاقے امدادی فوج کے خراج کے عوض حاصل کئے موجودہ صوبہ ٹاملناڈو پر انگریزی عمل داری ولزلی کے زمانے میں ہوئی ۔

لارڈ ولزلی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۵۰ سال کے اندر یعنی ۱۸۵۰ء تک ہندوستان کی علاقائی ریاستوں کے علاوہ لگ بھگ پچیس ہزار جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمین داروں کی املاک ضبط کر کے انگریزی راج میں شامل کرلیا جس جس علاقے کا الحاق انگریز کرتے گئے وہاں کی بے اندازہ دولت لوٹ لی گئی ۔شہر ویران ہو گئے ۔زراعت ،صنعت اور تجارت تباہ ہو گئی ۔صنعت ،تجارت کی بربادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ روٹی روزگار کے لیے زراعت کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن انگریزوں نے پہلے بڑے بڑے زمین داروں کو زمینات سے بے دخل کر کے ان پر چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کو مقرر کر دیا تھا ۔اور ان پر براہ راست زبردست محصول عائد کر دیا تھا چھوٹے کاشت کاروں سے جو لوٹ کی دولت حاصل کی گئی ۔ اسے زرعی ترقی اور کسانوں کی امداد میں لگانے کے بجائے ہندوستان میں لڑی گئی جنگوں کے مصارف اور برطانیہ کی صنعتی ترقی میں جھونک دی گئی ۔اس طرح ہندوستانی زراعت کو ترقی کرنے اور ملکی ضروریات کے مطابق آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا گیا ۔۱۷۵۷ء سے ۱۸۵۷ء تک کمپنی بہادر نے ہندوستان میں ۲۰ عظیم جنگیں لڑی تھیں جس کا سارا خرچ ہندوستان کی زمینوں کے محصول سے ادا کیا گیا اس کے علاوہ جو دولت ہندوستان کے رجواڑوں اور نوابوں سے زبردستی چھین لی گئی تھی وہ راست طور پر کمپنی کے انگریز ملازمین خصوصا فوجی سربراہوں کے جیب میں چلی گئی تھی ۔اس

کے علاوہ انگریزوں نے چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں کو مجبور کر کے زرخیز زمینوں پر زندگی کے بنیادی ضروریات کے اناج جیسے چاول، جوار، مکئی، گیہوں اور دالیں وغیرہ اگانے کے بجائے کیش کراپ جیسے پٹ سن، کاٹن، مرچ، دھنیا اور افیون وغیرہ اگانے کا رواج ڈالا۔ اس لوٹ کھسوٹ اور غلط پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ شمالی ہند ۱۸۳۷ء میں ہولناک قحط کا شکار ہوگیا۔ اس قحط کے دوران ایک اندازے کے مطابق بنگال اور بہار میں کم از کم آٹھ لاکھ انسان موت کا نوالہ بن گئے''۔

لارڈ ڈلہوزی ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ء

لارڈ ڈلہوزی کا شمار ہندوستان کے مشہور گورنر جنرلوں میں کیا جاتا ہے۔ اس عہدہ کا چارج لیتے وقت اس کی عمر ۳۵ سال کی تھی اس نے سلطنت انگریزی کو خوب وسعت دی اور ملک میں کئی اصلاحات نافذ کیں لارڈ ڈلہوزی کا دور حکومت اس اعتبار سے بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس گورنر جنرل نے ۱۸۴۸ء میں چارج لینے کے بعد کمپنی اور والیان ملک کے پرانے معاہدات کی جس بری طرح خلاف ورزی کی ہے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے یوں تو تقریباً ہر انگریز جنرل گورنر کا یہی اصول رہا ہے یعنی اس میں سے جس کسی کو بھی موقع ملا اس نے اپنے پیشروؤں کے معاہدات کو ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا لیکن لارڈ ڈلہوزی اس معاملہ میں سب سے آگے تھا اگر اسے بدعہدی اور بدمعاملگی کا مجسمہ قرار دیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔

ڈلہوزی کے دور حکومت میں چونکہ برطانوی حکومت پورے ہندوستان پر چھا چکی تھی اسی لیے اسے ڈاک خانہ محکمہ تعلیم اور انتظامی معاملات میں کچھ نہ کچھ اصلاحات کرنی پڑیں لیکن ان اصلاحات کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں۔ لارڈ ڈلہوزی ہندوستان میں ۱۸۴۸ء سے ۱۸۵۶ تک آٹھ سال رہا اور اس نے کلایو اور ہسٹنگز کے دیرینہ خواب کو سچا کر دکھایا۔

لارڈ کیننگ کا دور حکومت

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ لارڈ ڈلہوزی نے سب سے زیادہ اصلاحات کیں۔ چنانچہ بہت دنوں تک یہ کہاوت مشہور تھی کہ ''موجودہ ہندوستان ڈلہوزی کا بنایا ہوا ہے''۔

ان تمام کے باوجود ڈلہوزی اور اس سے پہلے کے گورنر جنرلوں نے ہندوستانیوں کے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔اور ہندوستانیوں کے دلوں میں اپنے تئیں نفرت وحقارت کی آگ کو بری طرح بھڑکا دیا تھا چنانچہ ہندوستان کا ہر باشندہ چاہے اس کا تعلق کسی بھی مذہب وملت سے ہو اس کے دل میں انگریزوں کے خلاف آگ بھڑکتی تھی۔ ہندوستان کے وہ والیان ریاست جنہوں نے ملک سے غداری کر کے بہت سارے مقامات پر انگریزوں کا ساتھ دیا تھا اپنے کئے پر پشیماں تھے۔غرض انگریزوں نے اپنے ناروا سلوک کے ذریعہ سارے ہندوستانیوں کو اپنے خلاف تیار کرلیا تھا۔

ان حالات میں جب ۱۸۵۶ء میں لارڈ کیننگ کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا تو اس نے اس بات کو بڑی اچھی طرح محسوس کیا کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت وحقارت کا بیج بری طرح پھوٹ چکا ہے۔لارڈ کیننگ کا خیال تھا کہ ہندوستان کے زہریلے عناصر صرف ہماری طاقت وقوت کی وجہ سے دبے ہوئے ہیں۔ان کو جب بھی موقع ملے گا یہ اپنا کام کر جائیں گے۔غرض لارڈ کیننگ ہندوستان کے حالات سے بالکل غیر مطمئن تھا لارڈ کیننگ کے اندیشے درست ثابت ہوئے اسے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھے ہوئے ابھی تھوڑا عرصہ گزرا تھا کہ ہندوستان کی فوج میں بغاوت پیدا ہوگئی۔لارڈ کیننگ کے زمانہ کا سب سے مشہور واقعہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہند ہے جسے ہندوستان کی آزادی کی پہلی جنگ بھی کہا جاتا ہے۔

پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کی بغاوت

تحریک آزادی کا باقاعدہ آغاز ہم ۱۸۵۷ کے انقلاب سے مانتے ہیں اگر چہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے سینکڑوں سال پہلے انگریزوں کے خلاف نفرت وجنگ کا ایک ماحول بن چکا تھا۔ ثبوت کے طور پر ہم ان چھوٹی چھوٹی عوامی عسکری تحریکوں کو پیش کر سکتے ہیں۔جو انیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سالوں کے دوران رونما ہوئیں لیکن باقاعدہ آغاز ۱۸۵۷ء میں ہی ہوا اس لیے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو پہلی جنگ آزادی کا نام دیا گیا۔اگر چہ انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو غدر یعنی انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کا نام دیا تھا۔جب کہ حقیقت

یہ ہے کہ اسی جنگ میں ہزاروں عوام، علماء، دانشور مزدور، کسان غرض ہر طبقہ کے لوگ شریک تھے اور اس جنگ کے شعلے ہندوستان کے چوتھائی حصے پر بھڑک اٹھے تھے۔ لہٰذا اس کو غدر کا نام دینا تاریخ سے مذاق کرنے کے مترادف ہوگا۔

اسباب:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا تفصیلی ذکر سے پہلے ان تمام عوامل واسباب پر ایک نظر ڈالی جائے جن کی وجہ سے یہ عظیم انقلاب برپا ہوا تھا۔ بڑے بڑے بنیادی اسباب مندرجہ ذیل تھے:

عام نفرت

انگریزوں نے اقتدار کے نشے میں چور ہو کر ہندوستانیوں کے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ ہندوستانیوں کو ان کے ملک میں دوسرے درجہ کا شہری تصور کرنے لگے اور انہوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ غیر شریفانہ سلوک اختیار کر کے اپنے خلاف عام نفرت کے جذبات ہندوستانیوں کے دلوں میں پیدا کر دیئے تھے۔

مغل بادشاہ کے ساتھ برا سلوک

مغلیہ حکومت اگر چہ ایک لاشئہ بے جان بن چکی تھی جس کے اختیارات صرف لال قلعہ تک محدود ہو کر رہ گئے تھے لیکن اس جانکنی کے عالم میں بھی ہندوستانی رعایا مغل بادشاہ کو واقعی بادشاہ کا اہل سمجھتی تھی اور مغلیہ حکومت کے خلاف کمپنی کی کامیابی کی خبریں ان کے دل میں تیر بن کر پیوست ہوئی تھیں۔ چنانچہ جب مغل بادشاہ بہادر شاہ کی اولاد کو قلعہ میں رہنے کے حق سے محروم کیا گیا اور بادشاہی کا خطاب چھیننے کا اعلان ہو گیا تھا تو انگریزوں کی اس پالیسی سے مسلم عوام بھی ان سے بہت ناراض ہو گئے۔ بادشاہ سے عوام کو اس لیے بھی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی کہ عوام بادشاہ کو مظلوم اور انگریزوں کا قیدی سمجھتے تھے۔

مختلف ریاستوں کا الحاق

مختلف ریاستوں کو الحاق کرنے کی پالیسی اپنائی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان کا کافی حصہ

انگریزوں کی سلطنت میں شامل کرلیا گیا تھا اس پالیسی کے تحت جو ریاستیں انگریزی حکومت میں شامل کی گئیں وہ کئی طرح کی تھیں ان میں سے بعض ریاستیں ایسی تھیں جو بذریعہ فتوحات شامل کی گئی تھیں جیسے پنجاب کا صوبہ سکھوں کی دوسری جنگ کے نتیجہ میں اس طرح پیگو اور پردم کے علاقے برما کی دوسری جنگ کے نتیجہ میں۔

بعض ریاستیں ایسی تھیں جو مسئلہ الحاق کی رو سے شامل کی گئی تھیں الحاق کا اصول یہ تھا کہ کسی ماتحت ریاست کا راجہ یا نواب بلا اولاد نرینہ کے مرجاتے تو اس کے متبنی کا گدی نشین نہیں کیا جائے گا بلکہ وہ ریاست انگریزی حکومت میں شامل کرلی جائے گی اور متبنی صرف اس حکمران کی ذاتی جائیداد کا مالک ہوگا۔اس الحاق کی رو سے سات ریاستیں انگریزی سلطنت میں ملائی گئیں۔ ان میں ستارا، جھانسی اور ناگپور زیادہ مشہور تھیں اور باقی چار ریاستیں ،جیت پور، سنبھل پور اودے پور،اور بگھاٹ تھیں۔

بعض ریاستوں کو بدنظمی کی وجہ سے انگریزی حکومت میں شامل کرلیا گیا جیسے ۱۸۵۶ء میں ایک اعلان کے ذریعہ اودھ کو بدانتظامی کی بناء پر انگریزی سلطنت میں شامل کرلیا گیا اور نواب اودھ واجد علی شاہ جو حکومت مغلیہ کا وزیراعظم بھی تھا ایک معقول پنشن دے کر کلکتہ بھیج دیا گیا۔

اسی الحاق کی پالیسی کے تحت انگریزوں نے جو غاصبانہ اور توہین آمیز رویہ اختیار کیا اس نے دیسی فرماں رواؤں کو انگریزی حکومت سے بدظن کردیا اور انہیں یہ خدشہ ہوگیا کہ ان کی ریاستیں بھی جلد یا بدیر انگریزی حکومت میں ملا دی جائیں گی۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ایک وجہ مسئلہ الحاق سے پیدا ہونے والی سیاسی بے چینی بھی تھی۔

<u>پادریوں کی سرگرمیاں</u>

عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کے لیے انگریزوں نے جو طریقہ اپنایا وہ بھی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ایک بہت بڑا سبب بنا۔حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی سب کچھ برداشت کرسکتا ہے لیکن اگر اس کے دین ومذہب پر کوئی ڈاکہ زنی کرے گا تو ہرگز اس کو نہیں بخشے گا اس کو کیفر کردار تک پہونچانے کے لیے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کرسکتا ہے لیکن اپنے مذہب وعقیدہ پر کسی

طرح کی آنچ نہیں آنے دے گا۔ چنانچہ جب ہندوستان میں عیسائی پادریوں کی سرگرمیاں حد سے زیادہ بڑھ گئیں اور ہندوستان کے ہندو اور مسلمانوں کو کھلم کھلا عیسائی بنایا جارہا تھا۔انگریزی تعلیم اور پادریوں کی غلط روش سے ہندو اور مسلمان دونوں یہ سمجھنے لگے تھے کہ انگریزوں کی وجہ سے ان کا مذہب خطرہ میں پڑ گیا ہے۔اسی پر انگریز بس نہیں کرتے ہیں بلکہ مذہبی رہنماؤں کو بھی برا بھلا کہتے ہیں۔سرسید احمد خان اپنی مشہور کتاب اسباب بغاوت ہند میں لکھتے ہیں:

''پادری صاحب کے وعظ نے نئی صورت نکالی تھی تکرار مذہب کی کتابیں بطور سوال جواب چھپتی اور تقسیم ہونا شروع ہوئیں۔ان کتابوں میں دوسرے مذہب کے مقدس لوگوں کی نسبت مضامین رنجیدہ درج ہوئے۔ ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا یہ دستور ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں۔جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے پادریوں صاحب کا طریقہ اس کے برخلاف تھا وہ غیر مذہب کے مجمع اور تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے اور کوئی شخص صرف حکام کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا۔پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہونچتی تھی اور ہماری گورنمنٹ سے ناراضی کا بیج لوگوں کے دل میں بویا جاتا تھا''۔(9)

فوجی سپاہیوں میں غم وغصہ

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ایک بہت بڑی وجہ ہندوستانی فوج کی ناراضگی تھی۔حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کا اقتدار انہیں فوجیوں کا رہین منت ہے ہندوستانی سپاہیوں کو انگریزوں کی حمایت میں اپنے ہی ملک والوں کے خلاف لڑنا پڑا تھا۔انہوں نے اپنی بہادری سے ہندوستان انگریزوں کیلیے فتح کر دیا تھا ان تمام کے باوجود ہندوستان فوجیوں کی تنخواہیں بہت قلیل تھیں ان کے مقابلہ میں انگریزی فوجیوں کی تنخواہیں بہت زیادہ تھیں۔ظاہر ہے اس بات پر سپاہیوں کو بڑا غصہ آتا تھا کہ کسی صوبہ کی فتح اور الحاق کے بعد بھتہ ختم کر دیا جاتا تھا اور انہی سپاہیوں کو کم تنخواہیں دے کر ان علاقوں میں رکھا جاتا تھا۔غریب سپاہی کو محض 7 روپئے ماہوار

تنخواہ ملتی تھی جس میں سے وہ ساڑھے تین روپئے کھانے پر صرف کر دیتا تھا اور دو سے ڈھائی روپئے تک زندگی کی دوسری ضروریات پر خرچ کرتا تھا اور بڑی مشکل سے ایک روپیہ یا ڈیڑھ روپیہ بچا تا تھا۔

ہندوستانی سپاہیوں کے دل اس بات سے بہت زخمی تھے کہ ان ہی کے ملک کے روپئے سے انگریز سپاہیوں کو دس گنی تنخواہیں دی جاتی تھیں اور ان کے آرام وآسائش کے لیے بڑے پیمانے پر خوب سے خوب تر انتظامات کئے جاتے تھے۔مگر ہندوستانی سپاہیوں کو خون بہانے کے بدلے میں روٹی تک بھی میسر نہیں ہوتی تھی۔

فوجی سپاہیوں کا عوام سے کہیں زیادہ ہندوستان کے والیان ملک سے تعلق اور رابطہ تھا۔ اول تو انگریزوں کے ہاتھوں ان والیانِ ملک کی تذلیل کی وجہ سے انگریزوں سے فوج ناراض تھی دوسری طرف خود ان فوجی سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں کا سلوک نہایت ہی ذلت آمیز تھا چنانچہ ویلور کے احتجاج کی بناء پر انگریزوں نے ان کو گولیوں سے اڑا دیا تھا۔لارڈ کیننگ کے عہد میں ایک ایکٹ پاس ہوا جسے عام بھرتی قانون کہتے تھے جس کی رو سے ہندوستانی سپاہی باہر جانے کے لیے مجبور کئے جاتے تھے لیکن برہمن سپاہی کو سمندر پار کرنا اپنے دین ومذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔اس لیے یہ لوگ بہت ناراض تھے۔

فوجی وجوہ

گذشتہ صفحات میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی متعدد وجوہات کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ انقلاب کیوں پیش آیا وہ تمام اسباب تو تھے ہی لیکن وقتی طور پر ایک اہم وجہ ہوئی اور وہ ہے چربی لگے ہوئے کارتوس اس کی تفصیل یہ ہے کہ ان دنوں سپاہیوں کو نئے رائفل دیئے گئے تھے جن میں چربی 219 کارتوس استعمال ہوتے تھے اس پر طرفہ یہ کہ کارتوسوں کو رائفل پر چڑھانے سے پیشتر منھ سے کاٹنا پڑتا تھا اور ہر فوجی پر کارتوس منھ سے کھولنا ضروری قرار دیا گیا۔ اس وجہ سے انگریزی فوج کے دیسی سپاہیوں میں سخت بد دلی پیدا ہوئی بس پھر کیا تھا کئی ایک چھاؤنی میں بغاوت پھوٹ پڑی۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کا آغاز

سب سے پہلے انقلاب کی چنگاریاں برہام پور کلکتہ کے مضافات دم دم، بارک پور، اور بہرام پور میں نمودار ہوئیں جہاں ہندوستانی سپاہیوں نے دین دین کا نعرہ لگا کر انگریزوں کی مذہب مخالف پالیسی پر سخت احتجاج کیا مگر انگریزوں نے طاقت کے نشہ میں چور ہو کر احتجاج پر سنجیدہ موقف اپنانے کے بجائے بزور تشدد اس تحریک کو دبانا چاہا چنانچہ احتجاجی سپاہیوں کے لیڈر منگل پانڈے اور اس کے ایک ساتھی کو اپریل ۱۸۵۷ء میں پھانسی دے دی گئی۔ برہام پور کی رجمنٹ ۱۹ اور بارک پوری کی رجمنٹ ۳۴ کے سپاہیوں سے ہتھیار لے کر انہیں برخواست کر دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً ساری فوجی چھاؤنیوں میں آگ سی لگ گئی اور کارتوس کے استعمال سے انکار کے بے شمار واقعات ہونے لگے۔ لیکن ہندوستان جنگ گیر جس جنگ کا پلان بنایا گیا تھا وہ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اس جنگ کا آغاز ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے میرٹھ کے مقام سے مانا جاتا ہے ۶ رمئی کو میرٹھ کی فوجی چھاؤنی کے سپاہیوں نے چربی والے کارتوس کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا۔ اس جرم میں ۸۵ سپاہیوں کو کورٹ مارشل کیا گیا اور ۹ مئی ۱۸۵۷ء کو انہیں دس سال کی قید سنائی گئی۔ چنانچہ اسی پچاسی محبان وطن کو بدترین مجرم قرار دیا گیا ان کے خطابات چھین لیے گئے، وردیاں پھاڑ دی گئیں اور بیڑیوں میں جکڑ کر شہر میں گشت کراتے ہوئے جیل خانہ میں پہونچا دیا گیا۔ اس طرح ذلیل کر کے ان کو جیل بھیجا گیا اس وقت کا منظر بڑا ہی حسرتناک اور اشتعال انگریز تھا سارے ہندوستانی سپاہی چپ چاپ یہ تماشا دیکھتے اور پیچ وتاب کھاتے رہے کیوں کہ ہندوستانی سپاہی انگریز سپاہیوں کی سنگینیوں کے گھیرے میں تھے اور سامنے توپ خانہ تھا لیکن اسی وقت ان فداکاروں کے ساتھی سپاہیوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب خاموش رہنے کا وقت نہیں ہے بلکہ ملکی غیرت وحمیت کے امتحان کا وقت آ گیا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو شام ہوتے ہوتے اچانک علم بغاوت بلند کر دیا۔ بیرکیں جلا دی گئیں۔ ذرا سی دیر میں بے شمار سفید رنگ کے سولی اور فوجی افسر اور ان کے متعلقین قتل کر دیئے گئے اس کے بعد انقلاب پسند اسی جیل کی طرف بڑھے جہاں پچاسی محبان وطن قید تھے۔ جیل کے دروازے توڑ دیئے گئے نہ صرف

اپنے جانباز پچاسی ساتھیوں کو رہائی دلائی بلکہ آٹھ سو قیدیوں کو بھی جیل کی سختیوں سے آزاد کرالیا ۔راتوں رات یہ جانبازوں کی جماعت اپنے ہتھیاروں سمیت یا پیادہ سفر کرتے ہوئے ''دہلی چلو'' دہلی چلو'' کا نعرہ لگاتے ہوئے دہلی کی جانب بڑھے۔ان جانباز سپاہیوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں عوام بھی اس جنگ آزادی میں شامل ہوگئے ۔ یہ لوگ ۱۱رمئی کی صبح پو پھٹتے ہی دار السلطنت دہلی کے دروازے پر پہونچ گئے اور راستہ کی چوکیوں کو آگ لگاتے ہوئے بلا کسی مزاحمت کے لال قلعہ میں داخل ہوکر مغلیہ حکومت کے آخری فرماں روا، بہادر شاہ کے حضور میں، پہونچ گئے اس لیے کہ عام ہندوستانی رعایا کے جذبات کا خیال کرتے ہوئے اس وقت بہادر شاہ ظفر سے زیادہ کوئی ایسی موزوں شخصیت نہ تھی جسے اس تحریک کا قائد اور سپہ سالار بنایا جاتا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے طوفان خیز مرکز دہلی، کانپور، لکھنو اور وسط ہند تھے۔دہلی میرٹھ کے انقلاب پسند ۱۱رمئی ۱۸۵۷ء کی صبح دہلی پہونچ گئے ۔ دہلی کے سفید فام افسروں نے دیسی سپاہیوں کو ان پر گولی چلانے کا حکم دیا تو ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے بھائیوں کو خاک وخون میں تڑپانے سے انکار کردیا ۔غرضیکہ دہلی میں بھی انقلابی ہنگامہ برپا ہوگیا۔ ریزیڈینٹ قتل ہوا ۔کپتان ڈگلس مارا گیا، بنک لوٹ لیا گیا گرجا گھر کو آگ لگادی گئی اور کمپنی کی حکومت کے بجائے مغل بادشاہ کے انکار کے باوجود بہادر شاہ کی بادشاہی کا اعلان کردیا گیا۔چاروں طرف سے انگریز فوجیں اس انقلابی تحریک کو کچلنے کے لیے دوڑ پڑیں۔لیکن انقلاب پسندوں نے ان کو پسپا کردیا خوب گھمسان کی لڑائی ٹھن گئی ۔ابتدا میں فوج کی قیادت مغل شہزادے کررہے تھے لیکن جولائی کے شروع میں جب بخت خاں بریلی سے دہلی آگئے تو اعلیٰ کمان ان کے سپرد کردی گئی لیکن یہ لڑائی دو غیر مساوی فریقین کی لڑائی تھی ایک طرف ایک منظّم طاقت تھی جس کے وسائل روز بروز بڑھ رہے تھے دوسری طرف وہ فوج تھی جو شہر کے حدود میں محصور تھی ۔جس کے پاس سپاہی اور افسر نا تجربہ کار تھے اور جنگی وسائل دن بہ دن کم ہوتے جارہے تھے ان تمام دشواریوں کے باوجود دہلی نے سخت مقابلہ کیا اور محاصرہ کرنے والی فوج نے بار بار حملے کئے ایک وقت تو دہلی والوں نے خود محاصرہ کرنے والوں کو محصور کرلیا تھا لیکن پنجاب سے آنے والی کمک نے پانسہ پلٹ دیا

اور دہلی کو اطاعت قبول کرنی پڑی ۱۳؎

کانپور

دہلی کے بعد کانپور میں بھی محبان وطن میدان میں آ گئے انقلابیوں کی رہنمائی آخری پیشوا کا نانا صاحب کررہا تھا۔ انگریزوں نے کچھ دنوں تک اس کا مقابلہ کیا مگر آخر میں اپنے آپ کو اس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ یہاں بھی سرکاری عمارت کو آگ لگا دی گئی۔ تار کاٹ دیئے گئے فوجی اور سول افسر چن چن کر قتل کر دیئے گئے انگریزوں کا باقاعدہ طور پر قتل عام شروع ہو گیا تھا۔

لکھنو

لکھنو میں انقلاب پسندوں کی لیڈر نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل تھیں دیسی فوجیوں نے انگریزوں سے انتقام لینا شروع کیا جہاں اور جس جگہ کوئی انگریز ملا اسے قتل کر دیا گیا۔

وسط ہند

وسط ہند اور بندیل کھنڈ میں انقلاب پسندوں کی لیڈر جھانسی کی رانی اور نانا صاحب کی فوجوں کا سپہ سالار تانتا ٹوپی تھا۔

جھانسی کی نوعمر رانی رانی لکشمی بائی ۱۸۵۷ کے عظیم ترین رہنماؤں میں سے ایک تھیں۔ یہ نو عمر رانی، ہندوستان کی عظیم ترین ہستیوں میں سے ایک ہیں جب انگریزوں نے انہیں جھانسی کے تخت کے لیے ایک بیٹا گود لینے کے حق سے محروم کر دیا ان کی ریاست کا الحاق کیا اور انہیں جھانسی کے سپاہیوں میں بغاوت کی آگ بھڑکانے کے الزام میں سزا دینے کی دھمکی دی تو وہ انقلابیوں کی صفتوں میں شامل ہوگئیں۔ رانی لکشمی بائی ایک بہادر سپاہی کی طرح بے جگری سے لڑتے ہوئے میدان جنگ میں ماری گئیں اور اپنا نام ہمیشہ کے لیے امر کر گئیں۔ تانتا ٹوپی شکست کھا کر بھاگ گیا مگر آخر کار پکڑا گیا اور اسے پھانسی دی گئی۔ اسی طرح یہ دونوں محبان وطن انگریزوں سے لڑتے ہوئے وطن پر قربان ہو گئے۔

انقلاب پسندوں کو ناکامی:

انقلاب ۱۸۵۷ء میں انقلابیوں کو جو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اس کے بہت سارے اسباب

ہیں ان میں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انقلاب کو شروع کرنے کی تاریخ ۳۰ مئی ۱۸۵۷ء مقرر کی گئی تھی لیکن یہ انقلاب اپنی مقرر تاریخ سے پہلے ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو ہی شروع ہوگیا۔ اس لیے اس انقلاب میں انقلابی پوری تیاری کے ساتھ شریک نہ ہو سکے۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے اس انقلاب میں ہندوستان کے بہت سے عوام شریک تھے اور اس کی آگ ملک میں دور دور تک پھیل گئی تھی اس کے باوجود ملک کے ہر گوشے میں اس کے شعلے نہیں پہونچے ہندوستانی سماج کا ہر طبقہ اور گروہ اس پرچم تلے نہیں آیا۔

یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی انقلابی تحریک اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ جب عوام بھی اس میں پوری طرح سے شامل ہو جائیں لیکن ہندوسان کی وہ عوام جس کی بہادری اور جرأت کو انگریزوں نے ایک صدی کے عرصہ میں کچل کر رکھ دیا تھا جو بظاہر زبان سے انگریزوں کی مخالفت کرتے تھے لیکن عملی طور پر ان سے مقابلے کرنے کے لیے آنے سے ڈرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے اس انقلابی تحریک میں شامل ہونے کی کیا امید کی جاسکتی ہے چنانچہ عوام کا ایک بہت بڑا طبقہ چھپے ہوئے اپنے گھروں میں بیٹھا رہا صرف چند ہزار سپاہی اور چند ہزار محبان وطن جان کی بازی لگاتے رہے۔

ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ جہاں ہزاروں افراد نے آزادی وطن کی خاطر اپنی جانوں کی قربانی دی وہیں ایسے سینکڑوں غدار بھی پیدا ہوئے جو دولت واقتدار کی ہوس میں دشمنوں سے ساز باز کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ ان میں سے اکثر نے اس انقلاب کو ختم کرنے کے لیے انگریزوں کی مدد بھی کی ملک کے ان غداروں میں گوالیا کے سندھیا، اندور کے ہوکسر، جودھپور کے راجہ، اکثر راجپوت اور حیدرآباد دکن کے افضل الدولہ اور ان کے وزیر سالار جنگ وغیرہ اگر یہ لوگ غداری نہیں کرتے تو کمپنی بہادر کی حکومت ۱۸۵۷ء میں ہی ختم ہو جاتی۔

انقلاب پسندوں کی ناکام ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہ انقلاب ایک اچھی طرح سوچی ہوئی اسکیم نہیں تھی ہر حصے میں الگ الگ لیڈر تھے۔ کوئی ایسا لیڈر نہیں تھا جسے سب لوگ چاہتے ہوں۔ مسلمان مغل سلطنت کو اور ہندو مرہٹہ سلطنت کو قائم کرنا چاہتے تھے۔

ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انقلاب پسندوں کے پاس نہ تو لڑائی کا کافی سامان تھا اور نہ ان میں انگریزوں جیسا ڈسپلن تھا۔

غرض ان مختلف اسباب وعوامل کے باعث انقلاب پسندوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا اور انگریزی فوج نے اگست ۱۸۵۷ء کے اواخر میں دلی کا شدید محاصرہ کرلیا اور پھر پندرہ ستمبر ۱۸۵۷ء سے لال قلعہ پر قبضہ کے لیے پیش قدمی شروع کردی اور راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کرتے ہوئے اور ہزاروں محبان وطن کی لاشوں کو پار کرتے ہوئے ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لال قلعہ پر باقاعدہ قبضہ کرلیا اور قلعہ پر سے مغلیہ حکومت کا جھنڈا اتار کر برطانوی یونین چیک لہرایا گیا۔

انگریزوں کے مظالم:

۱۸۵۷ء کی آزادی کا انتقام لینے کے لیے انگریزوں نے مسلمانوں اور دیگر برادران وطن کے ساتھ جو سلوک کیا شاید ہی دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر ملے۔

۱۸۵۷ء کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک انگریز لکھتا ہے کہ:

''ہم نے بڑے بڑے گاؤں میں آگ لگا دی جب گاؤں کے باشندے آگ سے بچنے کے لیے بھاگے تو تو ہم نے انہیں گولیوں سے اڑا دیا۔ غرضیکہ گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیئے گئے (10)۔

دہلی کو فتح کرنے کے لیے انگریزوں نے نہایت بے دردی کے ساتھ ہزاروں جانبازوں کو تہ تیغ کیا اور پوری دلی کو لوٹ مار کر کے کھنڈر میں تبدیل کر دیا۔ طفیل احمد منگولوی نے خواجہ حسن نظامی صاحب کی کتاب بہادر شاہ کا مقدمہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

''ہزاروں عورتیں خوف سے کنویں میں گر پڑیں۔ یہاں تک کہ پانی سے اوپر ہوگئیں۔ جب زندہ عورتوں کو کنویں سے نکالنا چاہا تو انہوں نے کہا ہمیں گولی سے مار دو، نکالو نہیں ہم شریفوں کی بہو بیٹیاں ہیں۔ ہماری عزت خراب نہ کرو۔ بعض عورتوں نے خودکشی کر لی''۔(11)

انگریزوں نے پورے دلی میں ہر طرف تباہی و بربادی کے ایسے مناظر برپا کر دیئے تھے کہ جن کو یاد کر کے آج بھی ہمارے بدن پر کپکپی طاری ہوجاتی ہے۔ انگریزوں نے اپنی اس

انتقامی کارروائی میں خاص طور سے مسلمانوں کونشانہ بنایا۔اس لیے کہ مسلمان جوشیلی طبعیت کے مالک ہونے کی وجہ سے ہرمحاذ پر آگے آگے تھے۔انگریزوں نے خاص طور سے مسلمانوں کے ساتھ کیا۔مشہورمورخ مولا اسیرادروی لکھتے ہیں:

''تحریک کی ناکامی کے بعد انگریزوں نے انتقامی کارروائیوں کا آغاز کیا اوراسی کے نتیجہ میں مسلمان خصوصیت کے ساتھ انتہائی طور پر کچل دیا گیا۔دہلی کا چاندنی چوک ہی نہیں بلکہ شہر کے ہر چوراہے پرسولیاں نصب کردی گئیں دہلی اوردہلی کے باہر درختوں کی شاخیں سے پھانسی کے پھندے لٹک رہے تھے جوبھی معزز مسلمان انگریزوں کے ہاتھ چڑھ گیا اسے ہاتھی پر بٹھایا ۔درخت کے نیچے لیے گئے پھندا اس کی گردن میں ڈال کر ہاتھی کوآگے بڑھا دیا۔لاش پھندے میں جھول گئی۔آنکھیں ابل پڑیں۔زبان منھ سے باہرنکل آئی۔ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح جانکنی کا وہ بہت نازک منظر کہ الامان،الحفیظ،ایک انگریزعورت نے اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ بسا اوقات ان پھانسیوں پرلٹکائے جانے والوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر انگریزی ہند سے کالی بن جاتی تھیں''۔(12)

انگریز ہندوستان کے حسین شہر میں بھی داخل ہواوہاں پرانہوں نے ہندوستانیوں کے خون سے ہولی کھیلی۔انہوں نے عوام کاقتل عام برپا کیا۔انگریزوں کی ظلم وبربریت کا اس سے بڑااور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جب نانا صاحب انگریزوں کے ہاتھوں نہ آسکا توانگریزوں نے نانا صاحب کی لڑکی کو پکڑ کر زندہ جلا دیا۔مختصر یہ کہ انگریزوں نے جی کھول کر ہندوستانیوں سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا انتقام لیا ۔نہ جوانوں کوچھوڑا نہ بوڑھوں کواور نہ عورتوں کوبخشا۔نہ بچوں کو جوبھی ان کے سامنے آیا اسے گولی کا نشانہ بنادیا گیا۔صرف اس جرم میں کہ ہندوستانی انگریزوں کے ظلم وستم سے نجات چاہتے تھے۔

حوالہ جات.

باب اول

(1) ڈاکٹر جمیل احمد جالبی، تاریخ ادب اردو۔ جلد دوم، حصہ اول، ص ا

(2) تاراچند، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، تاریخ تحریک آزادی ہند، صفحہ ۶۷۔

(3) سید ابوظفر ندوی، مختصر تاریخ ہند، ص، ۱۷۵

(4) محمد الیاس ندوی، تاریخ ہند۔ ص ۹۴

(5) ڈاکٹر تاراچند، مترجم قاضی عدیل عباسی، تاریخ تحریک آزادی ہند، ص ۳۲۰

(6) ڈاکٹر تاراچند، مترجم قاضی محمد عدیل عباسی، تاریخ تحریک آزاد ہند، ص۔ ۳۲۰

(7) مفتی شوکت علی فہمی' انگریزوں کا شرمناک دور حکومت' ص ۵۹

(8) ڈاکٹر تاراچند۔ تاریخ تحریک آزادی ہند، حصہ دوم ص ۳۲۴

(9) سر سید احمد خان، اسباب بغاوت ہند، ص ۸۶

(10) مفتی شوکت علی فہمی، ہندوستان پر انگریز کا شرمناک دور حکومت، ص ۱۵۸

(11)۔ طفیل احمد منگلوی، مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۹۴

(12) اسیر ادروی، تحریک آزادی اور مسلمان، ص ۳۳)

☆☆☆

باب دوم
۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک
ہندوستان کا پس منظر

باب دوم.....۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہندوستان کا پس منظر

سیاسی پس منظر:

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کا سیاسی پس منظر ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد سے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔آزادی کی اس پہلی کوشش کو اگرچہ ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا لیکن اس کے اثرات لاکھوں دلوں پر مرتب ہو چکے تھے' چنانچہ 19 ویں صدی کے دوسرے نصف میں ہندوستان میں قومی سیاسی شعور پوری طرح بیدار ہو گیا تھا اور ایک منظّم قومی تحریک نے بھرپور ترقی کی۔ لاکھوں ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک تڑپ پیدا ہو چکی تھی' دسمبر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا وجود سامنے آیا جس کے جھنڈے تلے ہندوستانیوں نے غیر ملکی اقتدار سے آزادی حاصل کرنے کے لیے بہادرانہ اور طویل جدوجہد کی جس کے نتیجہ میں ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان آزاد ہوا۔

ملکہ وکٹوریہ کا اعلان:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کو اگرچہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا' لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ یہ حادثہ لندن پارلیمنٹ کو ایک طرح سے ہلا کر رکھ دیا اور وہ لوگ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ آئندہ ہندوستان میں اپنی حکومت کس طرح باقی رکھی جائے گی۔اس مسئلہ پر بہت زیادہ غور وخوص کرنے کے بعد آخر یہ طے پایا کہ ہندوستان پر کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا جائے اور ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ اور پارلیمنٹ کے ماتحت ہو جائے۔لہذا اس مقصد کے پیش نظر لندن پارلیمنٹ نے اگست ۱۸۵۸ء کو ایک قانون پاس کیا جس کی رو سے کمپنی کی حکومت ختم کر کے وزیر ہند کا عہدہ قائم کر دیا گیا۔اس کی مدد کے لیے ۱۵ ممبروں کی ایک کونسل بنا دی گئی

جس کا نام ''انڈیا کونسل'' رکھا گیا۔ وزیر ہند اور انڈیا کونسل کے ممبران کو تنخواہیں اور بھتے ہندوستانی خزانے سے دیئے جانے لگے۔ گورنر جنرل کو ''وائسرائے'' کا خطاب دیا گیا اور اس کا تقرر بادشاہ کی منظوری سے کیا جانے لگا۔ ہندوستان کا پہلا وائسرائے لارڈ کیننگ ہی تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر تاج برطانیہ کے ماتحت ہوئی تو ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کیلیے نہایت ہی اہم اعلان کیا جو یکم نومبر ۱۸۵۸ء کو الہ آباد میں پڑھ کر سنایا گیا۔ اس اعلان کی مشہور باتیں مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) آئندہ دیسی ریاستیں انگریزی علاقہ میں شامل نہیں کی جائیں گی اور والیان ریاست کو متبنیٰ بنانیکا حق ہوگا۔

(۲) تمام رعایا کو یقین دلایا گیا کہ ان کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی اور سب کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی پوری پوری آزادی ہوگی۔

(۳) یہ بھی اعلان کیا گیا کہ کوئی ہندوستانی محض اپنے رنگ و مذہب کی وجہ سے کسی ایسے عہدے سے محروم نہیں کیا جائے گا جس کے فرائض کو انجام دینے کی وہ خاطر خواہ قابلیت رکھتا ہو۔

(۴) اس بات کا بھی اعلان کیا گیا کہ تمام باغیوں کو جنہوں نے انگریزوں کے قتل میں حصہ نہیں لیا معاف کر دیا جائے گا۔

(۵) ہندوستانی حکمرانوں کو یقین دلایا گیا کہ ان تمام عہدناموں کا جو انہوں نے کمپنی سے کر لیے تھے پورا پورا احترام کرے گی۔

(۶) پر وعدہ بھی کیا گیا کہ ہندوستان کی مالی، تجارتی اور صنعتی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔

ملکہ وکٹوریہ کے عام معافی کے اعلان کے بعد ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس ہندوستان میں بسنے والی اقوام کے ساتھ یکساں سلوک کیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انگریزوں نے مسلمانوں کو

خاص طور پر اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنایا۔اس لیے کہ انہیں یقین تھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں پر ہی عائد ہوتی ہے۔مسلمانوں نے ہی غیر مسلموں کو اس جنگ میں شریک ہونے کے لیے آمادہ کیا تھا حالانکہ ایسا نہیں تھا سارا ہندوستان بلا امتیاز مذہب وملت انگریزوں سے متنفر تھا۔ہاں اتنا ضرور تھا کہ اقتدار مسلمانوں سے چھینا گیا تھا اس لیے یہ لوگ اس جنگ میں دوسروں کے مقابلہ میں پیش پیش تھے۔اور بہت زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

جہاں ایک طرح مسلمانوں پر ظلم وستم کی یلغار ہورہی تھی وہیں دوسری طرف دیگر اقوام کے ساتھ ہمدردی اور دلداری کا معاملہ کیا جارہا تھا اور یہ سب دیگر اقوام کی محبت میں نہیں ہورہا ہے بلکہ اس لیے ہورہا تھا کہ دیگر اقوام حکمراں کی حیثیت سے نہیں تھیں اور انگریزوں کو ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔انگریز تو ان کے ساتھ اچھا سلوک اس لیے کررہے تھے کہ ان کو لے کر مستقبل میں مسلمانوں کو تباہ وبرباد کیا جائے۔چنانچہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کو بڑی بے دردی کے ساتھ ذبح کیا گیا۔ان کو پھانسیوں پر لٹکایا گیا۔ان کے گھروں کو لوٹا گیا۔مسلمانوں کی جائیدادوں اور جاگیروں پر قبضہ کرلیا گیا۔انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جو ایک ظالم قوم مجبور وبے بس لوگوں کے ساتھ کرتی ہے۔ان تمام کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۸۵۸ء سے لے کر انیسویں صدی کے آخری لمحات تک مسلمان تن تنہا جنگ آزادی کے میدان میں انگریزوں سے لڑتا ہے۔

سیاسی بیداری کی لہر:

انیسویں صدی کے ابتدائی ایام میں اختلافات وتنازعات ضرور تھے؛ جس کے باعث قومی بیداری کے جذبہ میں کمی پائی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ ایسے حالات بنے کہ تمام ہندوستانیوں میں حب الوطنی کا جذبہ بڑھنے لگا۔اور یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ ہندوستان قوم پروری کافی مضبوط ہوچکی ہے اور اب وہ ہندوستان کے سیاسی منظر نامہ پر ایک اہم طاقت بن چکی ہے۔چنانچہ انیسویں صدی کے آخری حصہ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی جس نے آگے چل کر ہندوستان کی آزادی میں کلیدی رول ادا کیا اور اس کی بے پناہ قربانیوں کے نتیجہ میں

ملک کو آزادی نصیب ہوئی۔

کانگریس کا قیام:

کانگریس کے قیام سے کچھ پہلے ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف تنظیمیں کسی نہ کسی اعتبار سے تحریک آزادی سے جڑی ہوئی تھیں۔ عام گیان سبھا ۱۸۳۸ء میں قائم ہوئی۔ اس میں سماجی اور مذہبی معاملات کے علاوہ سیاسی غور وفکر بھی ہوتی تھی۔ ۱۸۴۲ء میں ''برٹش انیا سوسائٹی'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم کا اصل مقصد عدم تشدد کے طریقوں کو اپناتے ہوئے سبھی طبقوں کے حقوق اور ملکی مفاد کے لیے کام کرنا تھا۔ ان کے علاوہ زمین دار سبھا' برٹش انڈین اسوسی ایشن' مدراس اسوسی ایشن وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ لیکن اب تک کوئی ایسی انجمن یا تنظیم نہیں بن سکی تھی جو قومی کردار کی حامل ہو۔ اور پورے ملک کے لوگ اس سے وابستہ ہوں۔ حالانکہ کئی ہندوستانی رہنماؤں نے اس سلسلہ میں کوششیں بھی کیں۔ ان حالات میں ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم کے قیام کا سہرا ایک پنشن یافتہ انگریز سول سرونٹ اے او ہوم کے سر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کے مسائل اسی وقت حل ہو سکتے ہیں جب وہ سیاسی طور پر متحد ہوں۔ اس کا پہلا اجلاس ۲۸ سے ۳۰ دسمبر تک بمبئی میں بنگال کے ایک مشہور بیرسٹر ڈبلیو سی بنرجی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں ملک بھر سے ۷۲ مندوبین اکٹھا ہوئے۔ اس طرح ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں آیا جو آنے والے دنوں میں ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں قیادت کرنے والی تھی۔ شروع شروع میں کانگریس کے مطالبات یہ تھے۔ مجالس قانون ساز میں توسیع کی جائے اور اس میں ہندوستانی زیادہ سے زیادہ لیے جائیں۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ ملازمت میں زیادہ سے زیادہ موقع دیا جائے۔ قومی اخراجات کو کم کیا جائے۔ پریس کی آزادی حاصل ہو۔ سیول سرویسیس کے امتحانات برطانیہ کے ساتھ ہندوستان میں بھی منعقد ہوں وغیرہ وغیرہ۔ اس وقت انگریزی حکومت کا رویہ بھی کانگریس کی طرف ہمدردانہ تھا۔ کانگریس کا دوسرا اجلاس ۱۸۸۶ء میں برطانوی حکومت کی راجدھانی کلکتہ میں ہوا اور اس اجلاس کی صدارت دادا بھائی نوروزی نے کی اس اجلاس میں ۴۳۴ مندوبین

شریک ہوئے۔ تیسرا اجلاس ۱۸۸۷ء میں مدراس میں ہوا اور اس کی صدارت بدرالدین طیب جی نے کی۔ چوتھا اجلاس ۱۸۸۸ء میں الٰہ آباد میں ہوا اور اس کی صدارت کے فرائض جارج یول نامی ایک عیسائی نے کی۔ غرضیکہ ہر سال دسمبر میں اس کانگریس کا جلسہ ہندوستان کے کسی بڑے شہر میں ہوتا رہا ہے اور مختلف فرقوں کے رہنما اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کانگریس کا اکیس سالہ دور اعتدال پسندوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس دور میں انڈین نیشنل کانگریس کی باگ ڈور نرم مزاج لیڈروں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان لیڈروں میں دادا بھائی نوروز جی' سریندر ناتھ بنرجی' فیروز شاہ مہتا' گوپال کرشن گوکھلے' رانا ڈے راس بہادر گھوس وغیرہ اہم تھے۔ یہ تمام لیڈر اس سوچ کے تھے کہ اپنا مقصد قانونی اور پرامن طریقے سے حاصل کیا جانا چاہئے۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت ہندوستانیوں کی ضرورتوں سے واقف نہیں ہے۔ اس لیے کانگریس کو چاہئے کہ وہ اپنے مطالبات کو ایسی شکل میں پیش کرے کہ حکومت ان سے واقف ہو کر ان کے تکمیل کی کوشش کرے۔ اس سلسلہ میں دادا بھائی نوروزی نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصہ انگلستان میں گزارا اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ وہاں کے عوام وخواص کو ہندوستان کے مسائل سے واقف کرانے میں صرف کیا۔ اگرچہ اعتدال پسند رہنما ہر سال کانگریس کے اجلاس میں اپنے مطالبات کو دہراتے رہے لیکن اولین اکیس برسوں تک حکومت نے ان پر توجہ نہیں دی۔ تاہم ان کے برابر مطالبات کی وجہ سے حکومت ۱۸۹۲ء کے ''انڈین کونسلز ایکٹ'' پاس کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس کی مشہور دفعات یہ تھیں۔

(۱) مرکزی صوبجاتی قانون ساز کونسلوں میں غیر سرکاری ممبروں کی تعداد پہلے سے بڑھا دی گئی لیکن سرکاری ممبروں کی تعداد غیر سرکاری ممبروں سے زیادہ رہی۔

(۲) قانون ساز کونسلوں کے ممبروں کو سالانہ بجٹ پر بحث کرنے اور سوال پوچھنے کا حق دیا گیا وغیرہ۔

لیکن اعتدال پسند اس سے مطمئن نہیں ہوئے۔ کانگریس کے ذریعہ مختلف فرقوں کے

درمیان جو اتحاد بیدار کرنے کی کوشش جاری تھی اس کو نقصان پہونچانے کے لیے حکومت نے ''تقسیم کرو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کو اپنایا اور اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید احمد خاں اور راجا شیو پرشاد جیسی شخصیتوں کو کانگریس کی مخالفت کرنے کے لیے چنا۔ کرزن نے ۱۹۰۴ء میں یونیورسٹی ایکٹ پاس کر کے یونیورسٹی کی حیثیت پر پروار کیا۔ ہندوستانیوں کو کاذب کے نام سے موسوم کیا۔

حکومت کی ان کانگریس مخالف اور ہند دشمن پالیسیوں نے کانگریس میں اعتدال پسندوں کو غور و فکر کرنے پر مجبور کیا اور ان کے انداز فکر میں تبدیلی پیدا کی اور ملک میں ایک نئی قیادت وجود میں آئی۔ جسے انتہا پسند کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ان انتہا پسندوں میں مہاراشٹر کی سرزمین سے بال گنگا دھر تلک' بنگال سے اربندو گھوش' پین چند پال اور پنجاب سے لالہ لاجپت رائے شامل تھے۔ ان لوگوں نے انگریزوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کیا اور ہندوستانیوں کو اس بات کا یقین دلایا کہ ہندوستان آپ کا ملک ہے' انگریزوں نے زبردستی اس پر قبضہ جما رکھا ہے اور آپ لوگوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ اب صرف قراردادوں' اپیلوں سے کام نہیں چلنے والا ہے۔ بلکہ اس سے اوپر اٹھ کر احتجاجی تحریک کے ذریعہ اپنے ملک کو انگریزوں کے قبضہ سے نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس گروپ کے ایک اہم لیڈر جن کو تاریخ میں تلک کے نام سے جانا جاتا ہے انہوں نے باضابطہ اس بات کا اعلان کیا کہ سوراج پر میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔ انتہا پسندوں کے نزدیک اپنے حقوق کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانا جائز تھا۔ اور آزادی جیسی نعمت حاصل کرنے کے لیے تشدد کا راستہ اپنانے سے بھی ان کو پرہیز نہیں تھا۔ اعتدال پسندوں نے اپنی تحریک سے عام آدمی کو جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ اعتدال پسندوں کے ایک اہم لیڈر گوپال کرشن گھوکھلے کا خیال تھا کہ ''ہندوستان کی بہت بڑی آبادی بے پروا' منقسم' غریب اور جاہل ہے' اس سوچ کے برعکس انتہا پسند لیڈروں نے عام آدمی کو اپنی تحریک سے جوڑنے کا کام کیا اور تشدد کے راستے کو بھی جائز قرار دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اپنا حق مانگنے سے ملنے والا نہیں ہے بلکہ اپنا حق چھین کر لینا چاہئے۔ ۱۹۰۵ء تک یہ

واضح ہوگیا کہ حکومت صرف پرامن مظاہروں پر دھیان دینے والی نہیں ہے اور کسی بھی تحریک کو کامیاب ہونے کے لیے اس میں عام آدمی کی شمولیت ضروری ہے۔ اس طرح اعتدال پسند لیڈروں کی ناکامی اور حکومت کی بے اعتنائی کو دیکھتے ہوئے پرتشدد قیادت نے ضمانت لیا اور اعتدال پسند لیڈروں کے دور کا خاتمہ ہوگیا۔

سودیسی تحریک:

بیسویں صدی کی ابتداء ہوئی تو سیاسی بیداری کی ایک لہر ساتھ ساتھ آئی' آزادی کی ہر طرف چرچے ہونے لگے اور کئی سمتوں سے کام شروع ہوگیا۔ اسی ماحول میں سودیشی تحریک کا آغاز ہوا' اس تحریک نے لوگوں کے اندر ایک نئی امنگ پیدا کی۔ اس سے حب الوطنی کے جذبہ کو ایک نئی زندگی ملی۔ لارڈ کرزن جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا' اس نے ہندوستانیوں پر بہت مظالم ڈھائے اس کے مظالم کی ایک طویل داستان ہے۔ دراصل اسی کی پالیسیوں نے کانگریس کی مخالفت کر کے اعتدال پسندوں کو بھی برگشتہ کر دیا۔

کرزن نے کبھی ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں کیا بلکہ انہیں علی الاعلان فریبی اور جھوٹا قرار دیا۔ کرزن نے انتظامی مصلحتوں کے لیے یا سیاسی اغراض کی خاطر ۱۹۰۵ء میں بنگال کو تقسیم کر دیا۔ یہ اس کے دور کا سیاہ ترین کارنامہ تھا۔ چنانچہ مشرقی بنگال اور آسام کو ملا کر مشرقی بنگال کے نام سے ایک مستقل صوبہ بنا دیا گیا اور اس کا صدر مقام ڈھاکہ کو بنا دیا گیا۔ اور بقیہ حصہ کو مغربی بنگال کے نام سے ایک صوبہ بنا دیا گیا۔ اس تقسیم سے مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو فائدہ پہنچا۔ اس لیے کہ وہ لوگ اکثریت میں تھے۔ لیکن بنگالی ہندو اس تقسیم سے خوش نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس تقسیم کے خلاف زبردست احتجاج شروع کیا۔ اس احتجاج میں بنگال کی آبادی کے ہر طبقہ نے حصہ لیا۔ لیکن اس کے باوجود حکومت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بلکہ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف لارڈ کرزن نے سخت الفاظ استعمال کئے تو ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ء کو تجویز ملامت پاس کی گئی اور جب ۵ جولائی ۱۹۰۵ء کو تقسیم بنگال کا اعلان کر دیا گیا اور برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی تو انقلاب پسندوں نے ۷/اگست ۱۹۰۵ء

کو باقاعدہ سودیشی تحریک کا اعلان کر دیا اور اس تحریک کے رہنماؤں نے سودیشی کو اپنانے اور غیر ملکی اشیاء کے بائیکاٹ کرنے کی تحریک شروع کر دی۔ کانگریس نے بھی سودیسی تحریک کی بھرپور حمایت کی۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی اور اس تحریک کو عملی شکل دینے کے لیے بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی گئی۔ اس سودیشی تحریک کے بارے میں ممتاز رہنما سریندر ناتھ بنرجی نے لکھا ہے کہ:

''سودیسی نے ہماری سماجی اور گھریلو زندگی کے پورے نظام کو بدل کر رکھ دیا اور وہ دن واپس لوٹ آئے جب شادی بیاہ کے محافل میں غیر ملکی کپڑوں کے بجائے گھر پر بنے ہوئے کپڑے دیئے جانے لگے' پرانہوں نے ان تقریبات میں مذہبی رسوم کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ جن میں دیوی دیوتاؤں کو ودیشی اشیاء چڑھائی جاتی تھی۔ مہمانوں نے بھی ان تقریبات میں شرکت سے انکار کر دیا جن میں غیر ملکی نمک یا غیر ملکی شکر کو استعمال کیا جاتا تھا''(1)

سودیسی تحریک نے تقریبا زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا چنانچہ سرکاری اسکولوں' کالجوں عدالتوں اور نوکریوں تک کا بائیکاٹ کیا اور اس تحریک کے رہنماؤں نے قومی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے قومی تعلیمی ادارے قائم کئے۔ اس تحریک کے تعلق سے پروفیسر ظفر احمد نظامی لکھتے ہیں:

''سودیسی تحریک نے قومی تعلیم کو بھی رواج دیا قومی رہنماؤں نے مروجہ تعلیمی نظام کو ناقص اور مضر قرار دیتے ہوئے قومی تعلیم کی ترویج کے لیے قومی تعلیمی ادارے قائم کئے تاکہ طلبہ میں حب الوطنی کے جذبات بیدار ہوں اور ملک کی ضرورتوں سے متعلق تعلیم دی جا سکے۔ اروند گھوش کی قیادت میں ایک نیشنل کالج قائم کیا گیا اور ۱۵ اگست ۱۹۰۶ء کو تعلیم سے متعلق ایک نیشنل کونسل کا وجود عمل میں آیا''۔(2)

ایک طرح سے اگر دیکھا جائے تو تقسیم بنگال کا مسئلہ ایک صوبائی مسئلہ تھا لیکن کانگریس اور دیگر لیڈروں نے اس کو قومی مسئلہ کی شکل دے کر اس تحریک کو ملک کے دوسرے حصوں میں بھی متعارف کرایا چنانچہ اس تقسیم کی مخالفت میں اور سودیشی کے حق میں پورے ملک میں تحریکیں چلائی گئیں۔ اس سلسلہ میں بال گنگا دھر تلک کا نام بہت نمایاں ہے۔

انتہا پسند تحریک:

گذشتہ صفحات پر واضح کیا گیا کہ ۱۸۸۵ء سے ۱۹۰۵ء تک کانگریس کی باگ ڈور اعتدال پسندوں کے ہاتھ میں رہی لیکن اس کے بعد کانگریس میں انتہا پسندوں کا قبضہ ہو گیا۔ ان لیڈروں نے جہاں ایک طرف انگریزی حکومت کے خلاف اپنی آواز بلند کی وہیں دوسری طرف حکومت نے اپنے مخالف اٹھنے والی تمام آوازوں کو مٹانے کی بھرپور کوشش کی۔ چنانچہ بڑے بڑے انتہا پسند لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا گیا اور انہیں ان جیلوں میں سخت سے سخت سزائیں برداشت کرنی پڑیں۔

دسمبر ۱۹۰۷ء میں سورت میں جو کانگریس کا اجلاس ہوا اس میں صدارت کے مسئلہ میں اختلاف ہوا اور انتہا پسند لیڈر کانگریس سے الگ ہو گئے تھے اس لیے کہ ان کا خیال تھا کہ انگریزوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے کچھ بھی حاصل ہونے والا نہیں ہے۔ انتہا پسندوں کی کانگریس علٰحدہ دونوں گروہوں کے لیے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ اس لیے حکومت نے اعتدال پسندوں کی حمایت میں ۱۹۰۹ء کا انڈین کونسلس ایکٹ پاس کیا لیکن انتہا پسندوں نے بھی اپنی تحریک جاری رکھی۔ انجام کار ۱۹۱۱ء میں شاہ انگلستان جارج پنجم نے خود ہندوستان آ کر تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔

فروری ۱۹۱۵ء میں گوپال کرشن گوکھلے کا انتقال ہو گیا اور اسی سال نومبر میں فیروز شاہ مہتا بھی چل بسے' ان دونوں کی موت کی وجہ سے کانگریس کا وہ طبقہ جن کو اعتدال پسند کہا جاتا ہے کمزور پڑ گیا۔ اسی وقت محترمہ اینی بیسنٹ ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینے لگی تھیں۔ انہیں کی کوششوں سے تلک دوبارہ کانگریس میں آئے۔ اس طرح ۱۹۱۷ء ایک تاریخی سال رہا جس میں کانگریس کے دو ٹوٹے ہوئے حصے آپس میں مل گئے۔

مسلم لیگ کا قیام:

بیسویں صدی کے شروع میں بڑی حد تک قومی بیداری پیدا ہو چکی تھی لیکن انگریزوں نے ہندوستان میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے ہندو اور مسلمان ملک کی آزادی کے لیے

متحد نہ ہوسکیں۔انہیں حالات میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۴ء میں ڈھاکہ میں تمام مسلمانوں کا ایک اجلاس منعقد ہوا اور اسی میں آل انڈیا مسلم کے قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ڈھاکہ کے نواب آغا خاں اور نواب محسن الملک کی رہبری میں کل ہند لیگ قائم ہوئی۔ ڈھاکہ کے اس اجلاس میں نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک مسلم لیگ کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ مسلم لیگ کا قیام ایک وفادار، فرقہ پرست اور قدامت پرست سیاسی تنظیم کی حیثیت سے ہوا تھا۔ پر یہ تنظیم تقسیم بنگال کی حامی تھی اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے حقوق کا مطالبہ لے کر اٹھی تھی اور انگریزوں نے بھی فوراً اعلان کر دیا کہ وہ مسلمانوں کے مخصوص مفادات کا تحفظ کریں گے۔ اس کے بعد جلد ہی لیگ انگریزوں کا آلہ کار بن گئی۔ انگریزوں کو اس بات کی پوری امید تھی کہ وہ اس ہتھیار کی مدد سے ابھرتی ہوئی قومی تحریک کا گلا گھونٹ سکے گی۔ چنانچہ انگریز سرکار نے لیگ کو اپنے مفاد کے لیے زیادہ سے زیادہ استعمال کیا۔

مسلم لیگ کے قیام کے بعد ۲۹ دسمبر ۱۹۰۷ء میں پہلا اجلاس کراچی میں ہوا اور اس جلسہ کی صدارت آدم جی پیر بھائی نے کی۔ اجلاس میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد نے شرکت کی۔ کراچی کے اجلاس کے بعد اس کا دوسرا اجلاس ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کے صدر محمد شاہ دین بیرسٹر لاہور تھے۔ پھر ۱۹۰۸ء میں لیگ کے اجلاس امرتسر میں مجالس قانون ساز اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے لیے ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ حصہ داری کی وکالت کی گئی اور گورنر جنرل کی ایکزیکٹیو کونسل میں اکثریتی فرقے کے مساوی نمائندگی کا مطالبہ کیا۔ لیگ کے دوسرے اجلاس میں بھی اس طرح کے مطالبات کو دہرایا گیا۔

مسلم لیگ کے قیام کی وجہ سے بیشتر مسلم رہنما خوش اور مطمئن تھے لیکن اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ مسلم لیگ کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے کبھی بھی تسلیم نہیں کیا۔ مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ کانگریس کے ساتھ رہا۔ اہم مسلمان رہنماؤں میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولانا محمد علی اور حسن امام وغیرہ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے۔ مولانا محمد علی نے اپنے اخبار ''کامریڈ'' اور ''ہمدرد'' میں لیگ کی پالیسیوں کی تنقید کی اور مولانا آزاد نے بھی اپنے اخبار ''الہلال'' میں اسے تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ قوم پرور مسلمانوں کے رہنماؤں یعنی حکیم

اجمل خاں، حسن امام وغیرہ جو لیگ کے بانیوں میں سے تھے انہوں نے بھی اس کی پالیسیوں سے اتفاق نہیں کیا۔ چنانچہ کچھ داخلی اور خارجی وجوہات سے مسلم لیگ کو اپنی کانگریس مخالف روش میں تبدیلی لانی پڑی۔ سب سے بڑی وجہ یہ ہوئی کہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ میں دہلی کی سرزمین پر شاہ جارج پنجم کی تاجپوشی کا تاریخی دربار منعقد ہوا۔ بادشاہ نے اس دربار میں مسلم رہنماؤں کو اعتماد میں لیے بغیر تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان کر دیا۔ تقسیم بنگال کی منسوخی چونکہ ہندوؤں کی بہت بڑی سیاسی فتح تھی۔ اس لیے ہندوؤں میں تو اس پر بے حد خوشی کا اظہار کیا گیا لیکن مسلمانوں کے لیے صدمہ کا سبب ہوا اور مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ انگریز کو طاقت کے بل پر ہی جھکایا جا سکتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ قوم پرور مسلمانوں نے لیگ کو کانگریس کے ساتھ اشتراک پر راضی کر لیا۔ ان کے علاوہ پین الاقوامی حالات نے بھی لیگ کو کانگریس کے اشتراک کرنے پر مجبور کر دیا۔ مثلاً ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم میں ترکی کے سلطان چونکہ انگریزوں کے خلاف تھے۔ اس لیے ہندوستانی مسلمان بھی انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔ اس طرح دونوں سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کے قریب ہو گئیں۔

مسٹر جناح جو زمانہ دراز سے لیگ اور کانگریس کو قریب لانے کی کوششوں میں لگے تھے انہوں نے ہندو اور مسلمانوں کے بھڑکے ہوئے جذبات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا چنانچہ مسٹر جناح کی کوششوں سے نوبت یہاں تک پہونچ گئی کہ لیگ اور کانگریس کے اجلاس ایک ساتھ ایک شہر میں ہونے لگے۔ ۱۹۱۵ء میں لیگ اور کانگریس کے اجلاس بیک وقت بمبئی میں منعقد ہوئے جہاں دونوں جماعتوں کے رہنماؤں نے ایک دوسرے کے اجلاس میں شرکت کی لیگ کے اجلاس کی صدارت کے فرائض مولانا مظہر الحق صاحب نے ادا کئے اور ان کے خطبہ صدارت میں پہلی بار لیگ کی جانب سے برطانوی حکومت کو ہدفِ ملامت بنایا گیا۔

اب کانگریسی لیڈر مسلم لیگ کے پلیٹ فارموں پر تقریریں کرتے تھے اور لیگی لیڈر کانگریس پلیٹ فارم سے نعرہ آزادی بلند کرنے لگے تھے۔ ۱۹۱۶ء میں لیگ اور کانگریس کے اجلاس بیک وقت لکھنو میں ہوئے تو لیگ نے اس اجلاس میں سوراج کے مطالبہ کو اور کانگریس

نے لیگ کی اہمیت کو تسلیم کر کے ایک معاہدہ کیا جسے تاریخ میں میثاق لکھنو کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اس اجلاس میں دو خاص تاریخی واقعے رونما ہوئے۔ ایک تو یہ کہ ۱۹۱۶ء میں تمام انتہا پسند رہنماؤں کو کانگریس میں واپس لے لیا گیا۔ دوسری اہم بات یہ ہوئی کہ کانگریس اور کل ہند مسلم لیگ نے اپنے پرانے اختلافات کو پس پشت ڈال کر حکومت کے سامنے مشترکہ سیاسی مطالبے رکھے۔ اس کے بعد کئی سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

قوم پرست اور پہلی عالمگیر جنگ:

پہلی عالمگیر جنگ اگر ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور چار سال تک جاری رہی۔ اس میں ایک طرف جرمنی اور اس کے ساتھی آسٹریلیا ہنگری اور ترکی تھے۔ دوسری طرف انگلیڈ اور اس کے ساتھی فرانس، روس، امریکہ، ہندوستان اور جاپان وغیرہ تھے۔ اس جنگ کے زمانے میں ہندوستان میں قومی تحریک بہت پروان چڑھی اور اس میں بہت پختگی آئی۔ اس پہلی عالمگیر جنگ میں گاندھی جی، تلک اور ہندوستان کے سبھی رہنماؤں نے حکومت ہند کی جنگی کوششوں اور سرگرمیوں کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے مطالبات کو ایک طرف چھوڑ کر اتحادیوں کی فتحیابی کی کوششیں کی کیونکہ انہیں یقین تھا کہ برطانیہ ہندوستان کی وفاداری کے لیے شکرگزار ہوگا اور نئی اصلاحات میں یقیناً ہندوستان کو قابل لحاظ اقساط و مراعات سے نوازا جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہندوستانیوں کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ عالمی جنگ لڑی ہی جارہی ہے اس لیے کہ اپنی اپنی موجودہ نوآبادیوں کی حفاظت کی جاسکے۔

ریشمی رومال تحریک

بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں حصول آزادی کے لیے بہت سی تحریکات نے جنم لیا اس میں سے ایک تحریک ریشمی رومال بھی تھی۔ اس تحریک کا پسِ منظر یہ ہے کہ ۱۹۱۵ء میں جب کہ جنگ عظیم شباب پر تھی اور برطانوی حکومت انتہائی خطرناک حالات میں گھری ہوئی تھی، اس کی ساری توجہ یورپ میں ہونے والی جنگ کی طرف لگی ہوئی تھی کیوں کہ انگریزوں کا وطن دشمنوں

کی زد پر تھا۔ٹھیک اسی ماحول میں شیخ الہندؒ نے مولانا سندھی کو ریشمی رومال تحریک کے پروگرام کو عملی شکل دینے کے لیے کابل روانہ کیا اور خود حجاز پہنچ کر نقشہ جنگ مرتب کرنے لگے اور ترکی حکومت کی پشت پناہی حاصل کرنے کی ذمہ داری اپنے سر رکھی۔

''ریشمی رومال تحریک'' حضرت شیخ الہند کے سیاسی تدبر اور ایک بوریہ نشین عالم کے طائر فکر کی بلند پروازی کی روشن اور واضح دلیل ہے۔وہ اس کے لیے بہت عرصے سے تیاری کر رہے تھے۔یہ عجلت میں تیار کیا ہوا کوئی پلان نہیں تھا۔آپ اس کی تفصیل سے اس کی ہمہ گیری، وسعت اور گہرائی کو سمجھ سکتے ہیں اور یہ منصوبہ اس دور میں عملی شکل اختیار کرنے والا تھا جب بہت سی حکومتیں بھی انگریزوں کے خلاف ہر اقدام کی تائید اور تعاون دینے کے لیے بے چین تھیں۔اگر قضاء وقدر کا فیصلہ کچھ اور نہ ہوتا تو اس تحریک نے ملک کی آزادی پر بڑے اہم اثرات ڈالے ہوتے۔

ہوم رول لیگس کا قیام:

پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی رہنماؤں کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ حکومت اس وقت تک ہندوستانیوں کو کوئی مراعات نہیں دے گی جب تک عوام کے ذریعہ حکومت پر دباؤ نہ ڈالا جائے۔ان ہی حالات میں لوکمانیہ تلک نے اپریل ۱۹۱۶ء میں ہوم رول لیگ کی بنیاد رکھی۔دوسری طرف ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی قوم کی مداح اینی بیسنٹ نے ستمبر ۱۹۱۴ء میں ہوم رول قائم کی' ملک کی ''ہوم رول لیگ'' کا قیام پونا میں عمل میں آیا اور اینی بیسنٹ کی ہوم رول کا قیام مدراس میں آیا۔ان دونوں ہوم رول لیگوں نے اپنی سرگرمیوں میں ایک دوسرے سے پورا تعاون کیا اور پورے ملک میں اس مطالبہ کا زبردست پرچار کیا کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو ''ہوم رول'' یعنی خود اپنی حکومت بنانے کا اختیار دیا جائے۔اسی احتجاجی تحریک کے دوران تلک نے اپنا مشہور نعرہ دیا ''سوراج میرا پیدائشی حق ہے اور میں اسے حاصل کر کے رہوں گا۔'' پھر کیا تھا دونوں لیگوں نے تیزی سے ترقی کی اور ہوم رول کا نعرہ دیکھتے دیکھتے پورے ہندوستان میں گونج اٹھا۔

تحریک خلافت:

اب ہندوستان میں بیسویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں بھی جہاں بہت سے تحریکات نے جنم لیا انہیں میں سے ایک اہم تحریک ''تحریک خلافت'' بھی ہے۔ اس تحریک نے ہندوستانی سماج میں ہلچل پیدا کر دی۔ پہلی جنگ عظیم 1914ء میں جب ترکی نے اتحادیوں کے ساتھ ہو کر جنگ کی تو فطری طور پر مسلمانوں کو اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ ہوسکتا ہے کہ ان کے مقامات مقدسہ پر حملہ آور ہوں گے۔ ایسی صورت حال میں برطانیہ کے وزیر اعظم نے 9 نومبر 1914ء کو انہیں یقین دلایا کہ ان کے مقامات مقدسہ پر کسی طرح کا کوئی حملہ نہیں کیا جائے گا اور وہ ہر طرح کی بے حرمتی سے محفوظ رہیں گے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے وعدہ شکنی کر کے ترکی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ سیاسی طور پر باشعور مسلمان ترکی سلطنت کے لیے انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے اس رویے اور اقدام سے سخت ناراض تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ترکی کے سلطان کو ایک قیدی کی حیثیت میں تبدیل کر دیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس ظالمانہ رویہ سے سخت صدمہ پہونچا۔ اس لیے کہ ترکی کے سلطان کو بہت سے مسلمان خلیفہ کا درجہ دیتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں ایک وفد انگلستان پہونچا تا کہ برطانوی ارباب اقتدار کو اس اہم مسئلہ سے واقف کرایا جا سکے۔ اس وفد کی ناکامی کے نتیجہ میں جلد ہی علی برادران، مولانا آزاد، حکیم اجمل خان اور حسرت موہانی کی سرکردگی میں ایک خلافت کمیٹی قائم ہوئی اور ایک کل ہند جدوجہد شروع ہوئی۔ پر وہ زمانہ تھا کہ جب گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس کی تحریک بڑی تیزی کے ساتھ ملک میں آگے بڑھ رہی تھی۔ ہندو اور مسلمان دونوں لیڈر یکساں طور پر انگریزوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ گاندھی جی نے شروع سے آخر تک تحریک خلافت کا ساتھ دیا۔ گاندھی جی نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی اور شوکت علی کے ساتھ مل کر خلافت میں ہندوؤں کی شمولیت کو یقینی بنایا۔

تحریک خلافت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان زبردست اتحاد قائم کیا۔ انگریز حکمرانوں کی ''پھوٹ ڈالو اور راج کرو'' کی جو پالیسی تھے اسے تحریک خلافت نے بہت بڑا جھٹکا

دیا۔اس وقت ہندو اور مسلمان کا جو اتحاد تھا شاید اس سے پہلے کسی نے نہ دیکھا ہوگا اور مسلمان انگریز کی مخالفت میں ایک طرح پاگل سا ہو گیا تھا۔اس تعلق سے مفتی شوکت علی فہمی رقم طراز ہیں:

''ہندو مسلمانوں میں اس وقت تک بدستور کامل اتحاد تھا اور مسلمانوں کے سیاسی جوش کا تو یہ عالم تھا کہ وہ کانگریس' لیگ' خلافت کسی جماعت میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں کرتے تھے۔ جس طرح علی برادران کے دلدادہ تھے' اسی طرح گاندھی جی پر فریفتہ تھے۔ان کا مطمح نظر صرف یہ تھا کہ انگریز کو کاری ضرب لگائی جائے چنانچہ علی برادران نے جب خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے انگریزوں کے خلاف نعرہ بلند کیا تو مسلمان ادھر دوڑ گئے اور گاندھی جی نے عدم تعاون کا حکم دیا تو مسلمانوں نے سرکاری ملازمتیں چھوڑنی شروع کر دی' انگریزی عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا۔ انگریزی مال کو آگ لگا دی۔غرضیکہ انگریز کی مخالفت کا نعرہ جدھر سے بھی بلند ہوا مسلمان ادھر ہی دوڑتا چلا جاتا تھا۔مسلمان اب اتنا جری ہو چکا تھا کہ نہ وہ جیل کی کوٹھری سے ڈرتا تھا اور نہ پھانسی کے تختہ سے۔ چنانچہ جب گرفتاریوں کا دور شروع ہوا تو مسلمانوں نے سب سے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو گرفتاریوں کے لیے پیش کیا۔غرض کہ مسلمان انگریز کی مخالفت میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ اگر ہندو مہا سبھا بھی اپنے پلیٹ فارم سے انگریز کے خلاف کوئی تحریک شروع کرتی تو ہندو مہا سبھا کے جھنڈے تلے بھی جا کھڑا ہو جاتا پس اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا ترکوں کی حمایت اور انگریز کی مخالفت'' (3)

تحریک خلافت میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی شانہ بہ شانہ رہنے کی وجہ سے تحریک آزادی ہند کو زبردست قوت ملی اور اس اتحاد نے حصول آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔

جمعیۃ علماء ہند:

تحریک خلافت کے ہی زمانے میں ۱۹۱۹ء میں مسلمانوں کی ایک اور جماعت وجود میں آئی جو جنگ آزادی میں مسلمانوں کی قیادت ورہنمائی کی ذمہ داری سنبھالی۔اس جماعت کا نام جمعیۃ علماء ہند تھا۔اس کے بانی وہی علماء کرام تھے جو تحریک خلافت میں آگے بڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ ان علماء کرام نے تحریک خلافت کو پروان چڑھانے میں اپنی پوری توانائیاں لگا دیں۔ بدیسی مال کا بائیکاٹ کیا اور دیسی کپڑوں کا رواج دیا۔اس سلسلہ میں جوش وجذبے کا یہ عالم تھا کہ

چوراہوں پر ولایتی کپڑے کا انبار لگا کر ان میں آگ لگا دی جاتی تھی اور لوگ اپنے کپڑے اتار اتار کر اس آگ میں جھونکتے جاتے تھے۔ غرض اس تحریک نے جو سیاسی شعور اور عوامی بیداری کی لہر پیدا کی اس سے قبل کبھی نہیں آئی اور اس تحریک نے ہندوستان کی سیاست پر بہت گہرے اثرات چھوڑے۔ چنانچہ اس تعلق سے مولانا اسیر ادروی لکھتے ہیں:

''تحریک ختم ضرور ہوگئی لیکن اس نے ہندوستان میں سیاسی بھونچال پیدا کر دیا' اس نے برطانوی اقتدار کے تخت طاؤس میں زلزلہ ڈالدیا اور حکومت کو تھرتھرا دیا۔ اس نے پورے ملک میں وہ تیز مشعل جلادی کہ ہندوستان کے عوام کو اس کی روشنی میں اپنی منزل نظر آنے لگی' ان میں سرفروشی اور جانبازی' جرأت و بیباکی کی وہ روح پھونک دی تھی کہ ان کے دلوں سے برطانوی حکومت کا جاہ وطمطراق' رعب اور انگریزوں کے اندرون خانہ، جاہ وجلال کی ہیبت کو ختم کر دیا۔ ان کے ذہنوں سے انگریزوں کے مرعوبیت کے داغ دھبہ کو کھرچ کھرچ کر پھینک دیا۔ اس تحریک کی سب سے بڑی دین ہے''(4)

رولٹ ریکٹ 1919ء:

پہلی جنگ عظیم جو یورپ میں لڑی جارہی تھی اس جنگ کی دہکتی ہوئی بھٹی میں انگریزوں نے غلام ہندوستان کو بھی جھونک دیا۔ اس لیے کہ ان کی جنم بھومی کے اوپر خطرے کے بادل منڈلا رہے تھے۔ دس لاکھ کے قریب ہندوستانی نوجوانوں کو فوج میں بھرتی کیا گیا۔ چار سال تک مسلسل آگ وخون کی بارش ہوتی رہی۔ اس جنگ میں صرف پنجاب کے اتنے جوان مارے گئے کہ صوبہ پنجاب کا گھر گھر ماتم کدہ بن گیا۔ اس کے علاوہ جنگ کے زمانے میں کھانے پینے کی چیزوں کی کمیابی نے ہندوستانیوں کی کمر توڑ دی۔ ان تمام مصائب وآلام کو انگریزوں کے حکم کی تعمیل میں ہندوستانیوں نے اس لیے برداشت کرلیا کہ جب جنگ کا خاتمہ ہوگا تو یہ مصائب دور ہوجائیں گے۔ برطانوی حکومت ہماری قربانیوں سے متاثر ہوکر آزادی کی ایک قسط سے ضرور نوازے گی لیکن ان کی سبھی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ انقلابی سرگرمیوں کی روک تھام کے نام پر ''رولٹ ایکٹ'' پاس کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت حکومت کسی بھی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر قید

کرسکتی تھی، سزا سنا سکتی تھی، ہندوستانیوں کے حقوق میں اس طرح کی غاصبانہ دخل اندازی سے برہم ہوکر ''مجلس آئین ساز'' کے ہر ہندوستانی ممبر نے اس کی مخالفت کی۔ اس کے باوجود بھی حکومت ہند نے ایکٹ پاس کر دیا اور اس کو قانون کی شکل دے دیا۔

رولٹ ایکٹ کے خلاف ستیہ گرہ:

اس ایکٹ کی وجہ سے سارے ملک میں ناراضگی پھیل گئی۔ اس ظالمانہ قانون کو برداشت کرنا ہندوستان کے بس میں نہ تھا۔ لیکن مخالفت کا طریقہ کیا ہو؟ عوامی غم وغصہ کا اظہار کس طرح کیا جائے؟ بڑے ہی غور وفکر کے بعد دو عظیم شخصیتوں نے ملک کو ایک نئے طریقۂ جنگ سے واقف کیا۔ ان میں سے ایک گاندھی جی تھے اور دوسری شخصیت مولانا آزاد کی تھی، اس نئے طریقہ جنگ کا نام ستیہ گرہ (سچائی کا عہد) تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے بمبئی میں ستیہ گرہ سبھا کی تشکیل کی گئی اور اعلان کر دیا گیا کہ جو لوگ ستیہ گرہ کا حلف اٹھائیں گے وہی سول طور پر رولٹ ایکٹ کی مخالفت کریں گے۔ اس سبھا میں ہوم رول لیگ کے سبھی شاخوں کے نوجوان ممبران شامل تھے اور وہ حکومت کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ پورے ملک میں دعاؤں، روزوں اور ہڑتالوں کا دور شروع ہوگیا۔ پہلے ۳۰ مارچ اور پھر ۶ اپریل کو ایک ساتھ پورے ملک میں ہڑتال کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس بعد کیا ہوا مشہور مورخ پروفیسر بپن چندر لکھتے ہیں:

''ستیہ گرہ کی تاریخ چھ اپریل طے کی گئی لیکن تحریک نے غیر متوقع صورت اختیار کرلی۔ تاریخ کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہوگئی اور دہلی میں 30 مارچ کو ہڑتال کردی گئی۔ اس کے دوران دہلی کی سڑکوں پر تشدد کے بہت سے واقعات ہوئے۔ دوسری جگہوں پر بھی یہی ردعمل ہوا۔ پنجاب جہاں لوگ پہلی جنگ عظیم کے دوران فوج میں کی گئی بھرتی نیز دوسری زیادتیوں اور بیماری کی تباہیوں سے سخت مصیبت میں تھے انہوں نے ایسے حالات کو حکومت سے بدلہ لینے کا نادر موقع سمجھا۔ امرتسر اور پنجاب میں تو حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ گاندھی جی پنجاب جاکر لوگوں کو سمجھانا چاہتے تھے مگر حکومت نے ان کو پنجاب میں داخل ہونے نہیں دیا اور ان کو بمبئی بھیج دیا۔ ان کا اپنا گجرات اور احمد آباد تشدد کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس لیے وہاں رک کر لوگوں کو

پرامن کرنا چاہتے تھے۔ بمبئی میں بھی یہی حالت تھی'' (5)

مارچ اور اپریل ۱۹۱۹ء کا دور ہندوستان میں غیر معمولی بیداری کا دور بن کر آیا۔ پورے ملک میں جیسے جان پڑ گئی۔ ہر طرف ہڑتالیں' دھرنے' جلسے جلوس اور مظاہرے ہو رہے تھے۔ پورے ملک کی فضا ہندو مسلم کے اتحاد کے نعروں سے گونج اٹھی۔ پورے ملک میں جیسے برقی دوڑ گئی۔ اب ہندوستانی عوام کسی حالت میں غیر ملکی ذلت برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے۔

جلیان والا باغ میں:

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرت سر میں جلیان والا باغ میں خونی حادثہ رونما ہوا جہاں جنرل ڈائر (Dyer) نے ایک جلسہ میں شریک ہوئے لوگوں پر بغیر اطلاع دیئے گولی چلائی گئی۔ صورت حال یہ ہوئی کہ پنجاب کے دو مشہور لیڈر ایک ڈاکٹر ستیہ پال اور دوسرے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو گرفتار کر کے جلاوطن کر دیا گیا۔ عوام کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ حکومت انتقام پر اتر آئی ہے ان میں بھی اشتعال پیدا ہوا اور لوگ گھروں سے نکل کر سڑک پر آ گئے تا کہ اپنے لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کر سکیں۔ اس سلسلہ میں پوسٹ آفسوں پر حملے کئے گئے' ٹیلیگراف کے تار کاٹ دیئے گئے۔ انگریزوں پر حملے کئے گئے اور حکومت کے خلاف نعرے لگاتا ہوا مجمع واپس ہو گیا اور اعلان کیا گیا کہ شام کو ساڑھے چار بجے جلیان والا باغ میں جلسہ عام ہوگا تا کہ اپنے محبوب لیڈروں کی گرفتاری کے خلاف احتجاج کیا جائے ادھر تشدد پر قابو پانے کے لیے فوج طلب کر لی گئی۔ پورا شہر جنرل ڈائر کے سپرد کر دیا گیا۔ اس نے میٹنگ کرنے پر پابندی عائد کر دی۔ اس کے بعد کی داستان مشہور مورخ تاراچند کے الفاظ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''جلیان والا باغ'' عمارتوں سے محصور ایک کھلا ہوا احاطہ تھا جس میں ایک ایسا بھی تنگ راستہ تھا جس سے ایک مسلح کار بھی نہیں گزر سکتی تھی دوسری طرف تین یا چار شگاف تھے۔ اس احاطہ میں مختلف اندازوں کے مطابق پندرہ سے پچیس ہزار اشخاص جمع ہو گئے تھے۔ وہ لوگ پر امن طریقے سے رہنماؤں کی تقاریر سن رہے تھے کہ ڈائر اور اس کے ساتھی صدر دروازے پر آ گئے۔ ڈائر نے فوراً اپنے فوج کی صفیں باندھ لی اور بلا کسی اطلاع کے گولی باری کر دی۔

سیکڑوں اشخاص مارے گئے اور بے شمار لوگ بعد میں ہونے والی بھگدڑ میں کچل گئے۔ کشتوں کے پشتے لگ گئے اور زخمی دور دور سے کراہتے اور پانی کے لیے چلاتے رہے لیکن گولی باری ہوتی رہی جب تک گولہ بارود ختم نہیں ہوگیا۔ مرے ہوئے اور زخمی لوگوں کی پرواہ کئے بغیر اپنی کارستانی پر نظر ڈالتے ہوئے پرغور انداز میں ڈائر قتل گاہ سے چلا گیا''۔(6)

جلیان والا باغ میں جو حیوانیت کا ننگا ناچ ہوا' اس سے پورا ملک صدمہ میں ڈوب گیا۔ حکومت کے ظلم وستم کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ پورا ملک تشدد کی آگ جل رہا رہے۔ گاندھی جی کو یہ دیکھا نہیں گیا چنانچہ ۱۸ اپریل کو انہوں نے تحریک واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں لیا جا سکتا ہے کہ گاندھی جی نے انگریزوں سے ہار مان لی تھی یا گاندھی جی کو عوام پر سے اعتماد و بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ ایک سال بعد گاندھی جی نے ایک پھر ملک گیر سطح پر تحریک چلائی جسے ہندوستان کی تاریخ میں تحریک عدم تعاون کے نام سے جانا جاتا ہے۔

تحریک عدم تعاون:

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے آخری سال یعنی ۱۹۲۰ء ہندوستانی عوام کے لیے مایوسی لے آیا۔ اس لیے کہ اسی سال اس وعدہ کی خلاف ورزی کی گئی جو ترکی کے خلیفہ کے تعلق سے مسلمانوں سے لیا گیا تھا۔ چنانچہ جنگ کے خاتمہ پر خلیفہ کی طاقت بہت کمزور ہوگئی تھی۔ اسی سال ''رولٹ ایکٹ پاس ہوا۔ حالانکہ عوام کو امید تھی کہ پہلی عالمی جنگ کے خاتمہ پر انگریز حکومت کچھ کرے گی۔ اس سال جنگ آزادی کے دور کا سب سے زیادہ خونریز اور کربناک واقعہ جلیان والا باغ کا حادثہ پیش آیا اور اس کے بعد پورے پنجاب میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ان تمام واقعات نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ اس شیطانی حکومت سے کسی بھی شکل کا تعاون گناہ کے مترادف ہے۔ اور عوام کو بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ گئی کہ انگریز حکومت میں سوائے ظلم وستم کے کچھ ملنے والا نہیں ہے۔ ان تمام واقعات سے ہندوستان کی پوری عوام کو بے حد تکلیف ہوئی۔ انہیں حالات میں نومبر ۱۹۲۰ء میں گاندھی جی نے خلافت کمیٹی کو انگریزی حکومت کے

خلاف پرامن عدم تعاون تحریک شروع کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ۹ جون ۱۹۲۰ء کو الٰہ آباد میں خلافت کمیٹی نے گاندھی جی کے اس مشورہ کو مان لیا اور اس تحریک کی قیادت و سیادت گاندھی جی کے سپرد کر دی گئی۔ دوسری طرف کانگریس بھی حکومت سے ناراض تھی۔ اس نے بھی کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ ۲۲ جون کو وائسرائے کو اطلاع بھیجی گئی کہ خلافت تحریک کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کی تلافی یکم اگست تک نہ کی گئی تو عدم تعاون تحریک شروع کر دی جائے گی۔ چنانچہ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تحریک باقاعدہ شروع کر دی گئی۔ اتفاق دیکھئے کہ اسی دن ایک اہم قومی لیڈر تلک کا انتقال ہو گیا۔ جس سے کانگریس کو بہت صدمہ پہونچا لیکن گاندھی جی' سی آر داس اور موتی لال نہرو نے جلد ہی ان کی کمی کو پورا کر دیا۔ چنانچہ تلک کے انتقال کی وجہ سے تقریب اور تحریک دونوں کے جلسے ایک ساتھ ہوئے۔ لوگوں نے پورے ملک میں ہڑتال کیا اور جلوس نکالے گئے۔ اس تحریک کے پروگرام میں مندرجہ ذیل باتیں شامل تھیں۔

(۱) ولایتی کپڑے کا بائیکاٹ (۲) سرکاری ملازمتوں کا بائیکاٹ (۳) کونسلوں کا بائیکاٹ (۴) سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ (۵) خطابات کا بائیکاٹ۔

نومبر ۱۹۲۰ میں مسلمانوں کی دوسری تنظیم جمعیۃ علماء کا دہلی میں اجلاس ہوا اس میں خلافت کمیٹی کے فیصلے کی تائید کی گئی اور انگریزی حکومت کے ساتھ ہر طرح کے تعاون کو حرام قرار دیا گیا۔ مولانا آزاد نے بھی انگریزی حکومت سے عدم تعاون کے پروگرام میں گاندھی جی کا بھرپور ساتھ دیا۔ اسی طرح گاندھی جی ہندو اور مسلمان دونوں کو لے کر اس تحریک کو آگے بڑھے اور دیکھتے دیکھتے یہ تحریک ہندوستان کے کونے کونے میں پہونچ گئی۔ اس تحریک کے تعلق سے مشہور مورخ پٹن چندر لکھتے ہیں:

> ''عدم تعاون تحریک جس کی ابتداء خلافت کانفرنس سے ہوئی تھی کو اپنانے سے کانگریس کو نئی طاقت و توانائی حاصل ہوئی۔ جنوری 1921ء سے پورے ملک میں تحریک نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ گاندھی جی نے علی برادران جو اس وقت خلافت تحریک کے روح رواں تھے کے ساتھ پورے ملک کا دورہ کیا۔ سیکڑوں میٹنگوں کو خطاب کیا اور سیاسی رضا کاروں کی کثیر تعداد

سے ملاقات کی۔ پہلے ماہ ہزاروں طلبہ (ایک تخمینہ کے مطابق نوے ہزار) نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا اور نیشنل اسکول میں داخلہ لیا۔ اس وقت ملک میں 800 نیشنل اسکول اور کالج تھے۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم کا بائیکاٹ مغربی بنگال میں سب سے زیادہ کامیاب رہا۔ کلکتہ کے طلبہ نے پورے صوبہ میں ہڑتال کیا۔ ان کی مانگ تھی کہ اسکولوں کی انتظامیہ کمیٹی سرکار سے اپنا رشتہ توڑے۔ سی آر داس نے اس تحریک کو تیز کرنے میں اہم رول ادا کیا اور سبھاش چندر بوس نیشنل کالج کلکتہ کے پرنسپل ہو گئے۔ ملکی سطح کی اس جدوجہد نے سودیشی اسپرٹ میں نیا جوش پھونکا۔''(7)

اس تحریک کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ تحریک کے اخراجات کے لیے ''تلک سوراج فنڈ'' شروع کیا گیا اور چھ مہینے کی قلیل مدت میں ایک کروڑ سے زیادہ چندہ ہو گیا۔ عورتوں کے جوش کا عالم یہ تھا کہ انہوں نے اس تحریک کے لیے خوشی خوشی اپنے زیور دان کر دیئے۔

جولائی ۱۹۲۱ء میں کل ہند خلافت کمیٹی نے ایک تجویز منظور کی جس میں کہا گیا کہ انگریزوں کی ہندوستانی فوج ملازمت نہ کرے۔ اس تجویز کے پاس ہونے کے فوراً بعد ستمبر میں علی برادران کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسی سال ۱۴ اکتوبر کو گاندھی جی نے ایک اعلان نامہ جاری کر کے ہندوستانی فوج سے کہا کہ ہر ہندوستانی فوج کا فرض ہے کہ وہ انگریزی فوج سے اپنا تعلق ختم کرے جو ہندوستان کو سماجی، معاشی اور سیاسی اعتبار سے ذلیل کرتی ہے۔

اسی درمیان ۱۹۲۱ء میں شہزادہ ویلز جو انگلینڈ کی موجودہ ملکہ الزبتھ کا تایا تھا ہندوستان آیا تا کہ عوام کی ہمدردی انگریزی سرکار کے لیے حاصل کر سکے۔ جس روز شہزادہ بمبئی آیا اس وقت عوام نے اس کے خیر مقدم میں کوئی حصہ نہ لیا۔ ویلز پورے ہندوستان میں جہاں بھی گیا ویران سڑکوں اور بند دروازوں نے اس کا استقبال کیا۔ اس تحریک کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہندو مسلم اتحاد پر بہت زیادہ زور دیا گیا تھا۔ خلافت کمیٹی بھی زور شور سے اس میں شریک تھی۔ سیاسی میدان میں مسلمانوں کے جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ کفن باندھ کر جہاد کے میدان میں وہ اتر چکے تھے۔ جیل جانا ان کے لیے ایک طرح کا کھیل ہو گیا تھا۔ اودھ میں کسان سبھا اور کسان

آندولن 1918ء سے ہی زور پکڑ رہے تھے۔ جواہر لال نہرو گاؤں گاؤں گھوم کر اس تحریک کو طاقت پہنچا رہے تھے۔ آسام میں چائے باغان کے مزدور ہڑتال پر چلے گئے۔ بنگال میں ریلوے ملازمین نے ہڑتال کر دی۔ اس طرح اس تحریک کی آگ پورے ملک میں پھیل گئی۔ پھر کیا تھا۔ اس تحریک کو ختم کرنے کے لیے حکومت نے بھی ظلم وستم کا سہارا لیا۔

۱۹۲۱ء ختم ہونے تک گاندھی جی کے علاوہ تمام بڑے رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا اور تین ہزار دوسرے کارکن اور شہری جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا چکے تھے۔

چوری چورا حادثہ:

۱۹۲۲ء میں تحریک خلافت کی سرگرمیاں شباب پر تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد مثالی تھا۔ اس لیے سول نافرمانی کی تحریک شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ انگریزی حکومت سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ ملک میں ہر طرف شورش برپا تھی۔ عدم تعاون تحریک نے جس طرح عدالتوں کا بائیکاٹ کیا اسی طرح پولیس اور انتظامیہ سے غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیں حالت میں ۱۵ فروری ۱۹۲۲ء کو چوری چورا میں کانگریس اور خلافت کا ایک جلوس نکلا تھا۔ پولیس والوں نے ان کے ساتھ بدسلوکی کی چنانچہ جلوس نے تھانے پر پتھراؤ کرنا شروع کر دیا۔ پولیس نے پتھروں کا جواب بندوقوں سے دیا۔ جلوس میں شامل تمام لوگ غصہ سے تلملا اٹھے اور انہوں نے ایک ساتھ پولیس والوں پر حملہ کر دیا۔ پولیس والوں نے بھاگ کر تھانے میں پناہ لی۔ لوگوں نے تھانے کو ہی پھونک ڈالا جس میں ۲۲ پولیس والے مارے گئے۔ اس حادثہ کی خبر ملتے ہیں گاندھی جی نے تحریک واپس لینے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح ۱۲ فروری ۱۹۲۲ء کو تحریک عدم تعاون کو کچھ عرصہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔

کسانوں کی تحریک:

انیسویں صدی سے ہی کسانوں میں انگریزوں کے خلاف لاوا پک رہا تھا اور کئی دفعہ انہوں نے بغاوت کی راہ اختیار کی۔ لیکن کسانوں نے اپنی اس بغاوت کو باضابطہ تحریک کی شکل بیسویں صدی میں دی۔ جس وقت تحریک آزاد ہند اپنے عروج پر تھی۔ چنانچہ بیسویں صدی کی

دوسری اور تیسری دہائی میں کسانوں کی تین اہم تحریکیں نظر آئی ہیں۔ اودھ میں کسان سبھا کی تحریک، مالابار میں موپلاں کسان کی تحریک اور گجرات میں بارودلی کا ستیہ گرہ۔

۱۹۵۶ء میں اودھ پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا اور زمینداروں نے کسانوں پر ظلم وستم کرنا شروع کردیا۔ من مانے ڈھنگ سے لگان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اب اودھ میں کسانوں کی زندگی ایک طرح سے ان زمینداروں کے رحم وکرم پر تھی دوسری طرف پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر ہونے والی گرانی نے کسانوں کی کمر پہلے ہی توڑ رکھی تھی اور زمین داروں کی طرف سے ان لوگوں کو رعایتیں نہیں مل رہی تھی۔ ایسے حالات میں مدن موہن مالویہ کی کوششوں سے فروری ۱۹۱۵ء میں ''کسان سبھا'' کی بنیاد پڑی اور اس تنظیم نے بڑے پیمانوں پر کسانوں کو متحد کرنے کا کام کیا۔ نتیجتاً ایک سال بعد ۱۹۱۹ء کے آخری مہینوں میں ان کسانوں کی بغاوت کھل کر سامنے آئی۔

جس وقت اودھ کی سرزمین پر کسانوں کی بغاوت چل رہی تھی ٹھیک اسی وقت جنوبی ہند میں کیرالہ کے ضلع مالابار میں کسانوں نے انگریزوں کے خلاف شاندار لڑائی لڑی۔ یہ آگ ۱۹۲۱ء میں پورے طور پر مالابار میں بھڑک رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ یہاں بھی کسانوں کی حالت اودھ کے کسانوں کی طرح تھی۔ زمیندار کی جب بھی مرضی ہوتی کسانوں کو زمین سے بے دخل کردیتے۔

گجرات کے سورت ضلع کے بارودلی میں بھی کسانوں نے لگان نہ دینے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تحریک بھی ایک طرح سے عدم تعاون تحریک کی ہی دین تھی۔ اس طرح ملک کے مختلف حصوں میں تحریک آزادی ہند کے ساتھ ساتھ کسانوں کی تحریک بھی زور پکڑ رہی تھی۔ جس سے انگریز پریشانی اور بوکھلاہٹ کے شکار ہوگئے تھے۔

مزدوروں کی تحریک:

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان ایک نئے دور سے گزر رہا تھا۔ ہندوستان میں جدید صنعت وحرفت دھیرے دھیرے ترقی کی راہ پر گامزن تھی۔ جدید کارخانے کھلے، ریلوے، پوسٹ آفس اور ٹیلی گراف جیسے شعبوں سے ہندوستان متعارف ہوا۔ ساتھ ہی

ساتھ ایک جدید مزدور طبقہ بھی وجود میں آیا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں گاندھی جی نے اپنی کوششوں سے مزدوروں کو قومی تحریک سے جوڑ دیا۔ ان مزودوں نے قومی تحریک میں شامل ہونے کے بعد انگریزوں کے خلاف ایسے حالات بنائے کہ حکومت کو سنبھالنا مشکل تھا۔

مزدور تحریک کی تاریخ میں ۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۸ء تک کا زمانہ بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس زمانہ میں ہڑتالوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا تھا اور کئی سودیشی لیڈروں نے مستقل ٹریڈ یونین بنانے، ہڑتالوں کا نظم کرنے اور ان کے لیے فنڈ جمع کرنے میں دلچسپی دکھائی۔ ۱۹۲۰ء میں آل انڈیا ٹریڈ یونین کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اس تنظیم کے خاص روح رواں لوکمانیہ تلک تھے۔ ان کے تعلقات بمبئی کے مزدوروں سے بہت اچھے تھے۔

لالہ لاجپت رائے اس کے پہلے صدر بنے اور دیوان حسن لال اس کے سکریٹری تھے۔ لالہ لاجپت رائے کے علاوہ کانگریس کے دو مشہور لیڈر سی آر داس اور جواہر لال نہرو بھی مزدور یونین میں شامل ہو گئے۔ اس حکمت عملی سے کانگریس نے مزدوروں کو فوجی تحریک کا ایک حصہ بنا دیا۔ چنانچہ نومبر ۱۹۲۱ء میں جب شہزادہ ویلز ہندوستان آیا تو کانگریس نے پورے ملک میں بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی۔ اس بائیکاٹ میں مزدوروں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور صرف بمبئی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار مزدور سڑکوں پر آ گئے۔ اس کے علاوہ جو بھی تحریک شروع ہوئی اس میں مزدوروں نے حصہ لیا۔ ۱۹۲۰ء میں ہی مزدور یونین میں ڈھائی لاکھ مزدور شامل تھے۔ جب یہ مزدور ایک ساتھ اپنی آواز بلند کرتے تھے تو انگریزی حکومت کے ایوان میں کھلبلی مچ جاتی تھی اور حکومت کسی بھی طرح ان کی آواز کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ تحریک عدم تعاون میں ملک بھر کے مزدوروں نے حصہ لیا۔ اسی تحریک کے دوران کانگریس نے بمبئی میں اپنا مشہور نعرہ دیا تھا۔ ''مزدور اور کسان کانگریس کے ہاتھ پاؤں ہیں'' تاریخ شاہد ہے کہ کانگریس کا یہ نعرہ بالکل درست تھا۔ اس لیے کہ آزادی وطن کے لیے انگریزوں کے خلاف جتنی بھی تحریکیں چلیں ان تمام میں مزدوروں اور کسانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔

سیاسی جمود کا زمانہ:

فروری ۱۹۲۲ء میں عدم تعاون تحریک واپس لیتے ہی قوم پروروں کی صف میں بد دلی اور مایوسی چھا گئی اس لیے کہ عدم تعاون تحریک کے التواء کے ساتھ ہی گاندھی جی کو اس الزام میں گرفتار کرلیا گیا تھا کہ وہ حکومت کے خلاف عوام میں بے اطمینانی پھیلا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قومی خیموں میں بکھراؤ کے بادل منڈلانے لگے اور لوگ پست ہمتی کا شکار ہو گئے۔ اس وقت کانگریس کے صدر سی آر داس تھے۔ سی آر داس کا ولبھ بھائی پٹیل اور راجندر پرساد سے اختلاف ہو گیا۔ اور سی آر داس نے ایک جنوری ۱۹۲۳ء کو ایک نئی پارٹی کانگریس خلافت سوراج پارٹی بنانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے صدر داس اور سکریٹریوں میں ایک موتی لال نہرو تھے۔ سوراج پارٹی اور کانگریس کے درمیان زبردست سیاسی تنازعہ شروع ہو گیا۔ ادھر گاندھی جی نے دونون فریقوں کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن دونوں فریق سورت اجلاس کا تجربہ دوبارہ آزمانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے گاندھی جی کے بار بار سمجھانے کی وجہ سے 6 نومبر ۱۹۲۴ء کو سی آر داس اور موتی لال نہرو دوبارہ کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۷ء تک کا وقت جمود اور ٹھہراؤ کا زمانہ رہا۔ مورخین نے اس زمانے کو ٹھہراؤ کا زمانہ کہا ہے۔

انقلابی تشدد پسند:

آزادی ہند کے حصول کے لیے جن لوگوں نے عظیم قربانیاں دیں' ان میں ایک طبقہ تو وہ تھا جو قانونی دائرہ میں رہ کر آزادئ ہند کا طلب گار تھا۔ دوسرا طبقہ تشدد پسندوں کا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریز حکومت اتنی ظالم و جابر ہے کہ وہ ہمارے مطالبات کو آسانی سے قبول کرنے والی نہیں ہے۔ اس کے لیے ہمیں گولی' بم اور طاقت کا سہارا لینا پڑے گا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران انقلابی تشدد پسندوں کو انگریزوں نے بری طرح ستایا اور ان کے اوپر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے۔ انقلابی تشدد پسند تحریک کے زیادہ تر لیڈر یا تو جیل کی سلاخوں میں تھے یا پھر اپنے آپ کو انگریزوں کے ظلم و بربریت سے بچانے کے لیے روپوش تھے۔ اس کے بعد حالات نے اپنا رخ

بدلا اور ۱۹۲۰ کے شروع میں ملک کا ماحول خوشگوار بنانے کے لیے عام معافی کا اعلان کیا گیا اور انقلابی تشدد پسندوں کو جیلوں سے رہا کر دیا گیا۔ جب تک عدم تعاون تحریک جاری رہی' یہ انقلابی تشدد پسند اسی تحریک سے اپنے آپ کو جوڑے رکھا اور پرامن احتجاج میں شامل رہے۔ لیکن فروری ۱۹۲۲ء کو عدم تعاون تحریک اچانک واپس لینے کی وجہ سے ان باہمت اور حوصلہ مند نوجوانوں کی امیدیں ٹوٹ گئیں۔ ان نوجوانوں میں اکثریت ایسوں کی تھی جو اپنی تعلیم اور گھر بار چھوڑ کر اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ ان لوگوں نے سمجھا کہ یہ تو ہمارے ساتھ ایک طرح کا دھوکہ ہوا ہے۔ ان میں سے اب زیادہ تر یہ سوچنے لگے کہ ہمارے ملک کو آزادی صرف تشدد کے ذریعہ ہی مل سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اس وقت ملک بھر میں پھیلی ہوئی مزدور تنظیموں سے بات چیت شروع کی۔ ان لوگوں کو مزدوروں کی انقلابی طاقت کا بخوبی اندازہ تھا۔ ساتھ ہی ساتھ روس کے انقلاب پسندوں سے بھی ان نوجوانوں کو حوصلہ ملا۔ چنانچہ عدم تعاون تحریک کی ناکامی کی وجہ سے انقلابی تحریک پھر دوبارہ شروع ہوئی۔ اکتوبر ۱۹۲۴ء میں ان انقلابی نوجوانوں کا کل ہند اجلاس کانپور میں ہوا اور ایک مسلح انقلاب کے لیے ''ہندوستان ری پبلکن اسوسی ایشن'' تنظیم قائم ہوئی۔ اس تنظیم کا مقصد مسلح انقلاب کے ذریعہ انگریزی حکومت کا خاتمہ تھا۔ سب سے پہلے اس تنظیم کو مالی اعتبار سے مضبوط کرنے کے لیے خزانہ کو لوٹنے کا پروگرام بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں لکھنو کے قریب کاکوری کے پاس ایک ٹرین پر حملہ کر کے سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔

کاکوری کا یہ واقعہ شمالی ہندوستان کے انقلابیوں کے لیے بہت نقصاندہ ثابت ہوا۔ پولیس نے اس معاملہ میں بڑی سرگرمی سے تفتیش کی اور بالآخر اشفاق اللہ خاں اور ان کے تمام ساتھیوں رام پرساد بسمل' روشن سنگھ اور راجیند رلائیری کو پھانسی دی گئی۔ ان کے علاوہ اس مقدمہ میں ۱۷ ملزموں کو طویل مدت کے لیے قید کی سزا ہوئی اور ۴ کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ انگریزوں کے اس ظلم وستم کے باوجود انقلابیوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے بلکہ ان میں ایک طرح سے نئی جان پڑ گئی۔ چنانچہ اتر پردیش میں چندر شیکھر آزاد اور پنجاب میں سردار بھگت سنگھ کی قیادت میں بہت سے نوجوان انقلابی تحریک میں شامل ہونے لگے۔

مختصر یہ کہ اس صدی کی تیسری دہائی کی آخری برسوں میں انقلابی تحریک اپنے عروج پر تھی اور انگریزوں کی نیندیں اڑ گئی تھیں۔ سرکار اس رجحان کو دبانے اور ختم کرنے کے لیے نہایت ہی بربریت کا مظاہرہ کیا۔ حکومت کی ظالمانہ کاروائیوں کی وجہ سے انقلابیوں کی کثیر تعداد رفتہ رفتہ ختم ہوگئی اور بہت سارے انقلابی گاندھی جی کی قیادت والی کانگریس میں شریک ہو گئے۔

سائمن کمیشن اور نہرو رپورٹ:

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جدوجہد آزادی کے لیے جو بھی تحریک منظر عام پر آئی وہ سب کی سب عدم تشدد کے اصولوں پر ہی قائم تھیں لیکن اکثر مقامات پر حکومت ہی ان تحریکوں کو تشدد کی راہ پر ڈال رہی تھی۔ حکومت برطانیہ ان حالات سے بڑی فکرمند تھی۔ ہندوستانیوں کے جذبات کو سرد کرنے کے لیے اور مزید اپنی اصلاحات کے سوال پر غور وخوض کرنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں حکومت نے اعلان کیا کہ مسٹر سائمن کو ہندوستان بھیجا جارہا ہے وہ ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد جو بھی تجویز پیش کریں گے حکومت اس پر عمل کرے گی۔ حکومت کے اس اعلان سے پورے ملک میں تہلکہ مچ گیا۔ اس کمیشن سے پورے ہندوستانیوں کے ناراض ہونے کی اصل وجہ یہ تھی کہ اس کمیشن کے تمام ممبران انگریز تھے۔ گویا انگریز یہ بتانا چاہتے تھے کہ اس بات کا فیصلہ صرف غیر ملکی کریں گے کہ آیا ہندوستان حکومت بنانے اور چلانے کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں۔

سائمن کمیشن کی آمد سے قبل ہندوستان کے تمام اخبارات نے اپنے اپنے طور پر اظہار خیال کیا۔ کمیشن کی آمد سے پہلے ستمبر ۱۹۲۷ء میں مسلمانوں کی ایک اہم جماعت جمعیۃ علماء نے اپنے اجلاس پشاور میں اس کمیشن کے تعلق سے اظہار خیال کیا اور ملک کے لوگوں کو بتایا کہ سائمن آزادی کا تحفہ لے کر نہیں آرہا ہے' اس لیے ہمارا فیصلہ ہے کہ اس کمیشن کا ہر طرح بائیکاٹ کیا جائے اور اس کمیشن سے کسی طرح کی گفت وشنید نہ کی جائے۔ اسی سال ۱۹۲۷ء میں مدراس میں ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں نیشنل کانگریس کا اجلاس ہوا جس میں کانگریس نے بھی فیصلہ کیا کہ وہ بھی ہر طرح سے کمیشن کا بائیکاٹ کرے گی۔ اس کے بعد ہندوستان کی مختلف پارٹیوں مثلاً مسلم

لیگ اور ہندو مہا سبھا نے بھی کانگریس کے فیصلے کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس طرح سائمن کمیشن کی آمد وقتی طور پر ہی سہی ملک کے مختلف گروہوں اور مختلف پارٹیوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ کمیشن کے بائیکاٹ کا اعلان اخباروں میں کر دیا گیا۔ ۳ فروری کو کمیشن دہلی پہنچا تو اس کے خلاف پورے ملک میں مظاہرے ہوئے۔ یہ کمیشن جہاں بھی گیا اس کا خیر مقدم ہڑتالوں' کالی جھنڈیوں اور سائمن واپس جاؤ کے نعروں سے ہوا۔ مظاہرہ کرنے والوں پر پولیس نے ڈنڈے برسائے اور ظلم و بربریت سے کام لیا۔ مگر بائیکاٹ کامیاب رہا اور سائمن کمیشن ناکام و نامراد انگلینڈ واپس چلا گیا۔

اسی دوران برطانیہ کے وزیر اعظم نے لندن کی پارلیمنٹ سے چیلنج کیا کہ اگر ہندوستان آزادی کا خواہش مند ہے تو اپنا ایک دستور مرتب کرے اس دستور کو منظور کر کے ان کی مرضی سے حکومت کرنے کا موقع دیں گے۔

اس چیلنج کے جواب میں اہم سیاسی کارکنوں کی بہت سی مشترکہ کانفرنسیں ہوئیں اور موتی لال نہرو کی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنائی گئی تا کہ وہ دستور مرتب کریں۔ پھر اس کو پورے ملک کے سامنے پیش کیا جائے۔ جب ملک اس دستور پر اطمینان کرے اس کے بعد حکومت کو پیش کر دیا جائے گا۔ تاریخ میں اس دستور کو نہرو رپورٹ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ دستور مرتب تو ضرور کر لیا گیا لیکن بدقسمتی سے کل ہارٹی کنونشن میں اس دستور پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا کیونکہ مسلم لیگ' ہندو مہا سبھا اور سکھ لیگ فرقہ پرست ذہنیت والے چند رہنماؤں کو اعتراض تھا۔ آخر کار کانگریس نے تنگ آ کر اپنے لاہور اجلاس میں نہرو رپورٹ کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور آزادیٔ کامل کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور اسی اجلاس میں سول نافرمانی تحریک شروع کرنے کا اعلان بھی کیا گیا۔

سول نافرمانی تحریک:

ہندوستان کی بیداری کی تاریخ میں ۱۹۲۹ء کا سال بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے کہ اسی سال جب پنڈت جواہر لال نہرو کی صدارت میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا تو پہلی

مرتبہ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی قرار دیا گیا اور سول نافرمانی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ کو مہاتما گاندھی نے اپنے ۸۹ ساتھیوں کے ساتھ سابرمتی آشرم سے ڈانڈی کی طرف مارچ کیا جو سابرمتی سے ۸۴۱ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب گاندھی نے ڈانڈی کے لیے سفر کیا تو ایک عجیب منظر تھا۔ راستے میں آنے والے گاندھی کے سینکڑوں دیہاتی افسران' مکھیا' اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے رہے تھے۔ چنانچہ ۵ اپریل ۱۹۳۰ء کو گاندھی جی ڈانڈی پہنچ گئے اور ان کی سرکردگی میں ڈنڈی کے مقام پر نمک کے قانون کی خلاف ورزی کی گئی اور ملک کے کئی ایک مقامات پر نمک کے قانون کو توڑ کر نمک تیار کیا گیا۔ گاندھی جی کا اشارہ پا کر لوگوں نے سول نافرمانی تحریک کا آغاز کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔ اس تحریک کے تعلق سے پبن چندر لکھتے ہیں:

''عوام ہڑتالوں اور مظاہروں میں شامل ہونے لگے۔ بدیشی اشیاء کا بائیکاٹ کرنے لگے اور لگان دینے سے انکار کرنے لگے۔ اب لاکھوں ہندوستانی ستیہ گرہ کر رہے تھے۔ ملک کے اکثر علاقوں میں کسانوں نے زمین کا لگان اور کرایہ دینے سے انکار کر دیا۔ یہاں تک کہ ان لوگوں کی زمینیں ضبط ہوگئیں۔ اس تحریک کا ایک قابل توجہ پہلو یہ تھا کہ اس میں عورتیں بڑی تعداد میں شریک تھیں۔ ہزاروں خواتین اپنے گھروں کی محفوظ چار دیواری سے نکل کر ستیہ گرہ کر رہی تھیں۔ پوری سرگرمی سے بدیشی کپڑے اور شراب فروخت کرنے والی دکانوں پر دھرنے دے رہی تھیں اور جلوسوں میں مردوں کے شانہ بہ شانہ مارچ کر رہی تھیں''(8)

حکومت نے شروع شروع میں تحریک کی سرگرمیوں کو نظر انداز کیا لیکن بعد میں اس نے سخت سے سخت سزا دینے کا فیصلہ کیا۔ اور ہمیشہ کی طرح ظلم و تشدد کا سہارا لیا۔ بے گناہ مردوں اور عورتوں پر لاٹھی برسائے گولیاں چلائیں اور ۹۰ ہزار سے زیادہ ستیہ گرہوں کو قید کر لیا گیا۔ ان میں گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے بہت سے رہنما شامل تھے۔

پہلی گول میز کانفرنس:

سرکار انگریزی نے یہ دیکھ کر کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ سے کوئی بھی سیاسی طبقہ مطمئن نہیں

ہوا اور ملک میں ایک طرح سے زبردست ہلچل مچ گئی تو ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ لندن میں ہندوستانی رہنماؤں اور انگریز سرکار کے نمائندوں کی گول میز کانفرنس منعقد کی تا کہ ہندوستان کے آئین حکومت پر غور کیا جائے لیکن نیشنل کانگریس نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اور اس کی کاروائی نامکمل ثابت ہوئی اور اسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔

گاندھی ارون سمجھوتہ:

پہلی گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد سرکار نے کانگریس سے معاہدہ کرنے کی کوشش کی تا کہ وہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے پر راضی ہو جائے۔آخر کار ۱۹۳۱ء میں مہاتما گاندھی اور لارڈ ارون کے درمیان ایک سمجھوتہ قرار پایا۔ جسے گاندھی ارون پیکیٹ کہتے ہیں۔اس سمجھوتہ کی وجہ سے سرکار ان سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے پر تیار ہوگئی جو جیلوں میں بھی عدم تشدد پر عمل پیرا تھے۔اس نے اپنے استعمال کے لیے نمک بنانے کے عوام کے حق کو اور بدیشی کپڑے اور شراب کی دکانوں پر پرامن طریقے سے دھرنے دینے کے عوام کے حق کو تسلیم کرلیا۔ چنانچہ گاندھی جی نے اس کے مطابق سول نافرمانی تحریک کو بند کر دیا اور دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونا منظور کرلیا۔

دوسری گول میز کانفرنس:

پہلی گول میز کانفرنس میں کانگریس پارٹی شامل نہیں ہوئی تھی اور چونکہ کانگریس ہندوستان میں سب سے زیادہ بارسوخ جماعت تھی اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کو بلایا جائے۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے انگلستان گئے لیکن اس کانفرنس میں برطانوی سرکار بنیادی قومی مطالبہ منظور کرنے کو ہرگز تیار نہیں ہوئی اور نہ ہی مذہبی فرقہ وارانہ مسئلہ سے متعلق کوئی فیصلہ ہوا۔آخر کار ان باتوں کا فیصلہ وزیر اعظم مسٹر ریمزے مبکڈ النڈ پر چھوڑ دیا گیا اور مہاتما گاندھی کو انگلستان سے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔

سول نافرمانی کا دوسرا مرحلہ

۱۹۳۰ء میں ارون پیکٹ کے بعد عارضی طور پر سول نافرمانی کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا تھا لیکن مہاتما گاندھی کی ابھی ہندوستان واپسی ہی نہیں تھی کہ حکومت نے ارون پیکٹ کی خلاف ورزی شروع کر دی تھی۔ بنگال، یو پی اور صوبہ سرحد میں لوگوں پر تشدد اور ظلم و بربریت کا آغاز ہو چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان انگریزی سرکار کی سربراہی نئے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کے ہاتھ میں تھی اور اس کی نظر میں کانگریس سے سمجھوتہ کرنا بہت بڑی غلطی تھی۔ لہذا گاندھی جی جب ہندوستان آئے تو وائسرائے سے ملاقات کا وقت مانگا مگر ادھر سے جواب انکار میں آیا۔ چنانچہ گاندھی جی نے مجبور ہو کر سول نافرمانی کا دوسرا دور شروع کر دیا۔ مگر اس دفعہ سول نافرمانی تحریک الگ ہی قسم کی مصیبت لے کر آئی۔ ۴ جنوری ۱۹۳۲ء کو گاندھی جی اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کو حراست میں لے لیا گیا اور کانگریس کو غیر قانونی جماعت قرار دیا گیا۔ انگریزوں کی پولیس نے گھناؤنے مظالم کا سہارا لے کر آزادی کے متوالوں کے ساتھ ظلم و ستم کرنا شروع کر دیا۔ اب جو شخص گرفتار ہوتا تو اس کو جیل کی سزا کے ساتھ ساتھ اس کی جائیداد بھی ضبط کر لی جاتی تھی یا ان کے اوپر بڑے بڑے جرمانے عائد کئے جاتے۔ نہ دینے کی صورت میں حکومت ان کی جائیدادوں کو نیلام کر دیتی تھی اور مجاہدین آزادی کے اہل و عیال نان شپن ہ کے محتاج ہو جاتے تھے۔

آخر کار سرکار کے ظلم و ستم کی جیت ہوئی۔ ہندوستانی رہنماؤں کے درمیان فرقہ پرستی کے سوال اور دوسرے متعدد اہم معاملات میں اختلافات رائے ہونے کی وجہ سے سرکار کے ہاتھ مضبوط ہو گئے تھے۔ اس طرح سول نافرمانی تحریک کمزور ہوتی چلی گئی۔ آخر مئی ۱۹۳۳ء میں کانگریس کے حکام نے اس تحریک کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کے ذریعہ تحریک آزادی کے حصول میں کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔ لیکن اس نے لوگوں کے سیاسی شعور کو اور زیادہ گہرا کر دیا تھا اور تحریک آزادی کی سماجی جڑیں اور زیادہ مضبوط ہو گئیں تھیں۔ چنانچہ اس تحریک کے اثرات کے

تعلق سے پروفیسر ظفر احمد نظامی لکھتے ہیں:

''تحریک سول نافرمانی نے لوگوں کو نڈر بنا دیا اور ان کے اندر ایثار و قربانی کا مادہ پیدا کر دیا جس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اس تحریک میں خواتین نے شریک ہو کر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہیں۔ اس تحریک میں 1920ء کی تحریک عدم تعاون سے زیادہ لوگ شریک ہوئے۔ ان میں سیاسی شعور پیدا ہوا اور ملک کے ہر طبقہ کے افراد نے اس میں حصہ لیا۔''(9)

قومی تحریک ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء ۳ر ستمبر ۱۹۳۹ء کو یورپ میں دوسری عالمگیر جنگ شروع ہوئی اور تقریباً چھ سال بعد اگست ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔ انگریزی سرکار نے ہندوستانی رہنماؤں سے مشورہ کئے بغیر ہندوستان کو اس جنگ میں شامل کر دیا۔ کانگریسی رہنماؤں نے حکومت کے اس فیصلہ کو پسند نہیں کیا۔ کانگریس رہنماؤں کا کہنا تھا کہ ایک قوم جو خود غلام ہو دوسرے کی آزادی کی جدوجہد میں کیسے مدد کر سکتی ہے۔ اس لیے انہوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے ہندوستان کو آزادی کا پروانہ دے دیا جائے تا کہ کانگریس اس جنگ میں سرگرم حصہ لے سکے۔ مگر سرکار نے ان کی مانگ کو تسلیم نہیں کیا۔ تب کانگریس نے اپنے وزیروں کو استعفے دینے کا مشورہ دیا، انجام کار تمام کانگریسی وزرائیں مستعفی ہو گئیں اور ان کی جگہ پر صوبوں میں گورنر راج کا نفاذ ہو گیا تاہم کانگریس نے کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جس سے جنگی سرگرمیوں میں کسی قسم کی رکاوٹ پڑے۔

برطانوی سرکار کو اس وقت جنگی سرگرمیوں میں ہندوستانیوں کے بھرپور تعاون کی اشد ضرورت تھی۔ اسی پس منظر میں مارچ ۱۹۴۲ء میں حکومت برطانیہ نے انگلینڈ کے ایک مشہور سیاست داں سر سٹیفورڈ کرنس کو ایک اسکیم دے کر ہندوستان بھیجا۔ چنانچہ ۲۲ر مارچ ۱۹۴۲ء کو ہندوستان آئے۔ انہوں نے کئی ایک لیڈروں سے تبادلۂ خیال کیا لیکن اس کی پیشکش تسلی بخش نہ تھی۔ اس میں صرف یہ وعدہ کیا گیا تھا جنگ ختم ہونے پر ہندوستانیوں کو کچھ حقوق دیئے جائیں گے۔ لیکن سردست ہندوستانیوں کو بھی اختیار منتقل نہ کئے گئے تھے چنانچہ کانگریس اور لیگ دونوں نے اس اسکیم کو نا منظور کر لیا۔ اسی طرح ۱۲ر اپریل ۱۹۴۲ء کو کرپس ایک مایوس شخص کی طرح

انگلستان پہنچ گئے ۔اپریل سے اگست ۱۹۴۲ء کا دور دن رات بڑھتے ہوئے تناؤ اور بے چینی کا دور تھا۔ جیسے جیسے جاپانی فوجیں ہندوستان کی طرف بڑھ رہی تھیں ویسے ویسے گاندھی جی زیادہ سے زیادہ انقلابی پالیسی اپنا رہے تھے ۔ادھر کانگریس نے بھی فیصلہ کیا اب پوری طاقت کے ساتھ برطانیہ پر زور ڈالا جائے کہ وہ ہندوستانیوں کا آزادی کا مطالبہ تسلیم کرے۔ ۸/اگست کو کل ہند کانگریس ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں کمیٹی کی بیٹھک ہوئی اور اسی بیٹھک میں ہندوستان چھوڑو تحریک پاس ہوئی اور یہ طئے کیا گیا کہ اس مقصد کے لیے گاندھی جی کی رہنمائی میں عدم تشدد پر مبنی عوامی تحریک شروع کی جائے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک

ہندوستان چھوڑو تحریک ہندوستانیوں کی بہادری ، دلیری اور عزم کی بے نظیر مثال ہے دوسری طرف حکومت نے بھی جنگ کا بہانہ بنا کر ظلم وستم اور سختی کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی ۔ مارچ ۱۹۴۲ء میں کرپس مشن کی ناکامی کے بعد کانگریسی رہنماؤں کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ حکومت ان سے کوئی باوقار سمجھوتہ نہ کرنے کے لیے راضی نہیں ،اس لیے ۸/اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بیٹھک ہوئی اور اس میں فیصلہ کیا گیا کہ انگریزوں کو الٹی میٹم دے دیا جائے کہ وہ بہت جلد اپنے ناپاک قدم سے ہندوستان کو چھوڑ دیں ۔

مہاتما گاندھی کا خیال تھا کہ انگریزوں کی ہندوستان میں موجودگی جاپان کے لیے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت ہے ۔اگر انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو جاپان کا خطرہ ٹل سکتا ہے ایسے حالات میں گاندھی جی نے کرو یا مرو کا نعرہ دیا گاندھی جی کے اس نعرے کا اثر بجلی کی طرح ہے اور انگریزوں سے کہا کہ وہ ہندوستان کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلے جائیں ۔ان کے چلے جانے کے بعد جو حالات پیش آئیں گے اس سے ہندوستانی خود بخود نمٹ لیں گے ۔لیکن کانگریس نے ابھی تحریک کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ حکومت نے ۹ /اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس کے تمام بڑے لیڈروں کو گرفتار کرلیا اور ان کو کسی نامعلوم مقام پر بھیج دیا گیا اور کانگریس کو ایک دفعہ پھر غیر قانونی قرار دیا گیا۔

حکومت کے اس نادر شاہی عمل سے پورا ہندوستان غم وغصہ سے بے قابو ہو گیا۔اس تعلق سے مشہور مورخ پپن چندرا لکھتے ہیں:

''ان رہنماؤں کے قید کی خبر سن کر پورا ملک حیران وششدر رہ گیا اور ملک میں جگہ جگہ بے ساختہ احتجاجی تحریک ابھریں اور لوگوں کے غصے اور نفرت کی دبی ہوئی چنگاری کی نقیب بن گئی ۔عوام کے پاس نہ اب کوئی تنظیم تھی نہ راہ نما تھے اسی لیے لوگ طرح طرح سے اپنے غصے کا اظہار کر رہے تھے ملک بھر میں ہڑتالیں ہو رہی تھیں ۔جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے تھے جگہ جگہ مظاہرہ کرنے والوں پر لاٹھی چارج ہو رہا تھا۔گولیاں چل رہی تھیں آئے دن کے ظلم وستم، لاٹھی چارج اور فائرنگ کی وجہ سے عوام جگہ جگہ سختی اور مار پیٹ بھی کر رہے تھے۔وہ انگریز اقتدار کی علامتوں مثلاً پولیس اسٹیشنوں' پوسٹ آفسوں' اور ریلوے اسٹیشنوں وغیرہ پر حملے کر رہے تھے ۔ٹیلی گراف اور ٹیلی فون کے تار کاٹ رہے تھے اور سرکاری عمارتوں میں آگ لگا رہے تھے۔ مدراس اور بنگال میں جوش کا اثر سب سے زیادہ تھا اکثر جگہوں پر باغیوں نے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں پر وقتی طور پر قبضہ کر لیا تھا۔اتر پردیش بہار، مغربی بنگال، اڑیسہ، آندھرا، تمل ناڈو اور مہاراشٹرا کے بعض علاقوں میں مثلاً مشرقی یوپی میں بلیا، بنگال میں مدنا پور ضلع کے تاملوک اور بمبئی کے ستارا ضلع میں تو انقلابیوں نے متوازی حکومت قائم کر لی تھی''(10)

اس طرح ہندوستانیوں نے اپنے جذبات کا اظہار کر کے اپنے قومی لیڈروں سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا۔حکومت کے اس طرز عمل سے مسلمانوں کو بھی اتنا ہی غصہ تھا جتنا دوسرے برادران وطن کو تھا۔ادھر برطانوی سرکار نے اس تحریک کا سر کچلنے کا ارادہ کر لیا۔چنانچہ فوج نے جہاں کہیں مجمع دیکھا۔عوام کی بھیڑ نظر آئی۔رائفل سیدھی کی اور عوام کو بھون کر رکھ دیا۔یہاں تک کہ ہوائی جہاز سے بم برسائے گئے۔ہر طرف پولیس اور خفیہ پولیس کا راج تھا۔جگہ جگہ پولیس اور فوج کی فائرنگ میں دس ہزار سے زائد ہندوستانی مارے گئے۔۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد سے آج تک ہندوستانیوں نے ظم وستم کا ایسا منظر نہیں دیکھا تھا۔انجام کار حکومت اس تحریک کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔لیکن اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا ہے کہ اس تحریک نے یہ ثابت کر دیا کہ ملک میں قوم پرستی کا جذبہ کس قدر ہے اور اب یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ

انگریزی حکومت کے دن جا چکے ہیں اب ہندوستانی عوام کی خواہش کے خلاف انگریز ہندوستان پر زیادہ دن تک حکومت نہیں کر سکتے ہیں۔

آزاد ہندفوج

دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ یک بیک یہ خبر ملی کہ سبھاش چندر بوس جو تاریخ میں نیتا جی کے نام سے مشہور ہیں۔غائب ہو گئے' سبھاش چندر بوس ہندوستان کے سچے بھگت تھے۔آپ کا تعلق بنگال سے تھا انگریزی سرکار نے انہیں ان کے مکان واقع کلکتہ میں نظر بند کر رکھا تھا۔جنوری ۱۹۴۱ء کو آپ اچانک اپنے مکان سے لاپتہ ہو گئے اور بھیس بدل کر افغانستان اور روس ہوتے ہوئے جرمنی کی راجدھانی برلن جا پہنچے ان کا مقصد جرمنی اور جاپان کی مدد سے ہندوستان کو انگریزی حکومت سے آزاد کرانا تھا۔ برلن سے ۱۹۴۳ء میں آپ ملایا اور سرماجا پہنچے ان علاقوں پر جاپان قابض ہو چکا تھا اور جاپانیوں نے بہت سے انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہیوں کو گرفتار کر رکھا تھا۔

نیتا جی نے ملایا میں ان ہندوستانی سپاہیوں کی ایک با قاعدہ فوج تیار کی اور اس کا نام انڈین نیشنل آرمی (INA) یا آزاد ہندفوج رکھا اور اس فوج میں قومیت کا ایسا جذبہ بھر دیا کہ وہ سب فرقہ وارانہ اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر ہندوستان کی آزادی کے لیے مر مٹنے کو تیار ہو گئے ان کا گیت تھا۔

قدم قدم بڑھائے جا خوشی کے گیت گائے جا
یہ زندگی ہے قوم کی تو قوم پر لٹائے جا

انہوں نے آسام میں انگریزی فوج کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا ان کا نعرہ تھا ''دی چلو'' لیکن انگریزی فوج بہت زیادہ تھی اس لیے آزاد ہندفوج کامیاب نہ ہوئی۔ برما پر انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد آزاد ہندفوج کے بہت سے سپاہی اور افسر پکڑے گئے اور ہندوستان میں نظر بند کئے گئے کئی ایک پر مقدمے بھی چلائے گئے بغاوت کا جرم واضح تھا۔لیکن انقلابی ہندوستان اتنا طاقتور ہو چکا تھا کہ ان بہادروں کو پھانسی دینے کی ہمت انگریز نہیں کر سکتے تھے۔کہتے ہیں نیتا جی اگست ۱۹۴۵ء میں ٹوکیو جاتے ہوئے ایک ہوائی حادثہ میں وفات پا گئے

۔اگر چہ آزاد ہندفوج اپنے مقصد میں کامیاب تو نہیں ہوئی تاہم اس کی سرگرمیوں نے ہندوستان کی آزادی کو بہت نزدیک کر دیا۔اب سرکار کو یقین ہوگیا کہ وہ ہندوستانی فوج کی وفاداری پر یقین نہیں کرسکتی اور وہ اب زیادہ دنوں تک ہندوستان پر حکومت بھی نہیں کرسکتی ہے۔

آزادی اور تقسیم وطن

۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ملک کو انگریزوں سے آزاد کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد جاری رہی۔آزادی کے متوالے نے ہر موقع پر وطن کی محبت میں سرشار قربانی دیتے رہے۔جس کے نتیجہ میں ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو انگلینڈ کی پارلیمنٹ نے ہندوستان کی آزادی کا قانون پاس کر دیا۔لیکن یہ آزادی اپنے ساتھ تقسیم وطن کا سانحہ بھی لے کر آئی۔برطانوی حکومت نے مسلم لیگ کے بار بار مطالبہ پاکستان کی وجہ سے آزادی سے پہلے ہی ملک کو تقسیم کر دیا۔اس طرح نوے سال کی طویل مسافت طے کرتے ہوئے کاروان آزادی رات کے بارہ بجے اپنی منزل پہ پہنچ گیا اور جس وقت پورا ہندوستان محو خواب تھا ہندوستان کا مقدر چمک اٹھا اور ہندوستانی وقت کے مطابق ٹھیک بارہ بجے ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا۔

معاشی پس منظر

انگریز ہندوستان کی وسیع وعریض سلطنت پر قابض ہونے کے بعد اس بات کو ضروری سمجھا کہ وہ تمام پالیسیاں اپنائی جائیں جس سے اس ملک پر ہمارا کنٹرول باقی رہے۔اس سلسلہ میں انگریزوں کو اپنے نظم ونسق میں بہت سی تبدیلیاں کرنی پڑیں لیکن کمپنی نے اپنے بنیادی مقاصد سے کبھی لاپرواہی اس کے بنیادی مقاصد تھے کمپنی کے مفادات کو ہر طرح ترقی دینا ہندوستانی دولت اور مقبوضات کے ذریعہ برطانیہ کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا۔ان کے علاوہ جو دیگر مقاصد تھے وہ سب ضمنی تھے۔

انگریزوں سے پہلے بہت سے فاتحین نے بھی ہندوستان کا تختہ پلٹا اور یہاں پر اپنی حکومت قائم کی لیکن ہندوستان کا جو معاشی ڈھانچہ تھا اس میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی اس لیے کہ انہوں نے ہندوستان کو فتح کیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان کی معاشی زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔نتیجتاً

ہمارے ملک کا کسان، دستکار اور تاجر پہلے ہی جیسی زندگی بسر کرتا رہا۔لیکن انگریز فاتح سب سے مختلف تھا۔اس نے ہندوستانی معیشت کے ڈھانچہ کو بالکل بدل دیا۔مشہور مورخ پپن چندرا لکھتے ہیں:

''ہندوستان پر انگریزوں کے اقتدار کے معاشی اثرات بہت زیادہ نمایاں ہیں۔انگریزوں کے دور حکومت میں شروع سے لیکر ۱۹۴۷ء تک ہندوستانی معیشت کے تقریباً سبھی میدانوں میں تبدیلیاں آئیں کچھ بہتر ہوئے کچھ بدتر،لیکن تبدیلی سبھی میں آ گئی۔(11)

۱۸۵۷ء کی مشہور بغاوت جن کو ہم ہندوستانی آزادی کی پہلی باضابطہ جنگ مانتے ہیں ۔اس کے جہاں بہت سارے اسباب تھے ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریز ہمارے ملک کو معاشی اعتبار سے مسلسل لوٹ رہے تھے اور اس صورت حال نے سماج کے ہر طبقے کسانوں، دستکاروں اور کاریگروں کی بڑی اکثریت کو غربت وافلاس کے عمیق غار میں ڈھکیل دیا تھا۔انگریزوں کا کام تھا ہندوستان کے ذرائع کو لوٹنا ہندوستان کی دولت اکٹھا کر کے اپنے ملک میں بھیجنا،اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستانی معیشت برطانیہ کے معاشی اور صنعتی مفادات کے تابع تھی اور اس کے اثرات مختلف قسم کے تھے۔

دستکاروں اور کاریگروں کی تباہی

ہندوستان کی تیسری دستکاری پوری دنیا میں مشہور تھی ۔یہاں کے بنے ہوئے سامان خصوصاً سوتی کپڑے مہذب دنیا کی منڈیوں میں چھائے ہوئے تھے لیکن انگریزوں کے دور اقتدار میں ملک کی دست کاری تباہ ہو چکی تھی ہندوستان کی تیسری دست کاری کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کی بددعا لگ گئی ہے اس بربادی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ اب ہندوستان میں برطانیہ کی مشینوں سے بنی ہوئی اشیاء کم داموں پر ملنا شروع ہوگئی تھیں۔خاص طور سے برطانیہ کی صنعتی پیداوار اور سوتی کپڑوں کا ایک طوفان آ گیا تھا۔ادھر ہندوستان میں روایتی طریقے پر بنا ہوا سامان برطانیہ کی جدید مشینوں سے بنی ہوئی مصنوعات کا مقابلہ نہیں کر سکا۔

انگریزوں نے جب اپنے مفاد کے لیے ہندوستان میں ریلوں کا جال بچھایا اسی وقت یہ

صنعتی تباہی اور بربادی عروج کو پہنچ گئی ریلوں کی وجہ سے برطانیہ کی مصنوعات ہندوستان کے دوردراز علاقوں میں بآسانی پہنچنا شروع ہوگئیں نتیجہ یہ نکلا کہ ہرجگہ سے روایتی صنعت اوراس کی پیداوار کے جنازے نکل گئے۔

اس تباہی وبربادی کی شکار خاص طور سے سورت کی کٹائی اور بنائی کی صنعت ہوئی۔ساتھ ہی ساتھ ریشمی روٹی اور کپڑوں کی بھی حالت بہت اچھی نہیں تھی اور دیکھتے دیکھتے لوہے کی صنعت ،مٹی بنانے کے کارخانے ، بندوق سازی اور چمڑے وغیرہ کی رنگائی کی صنعتوں کا بھی یہی حال ہوا۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ہندوستان کی صنعت کی تباہی وبربادی کی اصل وجہ بدیشی اشیاء کی بہتات ہے اوروہ بھی بہت کم داموں پرلیکن اس کے علاوہ بھی کچھ عوامل ہیں جنہوں نے ہندوستانی صنعتوں کو تباہ کردیا۔مثلا اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں انگریزوں نے بنگال کے دست کاروں پر بے پناہ ظلم ڈھائے اورانہیں مجبورکرکے بہت کم داموں پرسامان خریدااور بہت کم مزدوری دیکران سے کام کرایاچنانچہ انگریزوں کے اس رویہ سے یہ لوگ اپنا آبائی پیشہ چھوڑنے پرمجبورہوگئے۔

دوسری بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے اٹھارہویں اورانیسویں صدی میں ہندوستانی مصنوعات کی انگلستان اور یورپ میں درآمدات پر بہت زیادہ ٹیکس لگا دیا تھا دوسری طرف انگلستان میں جدیدصنعتوں کی خوب ترقی ہوگئی نتیجہ یہ نکلا کہ۱۸۲۰ء کے بعد یورپ کی منڈیوں کے دروازے ہندوستانی مصنوعات کے لیے بند ہوگئے۔تیسری وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی حکمراں اور ان کے درباری ہندوستانی دستکاری کے بہت بڑے خریدار تھے۔انگریزوں کے اقتدار کی وجہ سے یہ حکمراں اوران کے درباری ختم ہوگئے تو ان صنعتوں کو بہت نقصان پہنچا۔مثلا ہندوستانی لوگ جوفوجی ہتھیار تیارکرتے تھےان ہتھیاروں کوصرف ریاستی حکمران ہی خریدتے تھے جب کہ انگریزاپنے سارےفوجی سامان اوردیگراشیاءانگلستان سےخریدتے تھےاوروہ لوگ صرف اور صرف اپنے ملک کی پیداوارکوہی بڑھاوادیتے تھے۔

ہندوستان میں ایک طرف تو روایتی صنعتوں کو زوال کا شکار ہونا پڑا لیکن اس کا کوئی معقول بدل نہیں مل سکا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جیسے ہی اپنی صنعت انحطاط کا شکار ہوئی جدید مشینی صنعت کی ترقی کی ہوتی لیکن ایسا نہ ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ جدید مشینی صنعت کی عدم موجودگی میں تباہ حال دست کاروں اور کاریگروں کو دوسری ملازمت نہیں مل سکیں۔ لہٰذا وہ مجبور ہوکر زراعت کی طرف پلٹے اور اس کا نتیجہ بہت خراب سامنے آیا اس لیے کہ پہلے ہی سے ایک طرف کروڑ وہ کسان تھے جو خالی اوقات میں کٹائی اور بنائی کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی صرف کاشتکاری پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوگئے دوسری طرف یہ پریشان حال دستکار جب کاشتکاری کی طرف لوٹ گئے تو اس طرح زمین اور زراعت کا توازن بگڑ گیا۔ اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کی فتح نے جہاں بہت سی تباہی و بربادی لائی وہیں پر ملک کی صنعت وحرفت کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا اب زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو مجبوراً زراعت کا پیشہ اپنانا پڑا۔ انیسویں صدی سے پہلے کے اعداد وشمار تو نہیں ملتے لیکن مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۴۱ء سے ۱۹۹۱ء تک کے مختصر سے عرصہ میں زراعت پر بھروسہ کرنے والی آبادی ۶۳۵۷ سے بڑھ کر 70 فیصدی تک پہونچ گئی۔ زراعت پر اس قدر بوجھ پڑنے کی وجہ سے ہندوستانیوں کی غربت اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور وہی ہندوستان جو صدیوں تک دنیا بھر میں سوتی کپڑے کی برآمدات کرنے میں مشہور تھا۔ اسی ہندوستانی میں ایسی تبدیلی آئی کہ اب وہ مجبور ہوکر برطانیہ کے سوتی کپڑے کی درآمدات کرنے لگا اور اپنا خام مال ملک سے باہر بھیجنے لگا۔

کسانوں کی غربت اور تباہ حالی

انگریزوں کے دور حکومت میں کسانوں کی حالت ناقابل بیان تھی کسانوں کی مادی حالت بری سے بری تر ہوتی گئی اور دھیرے دھیرے غربت وافلاس کے دلدل میں ایسے پھنس گئے تھے کہ اس سے نکلنا بہت مشکل تھا۔ انگریزوں کے دور حکومت کا کسان ایسی ناگفتہ بہ حالت کا شکار کیوں ہوا اس کی وضاحت سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت مال گذاری سے متعلق

انگریزی حکومت کی کیا پالیسی تھی اس کی قدرے تفصیل بیان کردی جائے تا کہ صورتحال کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

ہندوستان میں زرعی فصلوں پر مال گزاری اصول کرنے کا حق حکومت کو حاصل رہا ہے۔ انگریزوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے مال گذاری وصول کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ مقامی افسر جنہیں زمین دار کہا جاتا ہے وہ کسانوں سے وصول کر کے اس کا کچھ حصہ کمیشن کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتے تھے اور باقی رقم کو سرکاری خزانہ میں داخل کر دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ زمین داری کا عہدہ موروثی ہو گیا۔

انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں بھی کچھ دنوں تک اسی نظام کو باقی رکھا چنانچہ ۱۷۶۵ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو مل گئی تو کلایو نے مالگزاری اصول کرنے کا سابقہ طریقہ ہی باقی رکھا اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی مگر وارن ہنسٹنگز نے آمد بڑھانے کی غرض سے زمین ٹھیکے پر دینی شروع کر دی۔ یعنی جو شخص زیادہ بولی بولے وہ زمین دار مقرر ہو جائے۔ پہلی بار ۱۷۷۲ء میں یہ ٹھیکہ پانچ سال کے لیے دیا گیا اس کے بعد پھر سالانہ کر دیا گیا۔ مگر اس نظام میں کئی ایک نقائص تھے مثلاً زمین دار نیلامی کے وقت اتنی زیادہ بولی بول دیتے تھے کہ اس رقم کو زمین کی آمدنی سے پورا نہیں کر پاتے تھے دوسرے یہ کہ زمین دار سوچتا تھا کہ نامعلوم اگلے سال یہ زمین مجھے ملے یا نہ ملے اس لیے اس حالت بہتر سے بہتر بنانے کی کوئی فکر نہیں ہوتی تھی۔ اس طرح بہت سا حصہ بنجر میں بدل گیا تیسرے یہ کہ ہوسکتا ہے زمین کی حالت بہتر ہو جائے تو سرکار لگان کی رقم ٹھیک کر دے۔ اور ایک طرح سے حکومت کی آمدنی غیر یقینی ہو گئی تھی چنانچہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے اس طریقہ کو ناپسند کیا۔ جب لارڈ کارنٹس جس کا نام اصلاحات کی وجہ سے خاص طور پر مشہور ہے۔ ہندوستان کا گورنر جنرل بن کر آیا تو بڑے غور وخوض کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ زمین کی حالت بہتر بنانے اور کمپنی کی آمد کو یقینی بنانے ے لیے یہ ضروری ہے کہ زمین داروں کو اس امر کا یقین دلایا جائے کہ زمین ہمیشہ ان کے پاس رہے گی اور زمین کی حالت بہتر بنانے کی صورت میں لگان نہیں بڑھایا جائے گا چنانچہ ۱۷۹۳ء میں لارڈ کارنوالس نے زمین

ہمیشہ کے لیے زمین داروں کی ملکیت قرار دے دی اور سرکاری لگان بھی ہمیشہ کے لیے ایک مقرر کر دیا اسی طریقہ کو بندوبست استمراری کہتے ہیں۔

بندوبست استمراری

لارڈ کارنوالس نے کمپنی کی بڑھتی ہوئی مال کی ضرورت کے تحت مستقل طور پر مال گزاری کی رقم طئے کرنے کا فیصلہ کیا۔سب سے پہلے اس نے ۱۷۹۳ء میں بنگال اور بہار میں بندوبست استمراری کا آغاز کیا۔اس بندوبست استمراری سے زمینداروں کو بہت فائدہ ہوا اس میں وہ لوگ اپنی زمین داری میں پوری طرح زمین کے مالک تھے اور اس نظام نے انہیں موروثی جاگیردار بنا دیا مگر کاشتکاروں کی حالت بد سے بدتر ہوگئی کیوں کہ اس میں کوئی پابندی نہیں تھی کہ جاگیردار کاشت کاروں سے کتنی رقم وصول کریں اس طرح اس نظام نے کسانوں کو پست حیثیت سے ہمکنار کر دیا۔اب وہ صرف کرایہ دار بن کر رہ گئے انہیں اپنے حق ملکیت سے دست بردار ہونا پڑا۔وہ زمین دار کے رحم وکرم پر تھا جو لگان کی رقم بڑھاتا چلا جارہا تھا اور غیر قانونی محصول ادا کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ان سے زبردستی محنت یا بیگار کراتا تھا' ان پر نہ جانے کس کس طرح کے ظلم وستم کرتا رہتا تھا۔

رعیت واڑی نظام

یہ نظام ہندوستان کے جنوب مدراس اور بمبئی میں متعارف کیا گیا۔دراصل ، یہاں پر استمراری بندوبست کے تحت رقوم نہیں وصول کی جاتی تھیں کیوں کہ کمپنی کا اس سے نقصان ہوتا تھا اس لیے ان علاقوں میں رعیت واڑی نظام قائم کیا گیا۔اس نظام کے تحت کسان کو ہی لگان کی ادائیگی پر زمین کا مالک قرار دیا جاتا تھا۔اس نظام نے بھی کسان کو حق ملکیت نہیں دیا۔صرف اتنا ہوا کہ بہت سے زمین داروں کی جگہ ایک بڑے زمین دار یعنی ریاست کو دے کر اس کی حیثیت زمین پر ایک کرایہ دار کی کر دی اگر اس نے وقت پر لگان کی رقم ادا نہیں کی تو اس کو اپنی زمین سے محروم ہونا پڑتا تھا۔یہاں زمین دار کے بجائے سرکار کا زور چلتا تھا اور وہ کسان سے طئے شدہ لگان بہت زیادہ ، وصول کرتی تھی۔زمین کا لگان شروع میں پیداوار کے ایک تہائی سے نصف

تک طئے پایا تھا۔زمین کا مطالبہ سال بہ سال بڑھتا ہی گیا۔اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ زمین سے حاصل کردہ لگان کی رقم ۵۔۱۸۵۷ء میں ۱۵ کروڑ ۳۰/لاکھ روپئے تھی لیکن بڑھتے بڑھتے ۷۔۱۹۳۶ء میں ۳۵ کروڑ ۸۰ لاکھ روپئے تک پہونچ گئی تھی۔

محل واڑی نظام

یہ نظام دیکھا جائے تو ایک طرح زمین داری کی بدلی ہوئی شکل تھی۔اس نظام کو وادیٔ گنگا کے شمال مشرقی صوبہ جات، وسط ہند اور پنجاب میں رائج کیا گیا تھا۔اس نظام کے تحت کمپنی نے ملک بھر میں زمین کو قابل فروخت اور قابل رہن قرار دیا تا کہ حکومت کے لگان کا تحفظ ہو سکے ۔اب اگر کسان چاہتا تو اپنی مرضی سے مال گذاری ادا کرنے کے لیے زمین کے عوض قرض لے سکتا تھا اور اپنی زمین کو فروخت کرسکتا تھا اور عدم ادائیگی کی صورت میں حکومت اس زمین کو نیلام بھی کرسکتی تھی۔غرض محل واڑی علاقوں میں بھی کسان کی حالت بہتر نہیں تھی۔

رعیت واڑی اور محل واڑی علاقوں کا کسان رفتہ رفتہ قرض کے جال میں زیادہ سے زیادہ جکڑتا چلا گیا اور اس کی زمین کا ایک بہت بڑا حصہ ساہوکاروں کے ہاتھوں چلا گیا جس سے وہ برے وقت قرض لیتا تھا۔فصل کی کمی اور قحط کے زمانے میں کسانوں کے ہاتھوں سے زمین نکل جانے کا عمل اور تیز ہو جاتا تھا۔ہندوستانی کسان برے وقت کے لیے کچھ بھی نہیں بچا پاتا تھا ۔لہٰذا فصل جب کبھی خراب ہو جاتی تو اسے جہاں لگان ادا کرنے کے لیے ساہوکاروں سے قرض لینا پڑتا تھا وہیں پر اپنے بیوی بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ساہوکاروں کے سامنے قرض کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ساہوکار کی سود کی شرح بہت زیادہ ہوتی تھی۔پھر وہ چالاکی اور دھوکہ دھڑی کے سہارے غلط حساب کر کے کسان کو پوری طرح قرض کے جال میں جکڑ لیتا تھا انجام کار کسان کو اپنی زمین سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔اس طرح بہت سے کسان زمین سے محروم ہو گئے۔ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ کسان طبقہ نہ صرف سرکار بلکہ زمین دار، ساہوکار ان تینوں کے ہاتھوں بری طرح ظلم وستم کا شکار رہا۔بقول مشہور مورخ بپن چندرا:

''ان تینوں شیطانوں کو ان کا حصہ دینے کے بعد کسان کے پاس اپنا اور اپنے گھر والوں کا

پیٹ بھرنے بھر بھی نہ بچتا تھا۔اعداد وشمار کے مطابق ۵۱۔۱۹۵۰ء میں زمین کے لگان اور ساہوکار کے سود کی رقم ارکھرب ۴۰؍ارب روپئے تھی یعنی اس سال کی کل زرعی پیداوار کا تقریباً ایک تہائی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں کی غربت بھی بڑھتی گئی اور اس کے علاوہ قحط اور کال بھی بار بار پڑے جب کبھی خشک سالی یا باڑھ کی وجہ سے فصلیں خراب ہوجاتیں اور کھانے کی قلت ہوئی تولاکھوں کروڑوں کی تعداد میں لوگ بھوک مری کا شکار ہوجایا کرتے تھے۔''(12)

اس طرح کہا جاسکتا ہے انگریزوں کے دورحکومت میں کسانوں کی حالت بے انتہا خراب تھی ۔کسانوں کو لگان کی شکل میں بہت بڑی رقم دے کربھی کوئی معاشی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ حکومت نے زراعت کی حالت کو بہتر بنانے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا وہ تو اپنی تقریباً تمام تر آمدنی بس برطانوی ہندوستان کے نظم ونسق کی ضرورتیں پوری کرنے پر اور برطانوی صنعت وتجارت کوفروغ دینے پرصرف کرتی تھی۔

جدید صنعتوں کی ترقی

انیسویں صدی کے نصف اول میں عموماً صنعتوں کو نظر انداز کیا گیا۔ ہندوستان کی پرانی صنعت ایک طرح سے تباہ وبرباد ہوچکی تھی ۔حالانکہ ان ہی صنعتوں کی وجہ سے بہت سے ہندوستانیوں کو روزگار ملتا تھا اور پوری دنیا سے سونا اور چاندی ہندوستان آتا تھا۔دست کاروں کی بے روزگاری کے باوجود بھی جدید صنعتیں نہیں شروع کی گئیں۔مختلف قسم کے پیشوں پرسختی سے پابندی لگائی گئی جو بڑھتی ہوئی زیادتی کے مسئلہ کوحل کرسکتے تھے۔ہاں تجارت نے جو معیشت کی نمو کا سب سے بڑا ذریعہ سمجھا جاتا ہے تیزی سے ترقی کی لیکن صنعت کاری کے نہ ہونے کی بنا پر اس کوکوئی فائدہ نہیں ہوا۔انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں ایک اہم تبدیلی ہوئی یعنی بڑے پیمانہ پر کارخانوں کی صنعتیں شروع کی گئیں۔انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں سوتی کپڑے اور پٹ سن کی صنعتوں نے تیزی کے ساتھ ترقی کی اوراس طرح کوئلے کے کانوں سے نکالنے کی صنعت شروع ہوئی۔اس طرح ہندوستان میں مشینی دورکا آغاز ہوا۔سوتی کپڑوں کی مل سے پہلے بمبئی میں ۱۸۵۳ء میں بنی اور پٹ سن کی پہلی مل ۱۸۵۵ء میں بنگال میں قائم کی گئی یہ

صنعتیں آہستہ آہستہ ہی سہی لیکن مسلسل ترقی کرتی رہیں۔ ۱۸۷۹ء میں سوتی کپڑے کی ۵۶ ملین تھیں اور ان میں ۴۳ ہزار لوگ کام کرتے تھے۔ ۱۸۸۲ء میں پٹ سن کی ملوں کی تعداد ۲۰ تھی اور اس میں بیس ہزار لوگ کام کرتے تھے اسی طرح یہ صنعتیں آہستہ ہی سہی بیسویں صدی کے نصف اول میں بھی ترقی کرتی رہیں' چنانچہ اعداد وشمار بتاتے ہیں کہ ۱۹۰۵ء تک ہندوستان میں سوتی کپڑوں کی ملوں کی تعداد ۲۰۶ ہوگئی اور ان میں کام کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ ۹۶ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ۱۹۰۱ء تک پٹ سن کی ملوں کی تعداد ۳۶ ہوگئی اور اس میں کام کرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ پندرہ ہزار تک پہنچ گئی۔ کوئلے کو کانوں سے نکالنے کی صنعت میں ۱۹۹۶ء میں تقریباً ایک لاکھ آدمی کام کرتے تھے۔

انیسویں صدی کے نصف اول اور بیسویں صدی کے شروع میں ان صنعتوں کے علاوہ بہت ساری صنعتیں قائم ہوگئیں۔ لیکن ان صنعتوں کی نشوونما رکی رکی سی تھیں۔ جس سے روزگار کے میدان میں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

> ''مقابلتاً کم اہم صنعتوں میں اونی کپڑے کے کارخانوں، کاغذی کے کارخانوں اسلحہ اور گولی بارود بنانے کے کارخانوں، شراب بنانے کے کارخانوں، کپاس صاف کرنے کے اور گانٹھیں باندھنے کے کارخانوں، تیل کے کارخانوں، پٹ سن کی گانٹھیں بنانے کے کارخانوں، شکر سازی کے کارخانوں، ریشم کے کپڑوں، لوہا اور پیتل ڈھالنے کے کارخانوں اور ٹائل کے کارخانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مجموعی تعداد تھی دس لاکھ بانوے ہزار جو مجموعی آبادی یعنی تیس کروڑ کی ایک فیصدی سے بھی کم تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء تک روزگار کی حد تک ہندوستان کی صنعت کاری کوئی اہمیت نہیں رکھتی''۔(13)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہندوستان میں صنعت کی ترقی بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی انیسویں صدی میں تھوڑی بہت صنعتی ترقی دیکھی بھی گئی تو وہ کپاس، پٹ سن کی صنعتوں اور چائے کی کاشت تک تھی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سمنٹ اور چینی کی صنعت نے بھی کچھ ترقی کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں یہ حال تھا کہ فیکٹری میں کام کرنے والے کچھ مزدوری میں

سے ۴۰ فیصدی محض سوتی کپڑے اور پٹ سن کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ایک طرح سے دیکھا جائے تو ہندوستان میں جدید صنعت کی ترقی بہت حقیر تھی۔ یہ ترقی تو دیسی دستکاری کی تباہی کا بھی خاتمہ نہیں کرسکتی تھی۔اس سلسلہ میں مشہور مورخ پپن چندرا لکھتے ہیں:

''ہندوستان کی صنعت کتنی معمولی اور حقیر تھی اس کا پورا اندازہ اس حقیقت سے لگایئے کہ ۱۹۵۱ء میں ہندوستان کی آبادی ۳۵ رکروڑ ۷۰ لاکھ تھی لیکن اس میں صرف ۲۳ لاکھ شہری جدید صنعتی اداروں میں کام کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ شہری اور دیہاتی دستکاری صنعتوں کی پستی اور انحطاط کا سلسلہ ۱۸۵۸ء کے بعد مسلسل جاری تھا انڈین پلاننگ کمیشن کے (ہندوستانی منصوبہ بندی کمیشن) اعداد وشمار کے مطابق صنعتی کاموں اور صنعتی پیداوار سے متعلق شعبوں میں کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۰۱ء میں ایک کروڑ ۳ رلاکھ تھی لیکن یہ کم ہوکر ۱۹۵۱ء میں صرف ۸۸ لاکھ رہ گئی تھی جب کہ اس اثنا میں ملک کی آبادی میں تقریباً چالیس فیصدی اضافہ ہوا تھا حکومت برطانیہ نے ان دیسی صنعتوں کو جدید سانچے میں ڈھالنے،ان کی تنظیم نو کرنے یا ان میں سرمایہ وغیرہ لگا کر دوبارہ جان ڈالنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی''(14)

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جب ہندوستان میں قومی تحریک اپنے عروج پر تھی انگریزوں نے ہندوستانی صنعت کو محصول وغیرہ کے ذریعہ کچھ تھوڑا تحفظ ضرور دیا لیکن اس معاملہ میں بھی انگریزوں نے تفریق سے کام لیا۔ چنانچہ صنعتوں کی ملکیت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا مثلاً سمنٹ ،لوہے،فولاد اور شیشے کی صنعتوں کو اس قسم کا تحفظ دیا بھی نہیں گیا۔ یا دیا بھی گیا تو برائے نام اس کے برعکس جن صنعتوں پر غیر ملکی ملکیت تھی مثلاً ماس کی صنعت انہیں ان کی خواہش کے مطابق مکمل تحفظ فراہم کیا گیا۔اس سلسلہ میں ہندوستانیوں نے احتجاج بھی کیا لیکن ان کی آواز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی اور برطانوی درآمدات کو ہی مخصوص مراعات حاصل رہیں۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ ملک میں غربت وافلاس کی اصل بھی یہ حکومت تھی۔ ہندوستان کی معاشی حالت میں اس وقت تک کوئی سدھار نہیں آسکتا جب تک کہ حکومت کی نوعیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہ ہو۔اس وجہ سے معاشی حالات سے پریشان حال طبقہ قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تا کہ ہندوستان کو خودمختاری حاصل ہو اور معاشی مسائل کو حل کیا جاسکے۔

بین الاقوامی پسِ منظر

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ تک کے پین الاقوامی پس منظر کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ ہندوستان کے باہر بہت سارے ایسے واقعات ہوئے جن سے ہندوستان میں انقلابی قوم پرستی کو طاقت وقوت ملی اور اس میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

تاریخ عالم کے مطالعہ سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۹۰ء سے ۱۹۱۴ء پہلی جنگ عظیم کی ابتدا تک جو درمیانی زمانہ پایا جاتا ہے اس میں دنیا پر یورپ کا غلبہ رہا ہے ساتھ ہی ساتھ ایسے آثار بھی نظر آنے لگے، جس سے پتہ چلتا تھا کہ یورپ کے اقتدار کا خاتمہ شروع ہوگیا ہے۔ چنانچہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جاپان دو عظیم طاقتیں منظر عام پر آگئی تھیں۔ ساتھ ہی ساتھ یورپی ملکوں کی نوآبادیات میں قومی تحریکیں شروع ہوگئی تھیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور جاپان دو ایسے ملک تھے جو اس زمانے میں ایک عظیم طاقت کے روپ میں دنیا والوں کے سامنے آئے۔

شمالی امریکہ کے مشرقی کنارے کی ۱۳/نوآبادیوں سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ وجود میں آیا تھا اور ۱۳ نوآباد برطانیہ کی حکومت سے آزادی حاصل کرلی تھیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ آزادی حاصل کرنے کے بعد ۱۰۰ سال کے اندر اندر اتنا وسیع ہوگیا جتنا کی آج ہے اور دیکھتے دیکھتے ریاست ہائے متحدہ امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت بن گیا۔ صنعتی میدان میں بے مثال ترقی اس کے حصہ میں آئی دیگر ممالک سے اس میدان میں بہت آگے نکل گیا۔ اس سلسلہ میں مشہور مورخ ارجن دیو لکھتے ہیں۔

> ''انیسویں/صدی کے آخر میں دنیا کا ایک تہائی لوہا اور فولاد امریکہ میں تیار ہونے لگا۔ صنعت کے تقریباً ہر میدان میں یہ ملک دنیا کے دوسرے ملکوں سے آگے نکل گیا۔ اس ملک میں ریلوے لائن کی لمبائی ۳/لاکھ کلومیٹر تھی جو کہ تمام یورپ کی مجموعی ریلوے لائن کے برابر تھی۔ ساری دنیا کے تیل اور قدرتی گیس کے مجموعی خرچ کے برابر اس ملک میں ان چیزوں کا صرفہ تھا

۔زیادہ عرصہ تک ریاست ہائے متحدہ کی زبردست اقتصادی ترقی منظر عام پر نہیں آئی۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اس ملک کی پیداوار زیادہ تر اس ملک میں فروخت ہو جاتی تھی۔ریاست ہائے متحدہ کی آبادی جو ۱۷۹۰ء میں ۴۰ لاکھ تھی بڑھ کر ۱۹۱۰ء میں تقریباً ایک کروڑ ہو چکی تھی۔(15)

جاپان:

ایشیائی ممالک میں جاپان ہی ایک ایسا ملک تھا جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شہنشاہیت کے چنگل سے آزاد رہا جاپان کی اصل طاقت فوجی جرنلوں کے ہاتھ میں تھی انیسویں صدی کے وسط میں جاپان کی آزادی پر خطرے کے بادل منڈلانے لگے۔ایسے وقت میں جاپان جدید دنیا میں بیدار ہو گیا۔چند دہائیوں میں ہی جاپان غیر ملکی خطرے کو ٹال دیا بلکہ کچھ معاملات میں وہاں کے معاشرہ میں جدیدیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۱۸۶۸ء کے بعد جدید جاپان کی ترقی نے دکھا دیا کہ ایک پسماندہ ایشیائی ملک کس طرح مغرب کی مدد کے بغیر دنیا کی ایک بڑی طاقت بن سکتا ہے۔جاپان کے رہنماؤں نے چند دہائیوں کے اندر اپنے ملک کو ایک اول درجے کی صنعتی اور فوجی قوت بنا دیا پورے ملک میں ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔اسی طرح جاپان نے بہت سے تھوڑے عرصہ میں ایک بہترین اور جدید ترین انتظامی ڈھانچہ تیار کر لیا۔انیسویں صدی کی آخری دہائی میں جاپان نے بھی اپنی نو آبادیاتی تمناؤں کو پورا کرنا شروع کر دیا تھا۔اس کی یہ تمنائیں خاص طور سے چین اور مشرقی ایشیا میں جاپان کی برتری ثابت کرنے کے لیے تھیں۔مگر بعد کے زمانوں میں جاپان کا مقصد سارے ایشیا اور بحرالکاہل کے علاقے پر برتری حاصل کرنا بن گیا۔چنانچہ ۱۸۹۵ء میں جاپان نے اپنی طاقت بڑھا کر چین پر حملہ کیا اور اسے ہرا دیا۔۱۹۰۲ء میں برطانیہ اور جاپان کے بیچ ایک صلح نامہ پر دستخط ہوئی جس کے نتیجہ میں جاپان ایشیا کا ایسا ملک بن گیا جو کہ نو آبادیاتی طاقتوں کے برابر درجہ رکھتا تھا۔اس طرح ۱۹۰۵ء میں روسی اور جاپان کے درمیان ہونے والی جنگ میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی۔ان تمام واقعات کی وجہ سے جاپان دنیا کے نقشے پر ایک عظیم طاقت بن کر ابھرا۔جاپان کے ایک عظیم طاقت بن جانے کی وجہ سے ایشیا کے بہت سے ملکوں میں قومیت

کے فروغ میں طاقت ملی ۔ جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست کی وجہ سے یہ ثابت ہوگیا کہ ایک غیر سفید فام قوم یورپ کی ایک بڑی طاقت کو شکست دے سکتی ہے۔

ایشیا میں قومی تحریکوں کا عروج

جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست کی خبر پورے ایشیا کے ممالک میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ بیان کی گئی اور یورپ کے برتری فرضی داستان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلط ثابت ہوگئی ۔۱۸ر جون ۱۹۰۵ء کو ایک اخبار کراچی کرانیکل نے عوامی احساسات وجذبات کا اظہار اس طرح کیا تھا جو کچھ ایشیا کی قوم نے کیا وہ کل دوسری قومیں بھی کر سکتی ہیں:

> ''اگر جاپان روس کو ہرا سکتا ہے تو ہندوستان بھی یقیناً ہی آسانی سے انگلستان کو شکست دے سکتا ہے۔ آیئے ہم انگریزوں کو سمندر میں ڈبو کر جاپان کے شانہ بہ شانہ دنیا کی عظیم طاقتوں کی صف میں کھڑے ہوجائیں''(16)

ہندوستان کی قومی تحریک جو اس وقت پورے عروج پر تھیں نو آبادیات میں پہلی پہل شروع ہونے والی قومی تحریکوں میں سے ایک عظیم تحریک تھی ۔ بیسویں صدی کے شروع کے سالوں میں ایشیا کے دوسرے حصوں اور خاص طور سے انڈو چائنا، انڈونیشیا، کوریا، فلپائن اور ایران میں قومی آزادی کی تحریکیں زور پکڑنے لگی تھیں ۔

شاہ ایران کی آمرانہ طاقت کو ختم کرنے کے لیے ایران کے باشندوں نے کئی کامیاب بغاوتیں کی ۔ان بغاوتوں کی وجہ سے شاہ ایران اس بات کے لیے راضی ہوگیا کہ ایران میں ایک آئینی حکومت قائم کی جائے اور ایک پارلیمنٹ بنائی جائے ۔مگر یہ نہیں ہوسکا اس لیے کہ تھوڑے عرصہ گزرنے کے بعد بیرونی ممالک کی مدد سے شاہ ایران اپنی آمرانہ طاقت دوبارہ حاصل کر لی اور پارلیمنٹ کا وجود ختم ہوگیا۔ جن بیرونی ممالک نے اس سلسلہ میں شاہ ایران کی مدد کی تھی اس میں روس سرفہرست تھا۔

چین میں بھی کئی انقلابی تحریکیں ہوئیں جن سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ چین کے عوام میں قومی بیداری بیدار ہورہی تھی ۔ چائینیز ریولوشنری لیگ کے صدر ڈاکٹر سن پات سین تھے

۔چینی عوام میں قومی بیداری پیدا کرنے میں انہوں نے زبردست رول ادا کیا تھا اور تمام انقلابی جماعتوں کو متحد کر دیا۔ انقلابیوں کا مقصد یہ تھا کہ چین میں ایک جمہوری ری پبلک قائم ہوا اور زمین کو برابری کے اصول پر تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں جنوبی چین میں انقلاب کی ایک زبردست لہر آئی اور پہلی جنوری میں چین کو ایک ری پبلک بنانے کا اعلان کر دیا گیا۔ ڈاکٹر سن پات سین کو ریسلنگ کا صدر بنا دیا گیا۔

ترکی کی عوام، سلطان کے ظلم وستم سے نجات پانے کے لیے اور رہتے ملک کو ایک جدید سیکولر ملک دیکھنے کے لیے کئی ایک تحریکیں چلا رہی تھی۔ان تحریکوں میں دانشوروں، مصلحوں اور فوجی افسروں کی ایک بہت بڑی تعداد شامل تھی ان لوگوں کو ینگ ٹرک کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں سلطان کو جب بغاوت کی دھمکی دی گئی تو وہ آئین کی بحالی پر راضی ہوگیا۔ یہ آئین ۱۸۷۸ء میں نافذ ہوا تھا۔ان تمام انقلابی تحریکوں نے ہندوستانیوں کو مزید یقین دلا دیا کہ ہر ممکن قربانی کرنے کے لیے کمر بستہ ایک متحد قوم طاقت ور سے طاقت ور اور جابر سے جابر حکومت کو چیلنج دے سکتی ہے۔بس ضرورت ہے حب الوطنی کے جذبہ کی۔انار کی اور عظیم قربانی کی۔

پہلی جنگ عظیم

انیسویں صدی کی آخری دہائی سے یورپ کی تاریخ میں جو مناظرہ دکھائی دے رہے تھے ان میں سامراجی طاقتوں کا آپس میں ٹکرانا، ایک دوسرے کے خلاف بڑھتی ہوئی فوجی طاقت اور جنگ کی پرجوش تیاریاں شامل تھیں۔ ہر ایک ملک اپنا فوجی منصوبہ اور حکمت عملی بنانے تیار بیٹھا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو اس میں دنیا کے ہر خطے کے ممالک شامل ہوں گے۔

پہلی جنگ عظیم یورپ میں ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور چار سال تک جاری رہی۔اس میں ایک طرف جرمنی اراس کے ساتھی آسٹریا، بلگیر یا اور ترکی تھے اور دوسری طرف انگلینڈ اور اس کے ساتھی فرانس، روسی، امریکہ اور ہندوستان وغیرہ تھے انجام کار اس جنگ میں انگلینڈ اور اس کے ساتھیوں کو فتح نصیب ہوئی۔

جنگ کے اسباب

اس جنگ کی اصل وجہ یورپ کے بڑے بڑے ممالک کی باہمی رنجشیں اور ملک گیری کی ہوس تھی ۔خاص کر جرمنی کا ملک بہت حریص تھا ۔ جرمنی ،ترقی کے میدان میں باقی ملکوں کہ بہ نسبت بہت بعد میں آیا تھا ۔لیکن تیس چالیس سال کے قلیل عرصہ میں اس نے سائنس ،تعلیم ،صنعت وحرفت اور تجارت میں حیرت انگیز ترقی کر لی تھی اور اس کے پاس ایک زبردست فوج تھی ۔اب جرمنی کا شمار دنیا کی صف اول کی طاقتوں میں ہونے لگا تھا ۔اپنی اس ترقی پر جرمنی اترایا تھا اور وہ باقی ممالک سے بازی لے جانا چاہتا تھا ۔اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے اپنی بحری طاقت کو مضبوط کر لیا تھا انگلینڈ جو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بڑی طاقت سمجھتا تھا ۔ جرمنی کی اس ترقی کو اپنے مفاد کے منافی سمجھتا تھا ۔

اس کے علاوہ جرمنی اور فرانس میں دیرینہ عداوت تھی اور کئی دیگر ممالکوں میں باہمی رقابت تھی ۔ جنگ کا خطرہ زور بزور بڑھتا جا رہا تھا ۔ چنانچہ بیسویں صدی کے شروع میں یورپ کی بڑی بڑی طاقتیں اپنے اپنے بچاؤ کی خاطر دو فوجی فرقوں میں بٹ گئی تھیں ۔ایک طرف جرمنی ،آسٹریا اور اٹلی تھے (اگرچہ اٹلی جنگ میں جرمنی کے خلاف شامل ہوا) اور دوسری طرف انگلینڈ، فرانس اور روس تھے اور سب فوجیں اپنے آپ کو مسلح کر رہی تھیں جنگ چھڑ جانے کے لیے ایک معمولی سا بہانہ کافی تھا ۔

جنگ کا فوری سبب

آخر کار ۲۸ / جون ۱۹۱۴ء میں وہ بہانہ بھی مل گیا ۔ ہوا یہ کہ آسٹریا حکومت کے جانشین اور اس کی بیوی کو قتل کر دیا گیا ۔اس قتل میں آسٹریا حکومت نے اپنے ہمسایہ ملک سربیہ پر شک کیا اور ٹھیک ایک مہینے کے بعد ۲۹ جولائی کو آسٹریا فوجوں نے سربیہ کی راجدھانی بلغراد پر گولی باری کر دی ۔

آسٹریا اور سربیا کے جنگ کے آغاز سے دو اور جنگیں شروع ہو گئیں اور ان تینوں جنگوں کے فوجی اتحاد کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم عام پیمانے پر شروع ہو گئی ۔ روسی اور جرمنی بھی جنگ میں

کود پڑے ۔ جرمنی اب بلجیم کی راہ فرانس پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور اپنی فوجیں بلجیم میں بھیج دیں ۔بلجیم جنگ میں مزید جانبدار تھا لیکن جب جرمنی نے بلجیم پر حملہ کر دیا تو انگلینڈ نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔اس کے بعد بہت سے مما لک اس جنگ میں شامل ہو گئے ۔ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اتحادیوں کا اتھ دیا اور اپریل ۱۹۱۷ء کو وہ بھی جنگ کے میدان میں کود پڑا کل ملا کر ۲۷ ر ملک جنگ میں شامل ہو گئے ۔اور اس طویل اور بھیا نک جنگ میں انسانی جانوں کا بھیا نک نقصان ہوا۔ساڑے چھ کروڑ سپاہیوں میں سے تقریباً ۹۰ ر لاکھ مارے گئے اور دو کروڑ بیس لاکھ زخمی ہوئے تھے اس جنگ کے اثرات یورپی مما لک پر نا قابل بیان ہوتے تھے ۔مشہور مورخ ارجن دیو اس تعلق سے لکھتے ہیں ۔

''اس عظیم حادثے کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لیے یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جنگ میں شامل ہونے والے جن سپاہیوں کو جسمانی اور روحانی زخم آئے تھے ان کی عمریں ۱۸ سے ۳۵ سال کے درمیان تھیں ۔یورپی فوج کے اس بہترین حصہ کو جو نقصان پہنچا اس سے یورپ کے معاشرہ پر واقعی نقصان دہ اثرات پڑے ۔(17)

انقلاب روس:

انیسویں صدی کا ایک عظیم جرمن مفکر تھا جس کو تاریخ میں کال مارکس کے نام سے جانا جاتا ہے ۱۸۶۷ء میں اس نے ایک اعلان نامہ شائع کیا جس میں ساری دنیا کے مزدوروں کو ایک ہونے اور غلامی کی زنجیر توڑنے کی دعوت دی گئی ۔اس اعلان نے ساری دنیا میں آگ لگا دی محنت کش اپنا حق چھیننے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ۔انقلاب کا راستہ دکھانے والا ، پہلا ملک روس تھا۔اس لیے کہ وہاں کی دیہاتی عوام غریبی اور مصیبت کی زندگی گذار رہی تھی ۔چنانچہ انیسویں صدی میں انہوں نے اپنے غم وغصہ کا اظہار مختلف انقلابی تحریکوں کی شکل میں کیا تھا ۔روس کے معزز لوگوں اور کلیسا کے ہاتھوں میں ایک طرف بڑی بڑی جاگیریں تھیں اور دوسری طرف کروڑوں دیہی عوام کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا بھی نہیں تھا۔روس میں صنعتی انقلاب کی وجہ سے مزدوروں کا ایک نیا طبقہ ضرور سامنے آیا تھا لیکن اس کی حالت بھی بہت خراب تھی ۔روس کا

عام آدمی اس کے مروجہ نظام سے ناراض تو تھا وہاں کا درمیانی طبقہ اور دانشور طبقہ بھی آمرانہ سیاسی نظام کی مخالفت کی اس طرح سبھی لوگوں کی ملی جلی کوششوں سے روس میں مزدوروں کی ایک زبردست انقلابی تحریک بنی اور ۱۹۱۷ میں لیٰنین کی رہنمائی میں مزدور تحریک کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ زار کی ظالم حکومت کا خاتمہ ہوا اور حکومت کی باگ ڈور مزدوروں اور محنت کشوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ اس نئی حکومت نے سب سے پہلے امن کا فرمان جاری کیا اور اس فرمان میں کہا گیا تھا کہ:

''جرمنی، فرانس اور برطانیہ کے مزدور اپنا فرض ضرور سمجھیں گے کہ انسانیت کو جنگ کی دہشت اور نتائج سے بچایا جائے اور یہ کہ وہ مزدور اپنے پرزور فیصلہ کن اور لگاتار عمل کے ذریعہ اس کے مقصد کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے میں ہماری مدد کریں گے۔ اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو ہر قسم کی غلامی اور استحصال سے نجات دلائیں گے''۔(18)

لیٰنین کی سرکردگی میں چلنے والی اس انقلابی حکومت کا دوسرا قدم تھا' زمین کے بارے میں فرمان جاری کرنا۔ اس فرمان کے مطابق زمین میں نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا اور ساری زمین کا مالک ساری قوم کو مانا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ عوام کی مساوات اور خودمختاری کے حقوق کا بھی اعلان کیا گیا تھا۔

دوجنگوں کے بیچ کی دنیا

پہلی جنگ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہو کر ۴ سال بعد ۱۹۱۸ء میں ختم ہوگئی۔ پہلی جنگ عظیم کیا تباہی و بربادی لائی اس کی تفصیلات گذشتہ صفحات میں کی جا چکی ہے ساتھ ہی ساتھ جنگ کے نتیجہ میں یورپ' جس کی طاقت وقوت کا پوری دنیا میں شور تھا کافی کم ہوگیا۔ جہاں تک ان ملکوں کی نو آبادیات کا تعلق ہے۔ ان پر ان کا قبضہ بدستور رہا یورپ میں کچھ نئی ریاستیں بھی وجود میں آئیں اور ان میں سے اکثر ریاستیں قومیت کی بنیاد پر وجود میں آئی تھیں۔ اس دوران ایک طرح سے امریکہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی شکل میں ہمارے سامنے آیا۔ یورپ کے بہت سے ملکوں کی اقتصادیات امریکہ پر ہی منحصر تھی اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب امریکہ میں ۱۹۲۹ء میں اقتصادی

بحران شروع ہوا تو اس کا اثر نہ صرف ایک ملک کی اقتصادیات پر دکھائی دینے لگا۔ بلکہ دنیا کے دیگر ممالک پر بھی اس کے اثرات دیکھے گئے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ روس اور جاپان

باہمی جنگوں کے زمانے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ، روس اور جاپان تین بڑی طاقتیں مانی جاتی تھیں روس انقلاب سے پہلے، اتحادی طاقتوں ان تینوں کا شمار ہوتا تھا۔ جنگ کے بعد جب روس اس اتحاد سے الگ ہوگیا تو صبح ناموں کے معاملے میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اور زبردست اقتصادی طاقت بن گیا۔ روس کی حالت یورپ کے ملکوں میں سب سے خراب تھی اس لیے کہ اس ملک کو انقلاب، خانہ جنگی اور بیرونی مداخلتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ پھر بھی ۱۹۳۰ء میں یہ ملک ایک زبردست اقتصادی طاقت بن کر ابھرا اور عالمی معاملات میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جاپان کی صورت حال یہ تھی کہ جنگ کے بعد ایشیا اور بحرالکاہل کی ایک بڑی طاقت بن گیا۔

ایشیا

دو عظیم جنگوں کے درمیان براعظم ایشیا اور براعظم افریقہ میں بھی کچھ تبدیلیاں آئیں۔ اور ان ممالک کی عوام میں قومیت کا جذبہ پروان چڑھا۔

ایشیا

ہندوستان: دونوں جنگوں کے درمیانی زمانے میں ایشیا کے ہر ملک میں قومی تحریکوں نے زور پکڑا۔ ہندوستان میں بھی قومی تحریک کا تیسرا اور آخری دور ۱۹۱۹ء میں شروع ہوا۔ یہ دور عوامی تحریکوں کا دور تھا۔ یہ بیداری پہلی جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی پیدا ہوگئی تھی ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو انگریزوں نے امرتسر جلیانوالے باغ میں بے قصور ہندوستانیوں کا قتل عام کیا اس کے فوراً بعد پورے ملک میں عدم تعاون تحریک شروع ہوئی اور اس تحریک میں لاکھوں کان، مزدور، طالب علم، عورتیں غرض سماج کا ہر طبقہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور برطانوی حکومت کی خلاف ورزی کا کرنا ایک طرح سے ہندوستانیوں کا شعار بن گیا۔ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی

حاصل کرنا بن گیا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک نے دوسری نو آیات میں چلنے والی تحریکوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور یورپی ممالک میں چلنے والی تحریکوں سے بھی اپنا فاشزم کے خلاف تعلق بنایا۔ ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کے لیے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا ناگزیر دکھائی دینے لگا۔

چین: پہلی جنگ عظیم کا جب خاتمہ ہوا اس وقت چین میں دو حکومتیں تھیں۔ ایک حکومت پر گومنڈانگ کا کنٹرول تھا اور کینٹن اس کا صدر مقام تھا۔ ڈاکٹر سن پات سین اس حکومت کا صدر تھا۔ دوسری حکومت کا صدر ایک فوجی جنرل تھا اور بیجنگ اس کا صدر مقام تھا۔ ۱۹۱۹ء میں پیرس امن کانفرنس میں شانتونگ کا علاقہ جاپان کو دلانے کا فیصلہ کیا گیا تو اس وقت وہاں کی عوام میں بغاوت کے مظاہرے دیکھے گئے۔

۴ رمئی ۱۹۱۹ء کو بیجنگ کے طلباء نے ایک احتجاجی مظاہرہ کیا اور اس واقعہ میں جو تحریک وجود میں آئی اس تحریک کو تاریخ میں ۴ مئی کی تحریک کے نام سے جانا جاتا ہے اور یہ تحریک چین کے مختلف حصوں میں تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ نیز روس کے انقلاب نے چین کے قومیت پسندوں پر گہرا اثر ڈالا اور وہاں پر انقلابی رجحانات ابھرنے شروع ہو گئے تھے۔

برما

انگریزوں نے برما کو اپنی حکومت میں شامل کر کے ہندوستان کا ایک حصہ بنا دیا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ ملک ہندوستان سے الگ ہوا۔ برما میں بیسویں صدی کے آغاز سے ہی قومی تحریک شروع ہو گئی تھی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی کا برما کی تحریک آزادی پر زبردست اثر پڑا۔ اور دونوں ملکوں کے رہنماؤں نے ایک دوسرے سے روابط بنائے رکھے۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں جنرل کونسل آف برمنیز ایسوسی ایشن نے مطالبہ کیا کہ برما کو خود مختار کر دیا جائے۔ اس طرح ۱۹۹۳ء میں نوجوانوں کی ایک تنظیم وجود میں آئی جن کو تھاگن کے نام سے جانا جاتا تھا اس کا مطلب ہے اپنے ملک کا مالک' اونگ سان اس تنظیم کا سب سے بڑا رہنما تھا جو بعد میں برمنیز کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر بنا۔ برما کے ہندوتان سے الگ ہونے کے بعد ہندوتان ہی کی طرح آئینی اصلاحات نافذ کی

گئیں لیکن ان اصلاحات سے برما کے قوم پرستوں کو تسلی نہیں ہوئی ۔اور برطانوی حکومت کے خلاف ایک زبردست لہر دیکھی گئی اور سارے ملک میں ہڑتالوں اور احتجاجی مظاہروں کا ایک لمبا سلسلہ چل پڑا ۔اس کے علاوہ اور بھی بہت سے ایشیا کے ممالک میں قومی تحریکیں دیکھی گئیں ۔طوالت کے خوف سے ان کا ذکر چھوڑا جارہا ہے۔

افریقہ پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد براعظم افریقہ میں تقریباً ۵۰ ریاستیں تھیں لائبریا، ایتھوپیا کو چھوڑ کر وہ سب کی سب یورپ کے کسی نہ کسی ملک کی آبادیات میں شامل تھیں ۔لہٰذا شمالی افریقہ کے کچھ ملکوں میں اس دور میں زبردست قومی تحریکیں اور جدوجہد دکھائی دی اسی طرح جنوبی افریقہ سمیت دوسرے ملکوں میں جدید قومیت اور قومیت کی بنیاد پر بہت ساری تحریکوں کا آغاز ہوا۔

برطانیہ کے حالات

جنوری ۱۹۲۴ء میں برطانیہ میں پہلی مرتبہ پھر پارٹی کو اقتدار ملا ۔ اس پارٹی نے اقتصادیات کے میدان میں زبردست تبدیلی لانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن دس مہینہ کی قلیل مدت میں ہی اس حکومت کا خاتمہ ہوگیا اور اس کی جگہ پر اکتوبر میں کنزوٹیو پارٹی نے اقتدار حاصل کرلیا اور یہ پارٹی ۱۹۲۹ء تک حکمران بنی رہی۔

برطانیہ کی تاریخ میں سب سے بڑی ہڑتال اسی زمانے میں ہوئی تنخواہوں میں کٹوتی اور کام کے گھنٹوں میں اضافے کی بات کو لے کر مئی ۱۹۲۶ء میں کوئلے کے کانوں میں کام کرنے والے مزدوروں نے ہڑتال کردی اس ہڑتال میں برطانیہ کی حکومت نے ہر طرح سے کانوں کے مالکوں کا ساتھ دیا۔۴ مئی ۱۹۲۶ء کو ۳۰ لاکھ مزدوروں نے کانوں میں کام کرنے والوں کی حمایت میں ہڑتال کردی ۔ان ہڑتال کرنے والوں میں ریلوے ،ٹرانسپورٹ ،فولاد اور دوسری صنعتوں میں کام کرنے والے مزدور شامل تھے ۔اور اس ہڑتال سے صنعت کار بری طرح چونک گئے اور انہوں نے اس طرح کی کارروائیوں کو کمزور کرنے کے لیے ہر طرح کی کوششیں کیں ۔حکومت نے زبردست پروپگینڈہ کر کے عوام کو اس ہڑتال کے خلاف کردیا۔اس طرح ۱۲ مئی کو یہ ہڑتال

ختم ہوگئی اور جلد ہی حکومت نے اس طرح کی ہڑتالوں کو پر قانون قرار دے دیا۔ برطانیہ کی نو آبادیات میں قومی تحریکوں کے زور پکڑنے کی وجہ سے برطانیہ کی پین الاقوامی حیثیت میں کچھ کمی اور آ گئی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں فاشسٹ ملکوں نے جارحانہ کارروائیاں شروع کر دی تھیں جس کی وجہ سے ایک دوسری عالمی جنگ کے بادل منڈھلانے لگے تھے اور مغربی ممالک کی طرح برطانیہ نے بھی فاشسٹوں کو خوش رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس وقت فاشزم مخالف پارٹیوں اور جماعتوں نے لوگوں میں احساس بیدار کیا کہ فاشزم کے نتائج نہایت خطرناک ہوں گے۔

دوسری جنگ عظیم

یہ جنگ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو شروع ہوئی اور تقریباً چھ سال بعد ۱۹۴۵ء میں ختم ہوئی۔

اس جنگ میں ایک طرف جرمنی اور اس کے حمایتی تھی اور دوسری طرف انگلینڈ اور اس کے ساتھی تھے۔ بڑے برے ملکوں میں جاپان اور اٹلی جرمنی کی طرف تھے اور فرانس اور امریکہ انگلینڈ کی طرف۔ شروع شروع میں روس جرمنی کا ہمدرد تھا لیکن بعد میں وہ انگلینڈ سے مل گیا اس جنگ میں انجام کار انگلینڈ اور اس کے ساتھیوں کو فتح نصیب ہوئی۔

جنگ کی وجہ

پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی حالت نہایت خراب ہوگئی تھی۔ اس خراب حالت سے متاثر ہو کر جرمنی کے ایک شخص ہٹلر کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ جرمنی کو پستی سے اٹھا کر پھر ترقی کی راہ پر گامزن کیا جائے۔ اس مدعا کے لیے ایک زبردست پارٹی قائم کی جسے نازل پارٹی کہتے تھے۔ چند ہی سالوں میں اس پارٹی نے بہت زیادہ اثر ورسوخ حاصل کر لیا۔

۱۹۳۴ء میں ہٹلر اپنی قابلیت اور اسی پارٹی کی مدد سے ملک کا ڈکٹیٹر یا مختار کل بن گیا۔ اس اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ہونے کے بعد ہٹلر نے اپنے ملک کی فوجی طاقت اور جنگی سامان تیار کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی۔ پھر اس نے اٹلی کے حاکم اعلیٰ مسولینی کے ساتھ ایک مضبوط اتحاد قائم کیا۔ اس طرح جرمنی پھر دنیا کی بڑی طاقتوں میں شمار کیا جانے لگا۔

اب ہٹلر نے یورپ میں جرمن اقتدار بڑھانا شروع کیا اور اس نے پہلے آسٹریا اور پھر چیکوسلواکیہ پر قبضہ کرلیا اس سے اس کا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے پولینڈ کے ملک سے کچھ علاقہ کا مطالبہ کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو اسی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اس طرح جرمنی اور پولینڈ میں جنگ چھڑ گئی۔

انگلینڈ شروع شروع میں جنگ کو ٹالتا رہا لیکن ہٹلر کی ان چیرہ دستیوں نے اس کے صبر کا پیمانہ لبریز کر دیا اور انگلینڈ اور فرانس نے ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو پولینڈ کی حمایت میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

جنگ کے دوسرے مقامات

۲۷ ستمبر ۱۹۴۰ء کو جرمنی، جاپان اور اٹلی نے ایک سہ فرانسی صلح پر دستخط کئے۔ اس صلح کے مطابق طاقت کے ذریعہ ان میں سے کسی ملک پر حملہ ہونے کی صورت میں ایک دوسرے کو پوری مدد دینے کا وعدہ کیا گیا تھا جاپان کا خواب تھا کہ وہ عظیم تر مشرقی ایشیا اور جنوبی ایشیا کو اپنے اقتدار میں لے لے۔ اٹلی اور جرمنی نے جاپان کے اس منصوبہ کو تسلیم کرلیا۔ اکتوبر ۱۹۴۰ء میں اٹلی نے یونان پر حملہ کر دیا لیکن یونان نے سخت مزاحمت کی اور جرمنی سے مدد مانگی۔ نومبر ۱۹۴۰ء اور مارچ ۱۹۴۱ء کے درمیان جرمنی نے ہنگری، رومانیہ سلاویکیا اور بلغاریہ کو بھی مذکورہ بالا صلح میں شامل کرلیا اور اپنی فوجیں ان ملکوں میں بھیج دیں۔ اس طرح یہ ممالک جرمنی، اٹلی اور جاپان کے اتحادی بن گئے۔

ریاست کے ہائے متحدہ امریکہ کی جنگ میں شرکت

دوسری جنگ عظیم شروع ہوجائے' پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے غیر جانبداری کا اعلان کیا تھا۔ زیادہ تر امریکی عوام کو برطانیہ سے ہمدردی تو لیکن وہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنگ میں شریک ہونے کے خلاف تھے۔ البتہ برطانیہ کو اس بات کی اجازت تھی کہ وہ نقد ادائیگی کے ساتھ ہتھیار خریدے اور لے جاتے۔ رفتہ رفتہ برطانیہ کے لیے ریاست ہائے متحدہ کی حمایت بڑھتی گئی۔ ۱۹۴۱ء میں جرمن، سوویت نے یونین پر حملہ کیا۔ جاپان نے پرلہار پر

بمباری کی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ جنگ میں کود پڑا۔ان تمام واقعات کے پیش آنے کی وجہ سے اب یہ ایک عالمی جنگ کی صورت ہوگئی۔۱۹۴۲ء کے وسط تک جاپان نے بحرالکاہل کے بہت سے جزیروں پر فلپائن انڈونیشیا، برما، ملایا، سنگاپور اور تھائی لینڈ پر اپنا قبضہ جمالیا۔دوسری طرف امریکہ، برطانیہ اور سوویت یونین کے درمیان اتحاد قائم ہوگیا۔اکثر یہ تینوں ملک مل کر جنگی منصوبہ بندی اور اقدامات کرنے لگے۔

یورپ میں اتحادیوں کی فتوحات اور جنگ کا خاتمہ

دوسری عالمی جنگ کے دوران اٹلی میں کافی حد تک بے اطمینان پائی جاتی تھی اور وہاں بار بار ہڑتالیں ہورہی تھیں۔بے اطمینانی فوجوں میں بھی پائی جاتی تھی کیوں کہ ان کو کسی جگہ بھی کامیابی نہیں ملی تھی۔ان حالات میں اتحادیوں نے اٹلی پر حملہ کردیا اور غیر مشروط طور پر اٹلی نے ہتھیار ڈال دیا۔

۳۰/اپریل ۱۹۴۵ء کو سوویت فوجوں نے جرمن پارلیمنٹ کی عمارت پر اپنا سرخ جھنڈا لہرادیا۔برلن میں دو دن تک ادھر ادھر مکانات جلتی رہیں اور ۷/مئی ۱۹۴۵ء کو جرمنی نے برطانیہ فرانس ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور سوویت یونین کے نمائندوں کے سامنے اپنی شکست تسلیم کرلی اور اس طرح یورپ میں جنگ کا خاتمہ ہوگیا جرمنی کی شکست کے بعد بھی ایشیا اور بحرالکاہل میں جنگ چلتی رہی۔اس علاقے میں اتحادیوں کو فتوحات حاصل ہوئی تھیں لیکن ابھی بھی چین، منچوریا، کوریا اور کچھ دوسرے مقامات پر جاپان کی فوجیں بھاری تعداد میں مصروف جنگ تھیں۔

۶/اگست ۱۹۴۵ء کو ایک امریکی جہاز نے ہیروشیما پر اور ۹/اگست کو ناگاساکی پر بم گرائے۔ان دو شہروں میں ان بموں کی وجہ سے تین لاکھ بیس ہزار لوگوں کی موت ہوئی۔ان حالات میں ۱۵/اگست کو جاپان نے چند شرائط پر ہتھیار ڈال دیئے اور ۲/ستمبر کو جاپان نے اپنی شکست تسلیم کرلی اور دوسری جنگ عظیم کا خاتمہ ہوگیا۔

۱۹۴۵ء کے بعد کی دنیا

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی سیاسی شکل میں زبردست تبدیلی آئی۔دنیا نے دیکھ لیا کہ کس طرح سامراجیت کا غلبہ ختم ہوگیا۔اور اس کے ساتھ یورپ کی برتری کا خاتمہ بھی ہوگیا۔

۱۹۴۵ میں پچاس ملکوں نے مل کر اقوام متحدہ کی تشکیل دی۔ ایشیا اور افریقہ کے زیادہ تر وہ مما لک اس کے ممبر ہیں۔ جن کو دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی ملی۔

آزاد ریاستوں کا قیام

دوسری جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد ۲۵ سال کے عرصہ میں ایشیا اور افریقہ کے تقریباً ان تمام ملکوں نے آزادی حاصل کر لی جن پر سامراجی طاقتوں کا قبضہ تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی کی تحریکوں میں زبردست استحکام اس وجہ سے ہو گیا تھا کہ مختلف ملکوں میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں میں ربط وضبط بڑھنے لگا تھا ایک ملک کی آزادی کی تحریک دوسرے ملک کی آزادی کی تحریک کی حمایت کرتی تھی۔ جب ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی فوجیں انڈوچین اور انڈونیشیا میں اسی مقصد سے بھیجی گئیں کہ وہ وہاں ڈچ اور فرانسیسی حکومت کی مدد کریں تو ہندوستان میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ انڈوچین اور انڈونیشیا کی آزادی کی پرزور حمایت بھی کی گئی۔

ہندوستان

دوسری جنگ عظیم کے بعد ہندوستان وہ پہلا ملک تھا جس کو آزادی جیسی عظیم نعمت ملی اور ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان نے خوشی خوشی اپنا پہلا جشن آزادی منایا۔ یہ الگ بات ہے کہ برطانوی حکمراں ہندوستان کو تقسیم کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ پھر بھی ہندوستان کی آزادی، عظیم تاریخی اہمیت کی حامل تھی۔ ہندوستان کی تحریک آزادی سے افریقہ اور ایشیا کے دوسرے مما لک کو حوصلہ ملا تھا۔

سماجی وثقافتی پسِ ¤ منظر:

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کا ہندوستان سماجی اور ثقافتی اعتبار سے زبردست تبدیلیوں کا شکار ہوا۔ انیسویں صدی کا نصف اول مغربی تہذیب کے گہرے اثرات کو قبول کیا اور ایک نئی بیداری کو جنم دیا۔ لوگوں میں یہ احساس بہت شدید تھا کہ ہمارے سماجی اور ثقافتی ڈھانچے میں ضرور ایسی کمزوری ہے جس کی وجہ سے بہت تھوڑے عرصہ میں ملک انگریزوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ ایسی صورت حال میں ہمارے ملک کا دانشور طبقہ اپنی سماجی اور ثقافتی کمزوریوں کی تلاش میں لگا ہوا تھا۔ اور اس کو دور کرنے کی کوشش میں تھا۔ لیکن اب بھی

بہت سے ہندوستانی مغربی اثرات کو قبول کرنے کو تیار نہیں تھے اور روایتی خیالات اور اداروں کے سایہ میں زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ حالت نے اپنا رخ موڑا اب بہت سے ہندوستانی اس نتیجہ پر پہونچے کہ ہمیں اپنے سماج کو ایک نئی زندگی اور روح دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب کے بعض ان عناصر کو قبول کریں جو ہماری ترقی میں معاون و مددگار ثابت ہوں۔ خاص طور سے سائنسی علوم وفنون جن میں مہارت حاصل کئے بغیر ترقی کرنا مشکل ہے۔ اس سلسلہ میں ہمارے دانشوروں نے بہت ساری اصلاحات لیں۔ اصلاحات کا کردار کیا ہوا اور اصلاحات کس حد تک کی جائیں اس ضمن میں اختلاف رائے ضرور تھا ورنہ انیسویں صدی کے تمام ہی دانشور اور مصلح اس بات پر متفق تھے اور یقین رکھتے تھے کہ ملک میں سماجی اور ثقافتی اصلاحات کی فوری ضرورت ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں اس ضرورت کو سب سے زیادہ محسوس کرنے والے رام موہن رائے تھے۔ جس کو جدید ہندوستان کا صف اول کا لیڈر تسلیم کیا جاتا ہے رام موہن رائے کو اپنی قوم اور وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ انہوں نے زندگی بھر اپنی سماجی، مذہبی، دانشورانہ اور سیاسی زندگی کی اصلاح کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

مغربی اثرات اور انگریزی حکومت کی بدولت ہندوستان میں بہت سارے سماج سدھار بھی ہوتے۔ ہندوستانی سماج میں بہت ساری برائیاں تھیں۔ لوگ عقل اور تجربہ کے بجائے غلط اعتقادی کی زندگی کی تقلید کرتے تھے۔ ستی کا رواج، بچوں کی شادی، بچوں کا قتل، انسانوں کی قربانی، چھوت اچھوت، وغیرہ جیسی برائیوں کو مٹانے کی کوششیں کی جانے لگیں۔ راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۸۰ء میں لکھا تھا کہ:

> ''مجھے بڑے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مذہب کے جدید ڈھانچہ نے ہندوؤں کو اپنی گرفت میں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ سیاسی میدان میں ان کی بھلائی کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں جاسکتا۔ ذات بات کے امتیاز نے ان کو فرقوں اور فرقوں کے سیکڑوں خانوں میں اس طرح تقسیم کر رکھا ہے کہ ان کے اندر پرچم کے جذبات پوری طرح ختم ہوگئے ہیں۔ سینکڑوں قسم کے مذہبی رسومات ورواج اور تزکیہ نفس کے اصولوں نے ان کو ایسا گھیر رکھا ہے کہ کسی بھی کار عظیم کے

کرنے کی سکت ان میں رہ ہی نہیں گئی ہے۔اس لیے میرے خیال میں اب یہ ضروری ہوگیا ہے کہ ہندو دھرم میں کچھ تبدیلی لائی جائے' جس سے ان کو سیاسی فائدہ اور معاشرتی راحت مل سکے''(19)

راجہ رام موہن رائے جس طرح اپنے وقت کے ایک عظیم مفکر تھے وہیں پر آپ ایک عملی انسان کی شکل میں ہمیں بھی نظر آتے ہیں۔ راجہ رام موہن رائے نے جس وقت ہندو مذہب میں اصلاح کرنے کا ارادہ کیا وہیں پر آپ نے ستی جیسی قبیح اور بری رسم کے خاتمہ کے لیے عملی قدم اٹھایا اور انہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ کسی بھی قدیم مذہبی کتاب میں یہ رسم نہیں ہے۔آخر پھر کیوں اس عمل پر اصرار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں راجہ رام موہن رائے نے بہت سی عورتوں کو اس قبیح رسم سے آزاد کرایا اور اس وقت کے وائسرائے لارڈ ولیم پین ٹک کی مدد سے اس رسم کے خلاف باضابطہ قانون پاس کرایا۔ اس کے علاوہ راجہ رام موہن رائے نے عورتوں کے لیے مساوی حقوق کا پرزور مطالبہ کیا۔اور بتایا کہ عورتیں کسی بھی طرح مردوں سے کم نہیں ہیں۔

راجہ رام موہن رائے نے اپنی پوری زندگی سماجی ناانصافی کے خلاف وقف کر رکھی تھی۔ اس سلسلہ میں جب انہوں نے کام کرنا شروع کیا تو انہیں خود اپنے افراد خاندان سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔لیکن ان تمام کے باوجود بھی انہوں نے اپنے مشن کو جاری و ساری رکھا۔ اس سلسلہ میں عہد جدید کے مصنف پروفیسر ظفر احمد نظامی صاحب لکھتے ہیں:

''وہ انسانی حقوق اور انفرادی آزادی کے علمبردار تھے۔ان کا مسلک انسان دوستی تھا۔ وہ ایک ایسے سماج کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس کی بنیاد رواداری' صلح کامل اور عقل پسندی کے اصولوں پر قائم ہو۔ان کی نگاہ میں ساری دنیا ایک کنبہ تھی اور مختلف قومیں ان کی شاخیں تھیں۔ وہ بہت بڑے سیاسی اور سماجی مصلح تھے اور سارے ایشیا میں مغرب کی جدید سائنسی تہذیب کو عام کرنے کے حامی تھے تاکہ اس کی پسماندگی دور ہو' اور اس کا شمار ترقی یافتہ مہذب و متمدن ملکوں میں ہونے لگے۔(20)

غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۲۸ء میں جس برہمو سماج کو قائم کیا

تھا دھیرے دھیرے اس کی لہر پورے ہندوستان میں دوڑ گئی۔ راجہ رام موہن رائے ۱۸۳۰ء میں انگلستان گئے اور وہاں پر ان کی ملاقات اس وقت کے ایک مشہور سیاسی مفکر اور سماجی مصلح جیریمی بین تھم سے ہوئی۔ اس سماجی مفکر نے ان کی سماجی خدمات کو بہت سراہا اور ان کو انسانیت کا محسن قرار دیا۔ اسی طرح ان کی ملاقات انگلستان کے ایک دوسرے عظیم سماجی مصلح لارڈ برکھم سے ہوئی جو غلامی کے خاتمے کی مسلسل کوشش کر رہے تھے اور عوامی تعلیم کے علم بردار تھے۔ اس طرح یہ عظیم سماجی مصلح اور مفکر ۱۸۳۳ء میں ۶۱ سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو گیا۔

ریویندر ناتھ ٹیگور: ۱۸۱۷ء تا ۱۹۰۵ء

راجہ رام موہن رائے کے انتقال کے بعد دس سال تک ایک طرح سے جمود' کساد بازاری کا زمانہ رہا اور برہمو سماج اپنی اہمیت کھو بیٹھا تھا۔ ۱۸۴۳ء میں رویندر ناتھ ٹیگور اس سماج میں شریک ہوئے اور انہوں نے سماج کی تنظیم راجہ رام موہن رائے کے خیالات کی توسیع کی غرض سے تتو بودھنی سبھا کی بنیاد ڈالی اور اس انجمن کے ترجمان کی حیثیت سے تتو بودھنی پتریکا جاری کی تا کہ بنگال زبان میں اس وقت کے فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کا باقاعدہ مطالعہ کیا جا سکے۔ انہوں نے ایک برہمو اقرار نامہ تیار کیا۔ ہندو منتروں کی بنیاد پر ایک مذہبی صحیفہ اور ایک داؤں کی کتاب تیار کی اس طرح سماج ایک نئی زندگی سے مالا مال ہوا اور ترقی کے منازل طے کیا اس کے مبلغین نے ہندوستان کے مختلف قصبوں کا سفر کیا اور پنجاب سے شرقی بنگال تک اس کی شاخیں قائم ہو گئیں۔ مذہبی تحریک کا بغور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک اس تحریک نے بڑی ترقی کی جس کو راجہ رام موہن رائے نے شروع کیا تھا۔

ایشور چندر ودیا ساگر: ۱۸۸۰ء تا ۱۸۹۱ء

ہندوستان کے آسمان پر طلوع ہونے والا اگلا درخشاں ستارہ تھے ملک کے عظیم عالم اور اصلاحات کے لیے ایشور چندر ودیا ساگر انہوں نے اپنی پوری زندگی سماجی اصلاحات کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہ ایک آزاد خیال فلسفی تھے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ مذہبی کتابوں اور مذہبی علم کو پروہتیوں اور پنڈتوں کی اجارہ داری میں ہرگز نہیں رہنے دیں گے۔ چنانچہ انہوں نے

اپنے زمانہ کے مہنتوں کی عام روش کے برعکس سنسکرت کے دروازے غیر برہمن طلباء پر کھول دیئے اور مغربی فکر سے متاثر ہوکر اس کالج میں مغربی تعلیم بھی شروع کرادی۔ ودیا ساگر نے خواتین کی زور آزما حالت کو ابتر سے بہتر بنانے کے لیے انتھک کوشش کی خاص طور سے ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی کے رواج کو عام کرنے کے لیے 1855ء میں ایک زبردست تحریک چلائی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔

اسی طرح ودیا ساگر نے تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے لڑکیوں کے تقریباً ۳۵ اسکول قائم کئے۔ ۱۸۴۹ء میں انہوں نے کلکتہ میں بے تھون اسکول کی بنیاد ڈالی اور اس میں لڑکیوں کو مغربی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اس مختصر سے جائزہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ ''برہمو سماج'' جس کی بنیاد راجا رام موہن رائے نے رکھی تھی' وہ عظیم سماجی مصلح بھی تھے۔ وہ ذات پات کے ناظم اور بچپن کی شادی کی بھرپور مخالفت کرتے تھے اور عورتوں کی حیثیت اٹھانے کے حق میں تھے۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں جو سماجی و ثقافتی اصلاحات کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا۔ صدی کے نصف آخر میں یہ عمل زیادہ تیز ہوگیا اور متعدد اہم مذہبی اور سماجی اصلاحی تنظیمیں' راجا رام موہن رائے اور پنڈت ودیا ساگر جیسے مصلحین کے کاموں کو آگے بڑھاتی ہیں۔

چنانچہ ۱۸۴۳ء سے ۱۸۵۷ء تک اس مذہبی تحریک نے بڑی ترقی کی جسے راجا رام موہن رائے نے شروع کیا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں کشب چندر سین سماج میں شامل ہوگئے اور اپنی سرست کے مطابق بڑے انہماک اور لگن کے ساتھ کام کرنے لگے۔ اس وقف کی ہمارے سماجی صدورت حال کیا تھی کیشب چندر نے کہا تھا:

> ''آج ہم اپنے چاروں طرف ایک زوال پذیر قوم دیکھ رہے ہیں۔ ایک ایسی قوم جس کی قدیم عظمت کھنڈرات میں دفن ہوچکی ہے۔ جس کا قومی ادب' سائنس' علم دینیات و فلسفہ صنعت و تجارت' سماجی خوشحالی اور گھریلو سادگی اور لطافت کم و بیش قصہ پارینہ بن گئی ہیں۔ ہم اپنے چاروں طرف پھیلے ہوئے مایوسی اور اداسی کی اس دردناک اور مایوس کن روحانی سماجی اور دینی افراد کو دیکھتے ہیں اور پھر اس میں کالی داس کی اس سرزمین کو جو شعر و شاعری' علم و سائنس اور

تہذیب وتمدن کی سرزمین تھی خلاش کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔''(21)

کشیب چندر سین کے وقت برہموسماج اپنے ابتدائی موقف سے بہت دور جا چکی تھی۔ کشیب چندر نے سماج میں بہت ساری اصلاحات کیں۔ چنانچہ دعا اور خدا سے ہم کلام ہونے کے تصورات زندگی کو وقف کر دینے کا تصور اور اس سے روشنی' روحانی تاثیر اور رحمت و برکت حاصل کرنے کا تصور مذہب کے جز بن گئے اور اسے وہ جذباتی رنگ رطا کر دیا جس کی اس میں پہلے کمی تھی۔ کشیب چندر کے کاوشوں اور محنتوں سے بہت کم عرصے میں برہموسماج نے دوبارہ نئی زندگی پائی۔قوم پرستی کوفروغ دینے میں برہموسماج کی خدمات کا جائزہ پٹن چندر نے ان الفاظ میں کیا ہے:

''کشیب چندر کی قیادت میں برہموسماج نے ذاتی آزادی اور سماجی مساوات کے لیے مقدس اصولوں کا اعلان کیا۔جس کا شدید ردعمل نئے بنگال کی تشکیل' قومی شعور اور نئی سیاسی زندگی اور توقعات پر ہوا۔اپنے سیاسی مالکوں کی برتری کے مفلوج کن احساس کی جگہ پٹن طور سے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہونے لگا''۔(22)

مربی ہندوستان میں اصلاحی تحریک:

مہراشٹرا میں پرم ہنس منڈی کا قیام ۱۸۹۹ء میں عمل میں آیا اور اس کا مقصد تھا ذات پات کے نظام کو ختم کرنا۔پ''پرم ہنس منڈی'' کے اراکین بیواؤں کی شادی اور تعلیم نسواں کے مقرید تھے۔مہاراشٹرا کے کئی شہروں میں اس منڈی کی شاخیں قائم ہوئیں۔مغربی ہندوستان میں سماجی اصلاح کا بیڑا اٹھانے والوں میں ایک اہم نام گوپال ہری دیش مکھ ہے۔ یہ مراٹھی زبان کے مصنف تھے۔سماجی مساوات کی برابر تبلیغ کرتے تھے اور یہ بھی کہتے تھے کہ اگر مذہب سماجی اصلاح کی اجازت نہ دے تو مذہب کو تبدیل کر دو۔۱۸۶۷ء میں''پراتھنا سبھا'' کا قیام عمل میں آیا۔اس کا مقصد تھا جدید علم کی روشنی میں ہندو مذہبی فکر وخیال اور رسم رواج میں اصلاح کرنا۔اس میں ایک خدا کی عبادت کی تبلیغ کی جاتی تھی اور مذہب کو ذات پات' تقلید پسندی اور پنڈتوں کے تسلط سے نجات دلانے کی کوشش کی جاتی تھی۔اس مہم کے دو عظیم رہنما تھے۔ایک سنسکرت کے مشہور عالم اور

مورخ آر جی بھنڈارکر اور دوسرے مہادیو گووندرانا ڈے۔ ان کی سرپرستی میں یہ مہم پروان چڑھی اور بہت سے سماجی اصلاح اور سماجی بہبود کے کام ہوتے۔ پرنھتا سبھا کی اکر کردگی اور اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''جب ایم جی رانا ڈے اور آر جی بھنڈارکر کی طرح کی اہم شخصیتیں اس میں شامل ہوگئیں تو اس حقیقت اور طاقت بڑھ اور سرگرمیوں مجیں اضافہ ہوگیا۔ اس انجمن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے ایک اخبار سبودھ پتریکا شروع کیا گیا اور محنت کش طبقہ کو تعلیم دینے کے لیے ایک شپن ہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ 1882ء میں سماج نے تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ایک باصلاحیت خاتون پنڈتا رام بائی نے ''آریا مہیلا سماج'' قائم کرنے میں بڑی مدد کی۔ جلد ہی کچھ روشن خیال اور تعلیم یافتہ اشخاص اس انجمن میں شامل ہوگئے اور سماجی اصلاح اور سماجی بہبود کے کاموں کو تقویت پہنچائی۔''(23)

دادا بھائی نوروجی: ۱۸۲۵ء تا ۱۹۱۷ء

دادا بھائی نوروجی ہندوستانی قوم پرستی کے اولین معماروں میں ہیں۔ ان کا شمار بمبئی کے سماجی مصلحین میں سرفہرست ہے۔ انہوں نے شروع ہی سے سماجی اور سیاسی مسئلوں میں گہری دلچسپی لی۔ انہوں نے پارسی مذہب میں اصلاح کے لیے ایک انجمن بنائی اور پارسی اسوسی ایشن قائم کیا۔ اس انجمن نے خواتین کو قانونی حیثیت دینے اور قانونی وراثت اور شادی کا حق دینے کا مطالبہ کیا۔ دادا بھائی نوروجی نے ہندوستان کی تعمیر نو کے لیے زبردست جدوجہد کی اور اسی کی وجہ سے سارے ہندوستان کے واجب الاحترام اور مقبول عام قومی رہنما بن گئے۔

مہادیو گووندرانا ڈے: ۱۸۴۳ء تا ۱۹۰۱ء

مہادیو گووندرانا ڈے انیسویں صدی کے ہندوستان کے سب سے زیادہ قدآور دانشور تھے۔ وہ ۱۸۴۲ء میں ناسک میں پیدا ہوئے۔ وہ ایک نامور محقق ماہر تعلیم اور فاضل معاشیات تھے۔ لیکن ان کو شہرت بہ حیثیت سماجی مصلح ہونے کے حاصل ہوئی۔ وہ مذہبی اور سماجی اصلاح سے دلچسپی لیتے تھے۔ وہ ان خرابیوں اور اوہام پرستوں کے خلاف بڑی ثابت قدمی کے ساتھ جنگ

کرتے رہے جن پر ہندوستانی سماج کی ناگفتہ بہ حالت کی ذمہ داری تھی۔ وہ شادی بیوگان کے زبردست حامی تھے۔ان کے خیال میں سماجی اصلاح سیاسی آزادی پر مقدم تھی۔

رام کرشن پرم ہنس:۱۸۳۶ءتا۱۸۸۶ء

رام کرشن پرم ہنس ایک سادھو قسم کے آدمی تھے۔ وہ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے اور پچاس سال کی عمر۱۸۸۶ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔اس بے یار و مددگار ہندبھکت نے بنگال کو ہلا دیا وہ بار بار اسی بات کو دہراتے تھے کہ خدا تک پہنچے اور نروان یا نجات حاصل کرنے کے بہت سے راستے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ انسان کی خدمت خدا کی خدمت ہے۔اس لیے کہ انسان میں خدا کا پرتو ہے۔رام کرشن پرم ہنس کے تعلق سے ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں:

''صرف اتنا ہی نہیں کہ دکشنیشور کے مندر میں جہاں وہ رہتے اور پوجا کرتے تھے جوق در جوق آنے والوں کے لیے وہ چراغ ہدایت کا کام کرتے تھے بلکہ انہیں صبر وسکون کے ساتھ تکلیفوں اور دکھوں کو برداشت کرنے اور روحانی اطمینان ومسرت حاصل کرنے میں بھی مدد دیتے تھے۔اسی کے ساتھ ان کے اندر مغرب سے متاثر متوسط طبقے کے لیے بھی کشش تھی۔ جو ان کی انکساری انسان دوستی اور روحانی دیانت داری سے بڑے متاثر تھے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ نریندر ناتھ دن (بعد میں جو وویکانند کے نام سے مشہور ہوئے) کیشب چندر اور دوسرے لوگ یا تو ان کے ساتھ رہنے کو آئے تاکہ ان کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں یا ان کا اتنا اثر قبول کیا کہ خود ان کا نقطہ نظر بدل گیا''(24)

ویویکانند:۱۸۶۳ءتا۱۹۰۲ء

رام کرشن کے ایک عظیم شاگرد سوامی ویویکانند تھے۔ان کی پیدائش۱۸۶۳ء میں ہوئی اور کلکتہ میں تعلیم پائی۔ استاد کے انتقال کے وقت ان کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔ اسی وقت انہوں نے عزم مصمم کرلیا تھا کہ میں اپنے استاد کی تعلیمات کی نشر واشاعت کے لیے اپنی زندگی وقف کردوں گا۔ چنانچہ انہوں نے دنیا کو ترک کردیا اور سیر وسیاحت کی زندگی گزارنے لگے ارو ہمالیہ جنگلوں میں سکونت اختیار کرلی۔ ان کا کہنا تھا کہ علم کے ساتھ ساتھ عمل نہ ہو تو وہ علم بیکار

ہیت۔اپنے گرو کی طرح وہ بھی بآواز بلند کہرتے تھے کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ ڈاکٹر تاراچند لکھتے ہیں۔

''۱۸۹۳ء میں وہ امریکہ گئے اور شکاگو میں منعقد ہونے والی مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ میں حصہ لیا۔ان کی تقریر ہندوستان کی وسیع النظری کی عکاس تھی۔جس نے سامعین کے دلوں کو موہ لیا۔انہوں نے کہا''جس طرح مختلف دریاؤں کا پانی سمندر میں مل جاتا ہے اسی طرح مختلف مذاہب کی منزل خدا ہے''نیویارک ہیرلڈ نے لکھا تھا''مذاہب کی پارلیمنٹ میں بلاشبہ ویویکانند کی شخصیت سب سے قدآوار ہے۔ان کی تقریر سننے کے بعد ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان پڑھے لکھے لوگوں کی قوم کے لیے مشنری بھیجنا کتنی بڑی حماقت ہے۔''(25)

اسی طرح ویویکانند نے سب سے بڑھ کر سماجی کاموں پر زور دیا اور اس وقت کے سماج میں پائی جانے والی برائیوں کو ختم کرنے کی پوری کوشش کی۔ ویویکانند ذات پات کے نظام' رسومات اور موجودہ ہندوؤں کے اصرار کی سخت مذمت کرتے تھے اور لوگوں کو ترغیب دیتے تھے کہ وہ آزادی' مساوات اور آزادی خیال کے تصورات کو اپنائیں۔ ۱۸۹۶ء میں ویویکانند نے سماجی کاموں اور انسان دوستی کی امدادی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کی خاطر رام کرسن مشن قائم کیا۔

ملک بھر میں اس مشن کی بہت سی شاخیں تھیں جو مستقل سماجی کام کرتی رہتی تھیں۔ مثلاً اسکول کھولنا' اسپتال قائم کرنا' یتیم خانے اور لائبریریاں وغیرہ بنوانا۔ اس طرح یہ مشن ذاتی نجات سے زیادہ سماجی خدمت اور سماجی بہبود پر زور دیتے تھے۔

شمالی ہندوستان میں اصلاحی تحریک:

آریہ سماج: شمالی ہندوستان میں اصلاح کا بیڑا''آریہ سماج'' نے اٹھایا۔ اسے ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی نے قائم کیا تھا۔

سوامی دیانند سرسوتی بت پرستی' رسومات' پنڈت اور پروہتوں کے خلاف تھے۔ خاص کر ذات پات کے بھید بھاؤ اور اس عام فہم ہندوازم کے مخالف تھے جس کا پرچار برہمن کرتے تھے۔ انہوں نے لوگوں کی توجہ ان مسائل کی طرف متوجہ کرائی جو موجودہ دنیا میں رہنے والے انسانوں

کے مسائل تھے۔ وہ مغربی سائنس اور علم حاصل کرنے کے حق میں تھے۔

سوامی دیانند کے اکثر پیروکاروں نے بعد کے برسوں میں ملک میں بہت سے کالج اور اسکول کھولے تاکہ مغربی ڈھنگ کی تعلیم دے سکیں۔ اس سلسلہ میں لالہ ہنس راج نے بہت اہم رول ادا کیا تھا۔ دوسری طرف ۱۹۰۲ میں سوامی سردھانند نے تعلیم کے زیادہ رواتی نظریات کے لیے ہریدوار کے قریب گروکل کی بنیاد ڈالی۔ آریہ سماج کے ماننے والے سماجی اصلاحوں کے زبردست علمبردار تھے اور خواتین کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے اور تعلیم نسواں کو وسعت دینے کے لیے پوری.....ہی سے کام کرتے تھے۔ انہوں نے چھوت چھات کے خلاف جدوجہد کی وہ ذات کو موروثی ماننے اور اس سلسلہ میں کڑپن کا رویہ اپنانے کے سخت خلاف تھے۔ مختصر یہ کہ وہ سماجی مساوات کے حامی تھے اور انہوں نے سماجی بھائی چارے اور اتحاد کو فروغ دیا اور تقویت پہنچائی۔ انہوں نے عوام میں خود اعتمادی اور عزت نفس کا جذبہ بھی پیدا کیا۔ اس سے قوم پرستوں کو بڑی تقویت ملی۔

تھیوسوفیکل تحریک:

اس زمانہ میں ایک اور مذہبی تحریک سے ہم متعارف ہوتے ہیں جس کا نام تھا تھیوسوفیکل تحریک۔ یہ تحریک رہا سنہا نے متصحدہ امریکہ میں بنائی گئی تھی اور تحریک کے بانی مادام بلاؤسکی اور کرنل ان کوٹ تھے۔ یہ تحریک تعلیم یافتہ طبقہ میں زیادہ مقبول ہائی۔ جنوری ۱۸۷۹ء میں اس تحریک کے بانی ہندوستان آئے اور مدراس میں اس سوسائٹی کا صدر دفتر کھولا۔ جلد ہی اس کی شاخیں پورے ہندوستان میں پھیل گئیں۔ اس تحریک نے ہندوستانمیں مادام اینی بیسنٹ کی رہنمائی میں بہت ترقی کی۔ جہاں وہ گئیں انکا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ اتنی پرکشش شخصیت اور غیر معمولی خطابت کی بنا پر انہوں نے بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سوسائٹی میں شامل کرلیا جو انہیں اپنا گرو اور اپنا رہنما سمجھنے لگے۔ انہوں نے اس تحریک کو بہت تقویت پہنچائی۔ ہندوستان میں مادم بیسنٹ کے بہت سے کارناموں میں سے ایک کرنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بنارس میں سینٹر ہندو اسکول قائم کیا بعد میں مدن موہن مالویہ نے اس اسکول کو ترقی دے کر بنارس ہندو یونیورسٹی میں بدل دیا۔

اس تحریک کی رہنمائی مغربی شخصیتوں کے ہاتھ میں تھی جو ہندوستان کی مذہبی اور فلسفیانہ روایت کو بڑی عظمت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس تحریک نے ہندوستانیوں میں خودداری اور اپنے ماضی پر فخر کے جذبات پیدا کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

سرسید احمد خاں:

مذہبی اصلاحوں کی تحریکیں مسلمانوں میں بہت دیر سے ابھریں۔ مسلمانوں کا اعلیٰ طبقہ مغربی تعلیم اور تہذیب کے قریب جانے سے کتراتا تھا۔ البتہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد ان کے یہاں مذہبی اصلاح کے جدید خیالات نے سر اٹھانا شروع کیا۔ اس رجحان کی ابتداء ۱۸۶۳ء میں کلکتہ میں محمڈن لٹریری سوسائٹی (ادبی انجمن) کے قیام کے ساتھ ہوئی۔ اس سوسائٹی میں جدید خیالات کی روشنی میں مذہبی، سماجی اور سیاسی مسائل پر مباحثے اور تبادلہ خیال ہوتے تھے اور اعلیٰ اور درمیانی طبقے کے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنے کے اقدامات کئے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں سب سے اہم مصلح سید احمد خاں تھے۔ سید احمد خان انیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلم رہنما تھے۔ وہ قدامت پرستی کے شدید مخالف تھے۔ اور تجدد کے علمبردار تھے۔ وہ نہ صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کریں بلکہ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ انگریزی تمدن اور طرز معاشرت کو بھی اختیار کرلیں اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ زور دیتے تھے کہ مسلمان حکومت کے ہمیشہ وفادار رہیں۔ سید احمد خان کا پختہ خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمان اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتے اور اپنی پسماندگی اور زبوں حالی دور نہیں کرسکتے جب تک وہ تعلیمی میدان میں ترقی نہ کریں اور پرانے طریق تعلیم کو ترک کرکے جدید تعلیم حاصل نہ کریں۔ ایک افسر کی حیثیت سے انہوں نے بہت سے شہر اور قصبوں میں اسکول قائم کئے اور مغرب کی بہت سے کتابوں کے ترجمے اردو میں کروائے۔ ۱۸۵۷ء میں انہوں نے مغربی علوم اور تہذیب کے لیے علی گڑھ میں محمڈن اینگلو اوینٹل کالج قائم کیا بعد کے برسوں میں یہ کالج ترقی کرتے ہوئے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بن گیا۔

سید احمد خان نے سماجی برائیوں کو روکنے کے لیے بھی کام کیا۔ انہوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ قدامت پرستی، پرانے ریت ورواج اور فکر وخیال کو چھوڑ دیں۔ ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی لکھتے ہیں:

''اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق کے ذریعہ انہوں نے سماجی اصلاح کی تجاویز پیش کیں۔ انہوں نے تمدن، تعلیم، کھانے کے آداب، رسوم ورواج، قومی ہمدردی اور قومی یکجہتی، آزادی، تقریر اور تحریر، قومی اتحاد اور اتفاق، نفاق، غلامی، عورتوں کے حقوق پر مدلل مضامین لکھے اور ان مسئلوں کے بارے میں تفصیل سے اپنے نقطہ نگاہ کو پیش کیا'' (26)

سید احمد خاں نے عورت کی سماجی حیثیت بلند کرنے پر خاص زور دیا اور پردے کا رواج ختم کرنے اور تعلیم نسواں کے عام کرنے کی وکالت کی۔ وہ کثرت ازدواج اور بہ آسانی طلاق دینے کے رواج کی بھی سکت بھر مذمت کرتے تھے۔

ڈاکٹر محمد اقبال: ۱۸۷۷ء سے ۱۹۳۸ء

ڈاکٹر محمد اقبال جدید ہندوستان کے ایک عظیم شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ جہاں مسلمانوں کی نئی نسل کے فلسفیانہ اور مذہبی افکار پر گہرا اثر ڈالا وہیں پر برادران وطن کو بھی اپنی شاعری سے متاثر کیا۔ انہوں نے ہمیشہ روایت پرستی کی اور دنیاداری کے طور طریقوں کی مذمت کی اور انسان کو حوصلہ اور ولولہ دیا کہ وہ اس عالم انسانی کو رنگین وخوش آرا بنائے۔

اقبال بے پردگی اور آزادی نسواں یا مرد وزن کے اختلاط کے سخت مخالف تھے۔ انکی نظر میں اس سے اخلاق تباہ و برباد ہو جاتا ہے اور اس سے جنسی یا صنفی انارکی پھیلتی ہے۔ مرد ہی عورت کے محافظ ہیں۔ جس قوم میں انسانیت کے فتنہ کا زور ہوتا ہے اس کا زوال ہو جاتا ہے اور بالآخر انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔

سکھوں میں مذہبی اصلاحات:

سکھوں میں جب ہم مذہبی اصلاحات کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں بھی بہت سی اصلاحات ہوئیں۔ سکھوں میں مذہبی اصلاحات کی ابتداء ۱۹ ویں صدی کے آخری برسوں میں امرتسر خالصہ کالج کے قیام سے ہوئی۔ لیکن اصلاحی مہم کی رفتار ۱۹۲۰ کے بعد تیز ہوئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ عبادت گزار اور دین دار سکھوں نے ان گردواروں کو بہت ساری زمین اور چندے دے رکھے تھے لیکن بدقسمتی سے اس کا انتظام بہت ہی بدعنوان اور خودغرض مہنتوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا اور وہ یہ کام نہایت جابرانہ انداز سے کر رہے تھے۔ سکھ عوام نے اکالیوں کی رہنمائی میں 1921ء میں مہنتوں کے اور سرا کر کے خلاف ایک زبردست ستیہ گرہ شروع کی کیونکہ سرکار ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔ اس سے اکالیوں

کا مقصد سکھوں کی عبادت گاہوں یعنی گردواروں کے نظم ونسق کو صاف ستھرا اور پاکیزہ بنانا تھا۔

اکالیوں نے سرکار پر اتنا زور ڈالا کہ ۱۹۲۲ء میں سرکار کو ایک نیا ''گردوارہ ایکٹ'' پاس کرنا پڑا۔ جس میں ۱۹۲۵ء میں مزید تبدیلیاں کی گئیں۔ سکھوں نے کچھ تو اس ایکٹ کی مدد سے اور بہت کچھ براہ راست اپنی سرگرمیوں کے ذریعہ ان بے ایمان مہنتوں کو گردواروں سے نکال کر باہر کیا۔ انہوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے سینکڑوں جانیں تک قربان کر دیں۔

گذشتہ صفحات میں جن اصلاحی تحریکوں اور اصلاح پسند افراد کا ذکر آیا ہے ان کے علاوہ اٹھارہویں اور بیسویں صدی میں بھی اس قسم کی اور بھی متعدد تحریکیں ابھریں اور بہت سے مصلحین نے بھی اسی قسم کے اصلاحی کارنامے انجام دیئے۔

ان اصلاحی تحریکوں نے مذہبی مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا اور ساتھ میں ہندوستانیوں میں عزت نفس، خود اعتمادی اور اپنے ملک پر نازاں ہونے کا جذبہ بھی جگایا۔

☆☆☆

حوالہ جات باب دوم

(1) پروفیسر ظفر احمد نظامی' تاریخ ہند، ص ۱۳

(2) پروفیسر ظفر احمد نظامی، تاریخ ہند، ص ۱۱۳

(3) شوکت علی فہمی، نگریزوں کا شرمناک دور حکومت' ص 193

(4) مولانا اسیر ادروی، تحریک آزاد اور مسلمان، ص 194

(5) پروفیسر پپن چندر' حصول آزاد کے لیے ہندوستان کی جدوجہد' ص 193

(6) تاراچند' مترجم عدیل عباسی' تاریخ تحریک آزادی ہند' ص 693

(7) پروفیسر پپن چندر' مترجم سعید احمد انصاری' حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد، ص 199

(8) پپن چندر' مترجم خدیجہ عظیم، ص 360

(9) پروفیسر ظفر احمد نظامی' تاریخ ہند' ص 144

(10) پپن چندرا، مترجم خدیجہ عظیم، جدید ہندوستان، ص ۳۸۳

(11) پپن چندرا مترجم خدجہ عظیم، جدید ہندوستان، ص ۲۵۷

(12) پپن چندرا، مترجم خدیجہ عظیم، جدید ہندوستان، ص ۲۱۳۔

(13) ڈاکٹر تاراچند، مترجم غلام ربانی تاباں، تاریخ تحریک آزاد ہند، ص ۲۷۷

(14) پپن چندرا، مترجم خدیجہ عظیم، جدید ہندوستان، ص ۲۲۱

(15) ارجن دیو، مترجم پروفیسر ظہیر احمد نظامی، عصری تاریخ عالم، ص ۳۳

(16) پپن چندرا، مترجم خدیجہ عظیم، جدید ہندوستان، ص، ۲۸۲

(17) ارجن دیو، مترجم پروفیسر ظہیر احمد نظامی، عصری تاریخ عالم، ص ۳۷

(18) ارجن دیو مترجم پروفیسر، ظفر نظامی، عصری تاریخ عالم ص ۸۷

(19) پروفیسر پپن چندر، مترجم سعید احمد انصار، حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد، ص 67

(20) ظفر احمد نظامی، تاریخ ہند عہد جدید، ص 61

(21)بپن چندرا، جدید ہندوستان، ص251

(22)ڈاکٹر تاراچندر، تاریخ تحریک آزادی ہند، ص333

(23)ڈاکٹر تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند، ص334

(24)ڈاکٹر تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند، ص344

(25)ڈاکٹر تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند، ص346

(26)ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی، جدید ہندوستان کے سیاسی وسماجی افکار، ص35

☆☆☆

باب سوم

مختلف تحریکات ورجحانات اور تحریک آزادی کے اردو ناول

باب سوم
مختلف تحریکات ورجحانات اور تحریک آزادی کے اردو ناول

ذیلی ابواب:

سرسید تحریک

۱۸۵۷ء کی ناکام پہلی جنگ آزادی کے بعد مسلم قوم کے محسن اور اردو ادب کے مسیحا سرسید احمد خان کی مسلسل کوششوں اور بے مثال قربانی سے سرسید تحریک وجود میں آئی۔ سرسید احمد تحریک وجود میں آئی۔ سرسید احمد خان نے اپنی اصلاحی کوششوں کا مرکز علی گڑھ کو بنایا۔ یہ تحریک باضابطہ طور پر ۱۸۷۰ء سے شروع ہوئی۔ یہ تحریک اپنے وقت کا تقاضا اور اس زمانے کی ایک اہم ضرورت تھی۔ ۱۸۵۷ء اس جنگ آزادی میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ لیکن اس انقلابی ہنگامہ کے بعد سارا الزام مسلمانوں کے سر آیا اور انگریز حاکموں نے مسلمانوں کو پیس کر رکھ دیا۔ انگریزوں نے اس جنگ آزادی کا انتقام لینے کے لیے مسلمانوں پر بے پناہ ظلم وستم ڈھائے جس کی مثال شاید ہی دنیا کی تاریخ میں مل سکے۔ انگریز ہندوستان کے جس شہر میں بھی داخل ہوئے انہوں نے اندھا دھند عوام کا قتل عام کیا۔ انگریزوں کے ظلم وستم کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ جب نانا صاحب انگریزوں کے ہاتھ نہ آسکا تو انگریزوں نے نانا صاحب کی لڑکی کو پکڑ کر زندہ جلا دیا۔ بے گناہ پھانسی پر چڑھا دیئے گئے۔ بے شمار مسلمانوں کو ملازمتوں، جانداروں اور زمینوں وغیرہ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ان حالات میں مسلمانوں میں ایک ایسا انسان بھی تھا جس نے مسلمانوں پر ہونے والے اسی ظلم وستم کو بہت قریب سے دیکھا تھا اس کا دردمند دل بے چین ہوا تھا۔ ایک مدت تک سوچتا رہا کہ کیا کیا جائے۔ ہمت نے ساتھ دیا۔ سب سے پہلے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ انگریزوں کے ذہنوں دماغ سے یہ بات نکالی جائے کہ مسلمان ان کے بدخواہ نہیں ہیں تاکہ انگریزوں کا غم وغصہ کچھ کم ہو۔ اس سلسلہ میں انہوں نے

مضامین لکھے، کتابیں لکھیں، انجمنیں قائم کیں۔تا کہ مسلمان خواب غفلت سے بے درد ہو۔کاہلی، سستی اور جمود کو توڑے۔ایسے مرد بزرگ کا نام سرسید احمد خان تھا۔سرسید احمد خان کوششوں سے مسلمان پیدا ہوئے اور ترقی کے راہ پر گامزن ہوئے۔سرسید کی اس کوشش کو کو ہی سرسید تحریک کہا جاتا ہے۔سرسید تحریک اصل میں ایک اصلاحی تحریک تھی۔اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں میں جو خرابیاں پیدا ہو گئیں ہیں ان کو دور کر دیا جائے۔

سرسید احمد خان نے اس موقع پر مکمل دانشمندی کا ثبوت دیا وہ پہلے ایسے شخص تھے جنہوں ں ے برطانوی دور میں مسلمانوں کی اس ابتر حالت کو محسوس کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی قائم کو ایسی بنیادوں پر قائم کیا کہ اس یونیورسٹی پر طالب علم اپنی شخصیت میں ایک تحریک ثابت ہو اور ایسا ہی ہوا۔

سرسید تحریک کے بانی سرسید کے قلم سے رسالہ

اسباب بغاوت ہند، منظر عام پر آیا۔جس میں انگریزوں کے اس نظریہ کو بدلنے کی کوشش کی جس کا عتاب مسلمانوں پر کہ مسلمان آپ کے دشمن نہیں ہیں بلکہ اس کے وجوہات دو تھیں۔ سرسید تحریک کی بنیاد ہی اس بات پر تھی کہ انگریز ہندوستان میں ہمیشہ رہیں گے ان کو نکالنے کی کوشش اپنے ہاتھوں موت کو دعوت دینا ہے۔چنانچہ سرسید اور ان کے رفقاء محسن الملک، حالی ،نذیر وغیرہ نے اس نظریہ کی خوب تشہیر کی اور مسلمانوں کو وفادار رعایا بنانے کے لیے ہر طرح کی کوشش کی۔مولانا حالی نے اپنی تصنیف حیات جاوید میں اس موقف کو اس طرح بیان کرتے ہیں :

> ''سرسید نے قسم دے کر نواب سے کہا کہ میں صرف تمہاری خیر خواہی کے لیے کہتا ہوں آپ اس ارادے کو دل سے نکال ڈالیں۔انگریزوں کی عمل داری ہرگز نہیں جائے گی اگر فرض کر لیا جائے کہ تمام ہندوستان سے انگریز چلے جائیں گے تو بھی انگریزوں کے سوا ہندوستان میں کوئی عمل داری نہیں کرے گا۔(1)

سرسید احمد خان کی دلی خواہش تھی کہ مسلمان اعلیٰ مقام پر فائز ہوں اور مسلمانوں نے جو اپنا

وقار کھو دیا ہے اسی کو دوبارہ حاصل کر لیں اس مقصد کے حصول کیلیے سرسید احمد خان نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ چنانچہ سرسید تحریک کا جب ہم تفصیلی جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس تحریک کے پانچ مختلف پہلو تھے۔ تعلیم، سیاست، ادب اور معاشرت۔ ان پانچ پہلوؤں پر تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے ان کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

تعلیم

سرسید احمد خان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی بدحالی کی سب سے بڑی وجہ تعلیم جیسی عظیم نعمت سے محرومی ہے۔ سرسید احمد خان کے نزدیک جدید تعلیم ہر درد کی دوا اور ہر دکھ کا علاج ہے۔ سرسید احمد خان مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ و پیراستہ کرنے کے لیے دل و جان سے مشغول ہو گئے چنانچہ سرسید احمد خان نے ۱۸۶۱ء میں ایک انگریزی اسکول مراد آباد میں اور ۱۸۶۴ء میں دوسرا اسکول غازی پور میں کھولا۔

سرسید احمد خان کا سب سے بڑا کارنامہ علی گڑھ کالج ہے۔ پنشن لینے کے بعد انہوں نے ہمہ تن ہو کر اس کالج کی ترقی کے لیے بھرپور کوشش کی۔ ۱۸۷۷ء میں کالج کا سنگ بنیاد لارڈ لیٹن نے رکھا۔ اس وقت سے سرسید نے مرتے دم تک جس جانکاہی اور دوراندیشی سے اس کالج کی ترقیوں کی فکر کی اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس کالج میں جدید مغربی علوم اور قدیم مشرقی علوم دونوں کی تعلیم کا بندوبست تھا۔ اس کا پہلا شعبہ خوب ترقی کیا لیکن دوسرا شعبہ آپ سے آپ ہی ختم ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ سرسید احمد خان، مغربی تعلیم کو ہی مفید اور کارآمد سمجھتے تھے چنانچہ ان کو تمام تر توجہ پہلے شعبہ پر ہی ہوئی اور وہ پروان چڑھتا رہا۔ سرسید کا یہ کالج، ترقی کے منازل طئے کرتا ہوا مسلم یونیورسٹی بن گیا اور آج بھی ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

سائنٹی فک سوسائٹی:

۱۸۶۳ء میں سرسید احمد خان کا تبادہ غازی پور میں ہوا تو انہوں نے وہاں پر سائنٹی فک سوسائٹی قائم کی۔ یہ سوسائٹی جس کا مقصد انگریزی اور دیگر زبانوں کی کتب کے اردو تراجم کرنا تھا تا کہ لوگوں میں سائنس میں شغف پیدا ہوا اور یہ کام ایک منصوبہ بند طریقہ پر شروع کیا گیا

تھا۔ دوسال بعد جب سرسید احمد خان علی گڑھ منتقل ہوئے تو یہ سوسائٹی بھی علی گڑھ منتقل ہوگئی۔

سیاست:

سیاست کے تعلق سے سرسید احمد خان کا خیال یہ تھا کہ مسلمان سب سے پہلے تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں اور اپنے آپ کو سیاست سے دور رکھیں۔ سرسید احمد خان کو اس بات کا شدید اندیشہ تھا کہ مسلمان آزادی کی تحریک میں اگر اپنے آپ کو شامل کریں گے تو جوشیلی طبیعت کے مالک ہونے کی وجہ سے پیش پیش رہیں گے اور ظالم حکمراں کے ہاتھوں زیادہ سے زیادہ تباہ و برباد ہوں گے جیسا کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں دیکھا گیا۔

لہٰذا جب کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کا مسئلہ آیا تو تقریباً سرسید احمد خان دوسال تک خاموش رہے پھر بعد میں مسلمانوں کو کانگریس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ سرسید کے اس فیصلے میں تھوڑی غلطی فہمی بھی ہوئی کہ سرسید انگریزی حکومت کے حامی اور تحریک آزادی کے دشمن ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ سرسید تو یہ چاہتے تھے کہ پہلے مسلمان تعلیم حاصل کر کے اس قابل ہو جائیں کہ حکومت کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔ جلد ہی وہ زمانہ بھی لوگوں نے دیکھا کہ جب نئی نسل تعلیم حاصل کر کے نکلی اور اس نے سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور جنگ آزادی میں زبردست کارہا نمایاں انجام دیئے۔ ہندوستان میں مکمل آزادی کا نظریہ پیش کرنے والا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ہی ایک فرد تھا۔ جس کو لوگ حسرت موہانی کے نام سے جانتے ہیں۔

مذہب:

سرسید تحریک کا ایک زاویہ مذہبی نوعیت کا بھی تھا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے تبیین الکلام بائبل کی تفسیر لکھی۔ قرآن کریم کی بھی تفسیر لکھی۔ نصف قرآن تک پہنچے تھے کہ عمر نے وفا نہ کی قرآن کی تفسیر لکھنے کا سرسید کو کیوں خیال پیدا ہوا اس تعلق سے وہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''دینیات کی تعلیم کا سوال نہایت مشکل ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ کتب سنی وشیعہ اس قابل نہیں ہیں کہ بعد تعلیم علوم جدیدہ کسی مسلمان کا اعتقاد قلبی اسلام دار ہے۔ صرف معتزلین کے اصول مذہب اور کتابیں کسی قدر عمدہ معلوم ہوتی ہیں مگر موجود نہیں ہیں خیال مجھ کو

باعث ہوا کہ میں نے قرآن مجید کی تفسیر لکھی ہے۔(2)

اس کے علاوہ کیمیائے سعادت ۔ کا ترجمہ کیا اور مذہبی نوعیت کے بہت سارے مضامین لکھے مگر اس کا سلسلہ میں سرسید احمد خان نے جو کچھ لکھا اس سے مسلمانوں میں بڑ برہمی پیدا ہوئی اوران کو کافر، ملحد اور بے دین تک کہا گیا۔ وجہ تھی کہ جو چیز سائنس کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی تھی اسے رد کر دیا جاتا تھا۔

اصلاح معاشرہ:

سرسید احمد خان کو مسلمانوں کی اصلاح کا خیال شروع سے ہی تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۶ء میں انگلستان جا کر وہاں کے لوگوں کے اخلاق اور طرز معاشرت کا مطالعہ اس لیے کیا کہ ہندوستان چل کر یہاں عام باتوں کو مسلمانوں میں رائج کیا جائے۔ سال بھر کے بعد ہندوستان واپسی ہوئی اور یہاں آ کر اپنے منصوبے کو پورا کرنے کے لیے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا جس میں مذہبی اور اخلاقی نوعیت کے مضامین ہوا کرتے تھے۔ اس رسالہ کا اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیالات میں وسعت اور ترقی پیدا ہوئی اس رسالہ کے ذریعہ سرسید احمد خان نے برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کی اور قوم کو تہذیب وشائستگی کا راستہ دکھایا۔ اس رسالے کی شدت سے مخالفت ہوئی مگر سرسید نے ہمت نہ ہاری۔ آخر کار کامیابی نے ان کے قدم چومے اس رسالے کے تعلق سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

سرسید نے جس مذہبی اور تعلیمی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا ''تہذیب الاخلاق'' اس کا داعی تھا سرسید کی تمام نزاعی تحریریں اس میں شائع ہوتی تھیں اس لیے یہ پرچہ اس کے قلمی معاونین اوران کی تحریریں بھی متنازعہ ثابت ہوئیں جہاں روشن خیال افراد کے لیے یہ رہنما ثابت ہوا وہاں کٹر اور بے لچک لوگون کے لیے دل جلانے کا باعث بھی بنا۔ تاہم رجحان جریدہ ساز کی حیثیت میں آج بھی اس کی اہمیت مسلم ہے کہ بقول مہدی رفادی نئی نسل تہذیب الاخلاق کی پروردہ ہے۔

اردوادب:

مسلمانوں کی ترقی کے لیے ان کو یہ خیال ہوا کہ جب تک ان کی مادری زبان کی ترقی نہیں ہوگی قومی ترقی بھی مشکل سے ہوگی۔لہٰذاانہوں نے اس کی بھی اصلاح کی فکر کی۔سرسیداحمد خان سے پہلے اردواب میں بے شمال خامیاں تھیں۔رنگین مقفع اور مسجع عبارت عام تھی۔جس میں خیالات کا اظہار آسانی سے نہیں ہوسکتا تھا۔یقیناً مرزا غالب نے خطوط میں سادگی اور سلاست اختیار کی۔لیکن کوئی علمی کارنامہ اس انداز میں مشکل ہی سے لکھا گیا ہوگا۔ہمارے نزدیک سرسید پہلے وہ شخص ہیں جنہوں نے اردونثر میں مضامین کو سادگی،متانت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔

تہذیب الاخلاق سرسید کا جاری کیا ہوا ایک ایسا رسالہ تھا جس نے صرف اچھی عادتوں ،اچھے رہن سہن اور اعلیٰ سے اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی بلکہ اس کے ذریعہ اردونثر کو بہت رقی ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اردوادب کی دنیابدل گئی۔

سرسیداحمد خان نے اردونثر کی اصلاح خود کی۔آسان سلیس نثر کا بہترین نمونہ پیش کیا۔ لیکن سرسید شاعرتو تھےنہیں لہٰذا شاعری کے لیے وہ صرف صلاح ومشورہ ہی دے سکتے ان کی شدیدخواہش تھی کہ کاش کوئی ایسا شاعر پیدا ہوتا جومسلمانوں کو پیدا کرنے کے لیے نظم لکھے۔سر سید کی یہ خواہش پوری ہوئی اورخواجہ الطاف حسین حالی نے اس کام کومسدس مدوجزر اسلام لکھ کر دیا۔اس نظم کوسرسیداپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

رفقائے سرسید:

سرسیداحمد خان کی ان کوششوں کو دیکھتے ہوئے ان کے کچھ رفقاء نے بھی سرسید کے مشن کو آگے بڑھانے میں ان کی ہرطرح سے مدد کی،جن خواجہ الطاف حسین حالی،ڈپٹی نزیراحمد،محمد حسین آزاد،علامہ شبلی اورنواب محسن الملک کے نام قابل ذکر ہیں۔

اردو میں ناول کا آغاز انگریزی ادب سے ہوا۔ڈپٹی نذیراحمد نے اردوادب کوناول سے متعارف کرایا۔ویسےتو ڈپٹی نذیراحمد نے بہت سے کتابیں لکھیں لیکن جن تصانیف نے ان کودائمی

زندگی بخشی وہ ان کے ناول ہیں جن میں مرأۃ العروس ، بنات النعش ،توبۃ النصوح ،ابن الوقت اور رویائے صادقہ ہیں جس زمانے میں مولوی نذیر احمد یہ ناول لکھے اسی وقت سرسید کی اصلاحی تحریک اپنے شباب پر تھی اور یہ خیال عام ہوگیا تھا کہ ادب محض تفریح اور وقت گزاری کا ذیعہ نہیں ہے بلکہ زندگی کوسنوارنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بھی ہے اس لیے اصلاح کا جذبہ مولوی نذیر احمد کے تمام ناولوں دکھائی دیتا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی بھی سرسید احمد خان کے دوستوں میں سے تھے اسی لیے ان کی اصلاحی کوششوں کا اثر ان پر بھی پڑا۔ حالی نے ناول کی شکل میں صرف ایک تصنیف چھوڑی ہے جسے مجالس النار کے نام سے جانا جاتا ہے۔

مولوی نذیر احمد نے اردو میں ناول کی بنیاد ڈالی تو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے اس روایت کوآگے بڑھایا ان کی سب سے مقبول تصنیف فسانۂ آزاد ہے۔انہوں نے بھی اپنے ناولوں کے ذریعہ معاشرہ کی اصلاح کا بیڑہ اٹھایا۔اس کے بعد ناول کا اگلا دور ہے تاریخی ناولوں کا دور ہے مولانا عبدالحلیم شرر،اور محمد علی طیب نے تاریخی ناول لکھ کر اسلام کے شاندار ماضی کو دہرایا۔

اس دور کے ایک اہم ناول نگار راشد الخیری ہیں جن کو مصور غم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔راشد الخیری ،مسلم خواتین پر ہونے والے ،ظلم وستم کے خلاف تھے ۔چنانچہ ہمارے موجود معاشرہ میں جوان کی دردناک حالت تھی ناولوں میں اس کی تصویر کھینچی۔

تحریک آزادی کے ناول

اس مختصر سے جائزہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ سرسید تحریک جس وقت اپنے شباب پر تھی اس سے متاثر ہوکر بہت سے لوگوں نے ناول لکھے جس کی شروعات ڈپٹی نذیر احمد سے ہوکر راشد الخیری تک پہنچتی ہے۔مگر اس طویل دور میں مجھے ابن الوقت کے علاوہ' کوئی ایسا ناول نظر نہیں آتا جس میں جدوجہد آزادی کی عکاسی ہوتی ہو۔اس کی بنیادی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ شاید اس وقت انگریزی حکومت میں ایسا کرنا ممکن نہیں تھا کیوں کہ ہر طرف انگریزوں کے ظلم وستم کی آندھی چل رہی تھی۔ایسے ناموافق دور میں اس وقت کے سیاسی حالات کو بیان کرنا اپنے لیے مصیبت کو

دعوت دینا تھا۔اس سے برہم چند سے پہلے کے تمام ناول نگانوں نے اپنے معاشرہ کی اصلاح پر توجہ فرمائی اور اس کا مثبت نتیجہ سامنے آیا کہ آگے چل کر ایک ایسی نسل وجود میں آئی جس نے ہندوستان کو آزادی دلانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔

رومانی تحریک

رومانیت ایک طرز احساس کا نام ہے۔ یہ سرسید تحریک کی منطقیت اور عقل پسندی کے غلبہ کے ردعمل میں وجود پذیر ہوئی۔ واقعہ یوں ہے کہ اٹھارہویں صدی کی کلاسیکی تحریک ادب کو متعدد مصنوعی قیود میں جکڑ رکھا تھا جس کی وجہ تخلیقی ابال جو زندگی کو تنوع عطا کرتا ہے ان پابندیوں میں اخراج کا راستہ نہیں پا سکا۔ اسی لیے بہت جلد کلاسیکی تحریک کے خلاف رومانی نوعیت کا ردعمل ظاہر ہونا شروع ہو گیا اور جذبہ وتخیل کی وہ رو جسے علی گڑھ تحریک نے روکنے کی کوشش کی تھی سطح پر ابھرے بغیر نہ رہ سکی اور رومانیت کی تحریک کو روز بروز فروغ ملتا چلا گیا۔

رومانیت نے انسانی جذبات کو ان کی انتہائی شکل میں پیش کیا۔ رومانیت نے عشق، آزادی اور سرمستی کو مزاج اور بے راہ روی تک پہنچا دیا۔ رومانی ادیبوں اور شاعروں نے اداسی درد اور حزن وملال جیسے موضوعات کو پیش کیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے ماضی کی روایات میں پناہ لی تو کسی نے عقل وتہذیب کو انسانی بقا کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔

رومانیت کی ابتدا کا سہرا سو کے سر ہے۔ جس نے کائنات کو زنداں تصور کیا اور آزادی کا مرجع دل کو بنایا جس میں انسان کا آزاد تخیل خارج کے جبر سے آزاد تھا۔ روس نے یہ انقلابی نعرہ بھی دیا کہ انسان آزاد پیدا ہوا ہے مگر جہاں دیکھو وہ پایۂ زنجیر ہے۔ یہ نعرہ رومانوی تحریک کے لیے بانگ درد ثابت ہوا اور اسی کا اظہار ادب میں یوں ہوا کہ ادیب معاشرہ کے مطابق خود کو ڈھالنے کے بجائے معاشرے کو اپنی داخل آرزوں کے مطابق بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ رومانیت کی اساسی روح افلاطون کے نظریات میں موجود ہے۔

چنانچہ افلاطون نے انسان کو ایک ایسا پرندہ قرار دیا جو بے پر ہونے کے باوجود قوت پرواز رکھتا ہے تو درحقیقت اس نے انسان کے متخیلہ پر بالواسطہ مہر تصدیق ثبت کرتا ہے۔ رومانیت در

اصل اس کیفیت کو پا لینے کا نام ہے جب انسان کا مادی وجود ہمہ تن جذبہ میں تحلیل ہو کر جسم کو پر لگا دیتا ہے۔

مغربی ادبیات میں جو شاعر و ادیب رومانی تحریک کو فروغ دینے میں آگے آگے نظر آتے ہیں ان میں وہم بلیک، کولرج، ورڈ سورتھ، اور کیٹس وغیرہ کے نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

اردو میں رومانیت کے اولین نقوش ہین میر ناصر علی کلے یہاں آتے ہیں۔انہوں نے عہد سرسید میں رومانیت کے اولین بیج بکھیر، میر ناصر علی کو سرسید کے مشن سے کوئی اختلاف نہیں تھا ان کا موضوع صرف ادب تھا۔ چنانچہ انہوں نے سرسید کی سنجیدہ نثر کا جامد خول توڑنے کی کوشش کی ۔انہوں نے تہذیب الاخلاق کے مقابلے میں ۔ تیرہویں صدی، فسانہ ایام اور صدائے عام وغیرہ رسائل جاری کئے اور ان میں زبان کی خوبی کو خیال کی خوبی پر ترجیح دینے کی کوشش کی اور ادب کی خارجی مادیت کا رخ داخل کی رومانیت کی طرف رخ موڑ دیا۔اسی طرح میر ناصر علی نے رومانوی تحریک کو فروغ دینے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

عہد سرسید میں شدید جذباتی رویہ اور رومانی طرز احساس کی ایک مثال عبدالحلیم شرر ہیں۔ انہوں نے اپنی روح کی آسودگی کا سامان اپنے شاندار ماضی میں تلاش کیا۔

شرر مغربی ادبیات خصوصاً انگریزی اور فرانسیسی ادب سے گہری واقفیت رکھتے تھے اور اس طرح جدید خیالات کے پرزور حامی تھے رومانی ذہنیت کے قریب تھے اور وہی رومانویت ان کی تعلیمات وتحریرات میں ہر جگہ ملتی ہے۔

بیسویں صدی کا زمانہ رومانیت کے لیے بہت سازگار ثابت ہوا اس عہد کے حالات نے فرد کو بے بس ومجبور بنا ڈالا تھا۔فرد کی یہ بے بسی رومانیت کے فروغ میں کافی معاون ثابت ہوئی ۔ چنانچہ اس دور میں ایسے، بہت سے نوجوان ادیب نظر آتے ہیں جنہوں نے اردو زبان کو خاص قسم کی لطافت سے آشنا کیا اور اقت قوت متخلیہ کے بل بوے پر رومانی تصورات کو فروغ دینے کی سعی کی ۔ان نوجوانوں میں ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سجاد حیدر بلدرم، مہدی رفادی، ۔

مجنوں گورکھپوری ، اور سجاد انصاری وغیرہ کی تخلیقات سے ایک مخصوص مزاج اور مخصوص اسلوب متعارف ہوا جو رومانوی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا ان تمام ادیبوں کی فکر کا بنیادی عنصر ماورائیت ہے۔ وہ جب بھی تصویر کھینچتے ہیں تو آبادیوں سے دور نکل کر مناظر فطرت کی گود میں پناہ لیتے ہیں۔

رومانیت کے تعلق سے کہا جاتا ہے کہ میر ناصر علی اور عبدالحلیم شرر کا تعلق رومانیت کی صبح صادق سے تھا تو اقبال اور ابوالکلام آزاد نے اسے صبح صادق کا اجالا عطا کیا اور بلدرم ، سجاد انصاری اور نیاز فتح پوری کے عہد میں نصف النہار کا پہنچی۔

ابوالکلام کی نثر میں رومانیت کے عناصر موجود ہیں۔ غبار خاطر میں رومانیت کے بہترین نمونے ملتے ہیں ان کی نثر سطوت ، جلوت اور عظمت کی مظہر ہے۔

نیاز فتح پوری کے ناول پر تصنع و پر تکلف کی زندگی کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ ان میں واقعات بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی وہ کسی جذباتی کشمکش کو مکمل خاریت کے ساتھ پیش نہیں کرتے ۔ بلکہ فلسفیانہ خیالات اور تصوراتی مباحث کے لیے محض وسیلہ کا کام دیتے ہیں۔ ان کا ناول ایک شاعر کا انجام ، رومانی تحریک کے کے پر شکوہ اسلوب اور پر تصنع ماحول کا مظہر ہے۔

قصے میں فارسی تراکیب کا استعمال اور پر جمال فضائی تخلیق پر قوت صرف کی گئی ہے۔ وہ فن کے اخلاقی یا غیر اخلاقی ہونے پر جس بیان کو ترجیح دیتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری نے اسی حسن کی بنا پر نیاز کو جمالیاتی ذیشان کا بانی کہا ہے۔

الفاظ کے انتخاب میں خوش سلیقگی ، شوکت اور آرائش سجاد حیدر بلارم کے یہاں نمایاں ہے۔ انہوں نے اردو نثر میں رومانویت کی اساس پر ایک طرح نو کا اہتمام کیا۔ رومانیت بلدرم کی شخصیت بھی ہے اور ان کے اسلوب کا فن بھی ہے۔ انہوں نے دور کو نسائیت ، شعریت اور لطافت کا مجسمہ بنا کر پیش کیا ہے۔

مہدی افادی کی رومانیت حواس انسانی ادراک کا زاویہ پیش کرتی ہے۔ انہوں نے فطرت کے تمام حسن کو عورت کی مادی شکل میں دیکھا ہے اور اسے سچائی کے ساتھ بیان کر دیا۔ ان کے

یہاں فکر کی ہر معدوم ہے۔اوران کی تحریروں سے کوئی ٹھوس فلسفہ مرتب نہیں ہوتا۔

''مجنوں گورکھپوری کے ناول زیادہ تر ٹامس ہارڈی کے ناولوں سے ماخوذ ہیں۔تاہم ان کے ناولوں پر نیاز فتح پوری اور بلدرم کی رومانیت کے اثرات بھی واضح نظر آتے ہیں۔مجنوں کی رومانیت میں وفور جذبات کے شانہ بہ شانہ عقلی سطح پر ایک تشکیک اور حقیقت پسندی بھی موجود ہے۔مجنوں چونکہ ترقی پسند فکر سے وابستہ تھے اسی لیے ان کی رومانیت کافی متوازن اور سلجھی ہوئی ہے۔انکی کہانیاں عام طور پر المیہ انجام پر ختم ہوتی ہیں۔مجنوں نے اردو کی رومانی تحریک میں سوز وگداز اور کرب مسلسل کا زاویہ پیش کیا ہے ان کے کردار جراحت سے لذت کشید کرتے ہیں اور بالعموم حسن غم زدہ کے عکاسی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مجنوں کے افسانے میں ایک دردانگیز، لذت موجود ہے اوراس نے اپنے عہد کے نوجوانوں کو شدت سے متاثر کیا ہے''(3)

سجاد انصاری کا شمار ان رومانی ادیبوں میں ہوتا ہے جو پرانے بت توڑ کر نئے بت تراشتے ہیں مسرت محسوس کرتے ہیں۔سجاد انصاری کی روح خاصی تیز ہے اور زندگی کے فلسفہ کو نئی تعبیریں دے کر انہوں نے معنوی طور پر وہ سحر پیدا کیا جو رومانیت کی روح ہے۔ان خوبیوں کی بنا پر انہیں رومانوی تحریک کا ایک اہم ادیب شمار کیا جاتا ہے۔

ان سبھی رومانی ادیبوں کی تحریروں کا جائزہ لینے پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں جذبے اور وجدان کو ہر دوسری چیز پر فوقیت حاصل ہے۔نیز ان ادیبوں کے یہاں خیال کی آزادی اور جہاں کہنہ کو شکست دے کر جہان نو کی تعمیر قدر مشترک طور پر موجود تھی۔

جدوجہد آزادی کے ناول:

اس تحریک کے اثر جتنے بھی ناول لکھے گئے کسی بھی ناول میں جدوجہد آزادی کی عکاسی نہیں ملتی۔اس لیے اس تحریک کے تحت کے لکھے گئے ناولوں پر کسی طرح کا مزید کوئی تنقید یا تجزیہ نہیں پیش کیا جارہا ہے۔

ترقی پسند تحریک:

ترقی پسند تحریک اردو ادب میں ہمہ گیر، منظّم، فعال اور نمایاں تحریک تھی۔اس تحریک کا

اصل مقصد اردو ادب کو زندگی سے قریب لانے، زندگی کا عکاس اور ترجمان بنانا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ہندوستانی عوام میں ذہنی بیداری اور آزادی کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ چنانچہ اس تحریک نے اس عہد کے ہندوستانی عوام اور اردو ادب کے ساتھ ساتھ دیگر ہندوستانی ادب کی تمام زبانوں کو بے حد متاثر کیا۔

بہت سے نقادوں نے ترقی پسند تحریک کو علی گڑھ تحریک کی توسیع قرار دیا ہے۔ علی گڑھ تحریک نے اہل قلم کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ ادیبوں کو خیالی وتصوراتی دنیا سے نکال کر حقیقی دنیا کا ترجمان بنایا۔ یہی سارا کام ترقی پسند تحریک نے بھی کیا۔ اس نے محنت کش انسان کو اپنی تحریروں کی زینت بنایا۔ کسانوں، مزدوروں اور مظلوموں کے مسائل کو کھل کر بیان کیا اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ ترقی پسند تحریک علی گڑھ تحریک کی توسیع ہے تو یہ بات بالکل درست ہے۔

ترقی پسند تحریک پر مزید گفتگو کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس تحریک کو عالمی پس منظر پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس تحریک کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اثرات ملک گیر پیمانے پر رونما ہوئے اور اس انقلاب نے زندگی کے تمام شعبوں پر اپنا اثر ڈالا۔ سیاسی وسماجی حالات پر اثر ڈالنے کے ساتھ ساتھ اس نے شعر وادب میں بھی انقلاب پیدا کیا۔ اردو ادب جو عام طور پر اہل ذوق کی تسکین اور پیار ومحبت کے قصے سے بھرا ہوا تھا ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد ادب نے قوم کو بیدار کرنے کا ذریعہ بنایا اور اس خدمت کو سرسید تحریک نے بحسن خوبی انجام دیا۔ برطانوی حکمرانوں کی آمریت جب حد سے زیادہ بڑھ گئی اور ملک میں بے اطمینانی اور نا آسودگی بڑھتی چلی گئی اور ساتھ ہی عالمی پیمانے پر کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ جس نے دانشوروں اور ادیبوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اب مظلوموں کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہونے کا وقت آ گیا ہے ایسے حالات نے لندن کی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہندوستانی طلباء کے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا اور وہ یہ بات سوچنے پر مجبور ہوئے کہ ہندوستان کے ادیبوں اور دانشوروں کو کس طرح اپنا فرض ادا کرنا چاہیے اس ہندوستانی طلباء کے گروہ نے ایک ادبی حلقہ کی شکل اختیار کر لی اور وہیں لندن میں ان نوجوانوں

نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی ۔ان نوجوانوں میں سجاد ظہیر، ملک راج آنند، ڈاکٹر جیوتی گھوس، پرسودسین گپتا اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر شامل تھے۔

ایک عالمی تناظر میں نورالحسن نقوی رقم طراز ہیں:

''۱۹۱۷ء میں روس میں ایک زبردست انقلاب رونما ہوا اور اس کے محنت کش کی سربراہی میں بادشاہ روس زور کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی حکومت کا تختہ پلٹ دیا۔مزدوروں اور کسانوں کی اس شاندار فتح کی گونج ساری دنیا میں سنائی دی۔دنیا کو پہلی بار خیال آیا کہ محنت کش جس کی تعداد ان گنت ہے متحد ہو کر کھڑے ہوں تو مٹھی بر سایہ داران کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکے۔اس وقت ساری دنیا میں یہ احساس عام ہوا کہ شاعر ادیب جو اپنے سینے میں دردمند دل رکھتا ہے ظالم ومظلوم کی جنگ میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔اسے اپنا فرض نبھانا چاہیے۔ ۱۹۳۵ء میں دنیا بھر کے ادیب پیرس میں جمع ہوئے اس کانفرنس میں ہمارے ملک کی طرف سے ملک راج آنند اور سجاد ظہیر نے شرکت کی یہ دونوں ادیب اس وقت لندن میں قیام پذیر تھے اور کئی دیگر نوجانوں کی مدد سے انجمن ترقی پسند مصنفین بنیاد ڈال چکے تھے۔ہمارے ان دونوں نوجوانوں کی موجودگی میں پیرس کانفرنس نے محنت کشوں کی حمایت کا اعلان کیا۔(4)

اس طویل اقتباس سے یہ بات بالکل واضح ہوگئی کہ لندن کی سرزمین پر کن حالات میں ہندوستانی طلباء نے ترقی پسند مصنفین کی انجمن قائم کی۔انجمن کے قیام کے بعد لندن میں اس انجمن کے باقاعدہ جلسے ہونے لگے۔

۱۹۳۵ء میں لندن کے ناکنگ ریشوراں میں ان کا پہلا اعلان نام تیار کیا گیا۔اس کے چند اہم اقتباسات درج ذیل ہیں۔

''اس وقت ہندوستان میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔پرانے تہذیبی ڈھانچوں کی شکست وریخت کے بعد سے اب تک ہمارا ادب ایک کونہ فراریت کا شکار رہا ہے۔ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دیتے ہوئے ترقی پسندوں کی حمایت کریں۔ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔یہ بھوک،

پیاس، سماجی پستی اور غلام کے مسائل ہیں ۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، ستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں'' ۔(5)

یہ اعلان نامہ ہندوستان کے بہت سے ادیبوں کو بھیجا گیا ۔کئی ادیبوں اور شاعروں نے اس پر دستخط بھی کئے ان میں سے کچھ کے نام یہ ہیں ۔منشی پریم چند، مولوی عبدالحق ، جوش ملیح آبادی، حسرت موہانی، ڈاکٹر عابد حسین ، نیاز فتح پوری، قاضی عبدالغفار علی عباس حسینی ، اور فراق گورکھپوری قابل ذکر ہیں ۔

اس سال سجاد ظہیر اپنی تعلیم مکمل کر کے ہندوستان واپس آ گئے جس سے انجمن کی سرگرمیوں میں اور تیزی آ گئی انہوں نے مختلف ادیبوں سے مراسلے کے ذریعہ رابطہ قائم کیا اور خود بھی ملاقاتیں کیں جن کا خاطر خواہ اثر یہ ہوا کہ مختلف صوبوں میں انجمنیں قائم ہوگئیں ۔ الہ آباد یونیورسٹی میں احمد علی انگریزی کے استاد تھے ۔ان کے گھر کو انجمن کا دفتر بنا دیا گیا ۔ادھر حیدر آباد میں سبط حسن اور بنگال میں ہیرن مکرجی ادب کی اس ترقی پسند تحریک کو فروغ دینے میں مصروف ہو گئے ۔

اس تحریک کی مقبولیت وجہ یہ تھی کہ انگارے کے افسانوں پریم چند کے افسانے کفن پروفیسر مجیب کے افسانوں مجموعہ'' کیمیا گر'' اور اختر حسین رائے پوری کے مضمون'' ادب اور زندگی'' نے پہلے ہی سے راہ ہموار کر دیا تھا ۔اس لیے ملک کے ہر حصہ میں اس تحریک کی خوب پذیرائی ہوئی اور قلیل مدت میں نہ صرف اردو کے بلکہ دوسری زبانوں کے ادیب بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے ۔اب ضرورت تھی ایک کل ہند کانفرنس کی جہاں سب لوگ ایک جگہ جمع ہوں او ادب کے موضوع پر بحث ومباحثہ کریں ۔اسی کے پیش نظر ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا اجلاس لکھنو میں ہوا ۔ پریم چند نے خطبہ صدارت پیش کیا اس کانفرنس میں پریم چند کے علاوہ مولانا حسرت موہانی، جے پرکاش نرائن ، کملا دیوی، جٹو پادھیائے اور دیگر اہل علم نے تقریریں کیں ۔سجاد ظہیر انجمن کے سکریٹری بنائے گئے ۔اس کانفرنس میں پریم چند کا صدارتی خطبہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے ۔انہوں نے ادب کی بنیاد سچائی، آزادی اور انسان دوستی کو قرار دیا اور کہا:

''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے، ہم میں قوت اور حرکت پیدا نہ ہو۔ ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لیے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لیے بیکار ہے۔اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا''(6)

پریم چند نے اپنے خطبہ کو اس یادگار جملے پر ختم کیا جو ایک طرح سے ان کی تمام عمر کا ایک پختہ ادبی شعور تھا:

''ہماری کسوٹی پر وہ ادب پورا اترے گا جس میں تفکر ہو، آزادی کا جذبہ ہو حسن کا جوہر، تعمیر کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روح ہو، زندگی کی حقیقتوں کی روح ہو جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے۔ سلائے نہیں کیوں کہ اب زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔(7)

سجاد ظہیر نے اس صدارتی خطبہ کی تعریف کی اور لکھا کہ:

''میرا اب بھی یہ خیال ہے کہ ہمارے ملک میں ترقی پسند کی غرض وغایت کے متعلق شاید سے بہتر کوئی چیز ابھی تک نہیں لکھی گئی۔(8)

انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کل ہند کانفرنس کی شہر۔ پورے ملک میں ہوئی اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ملک میں جگہ جگہ انجمن کے جلسے اور کانفرنسیں ہوتی رہیں اور ترقی پسندوں کا یہ کارواں اپنی منزل کی طرف گامزن رہا۔

ترقی پسند تحریک بہت کم وقت میں ہندوستان میں مقبول ہوگئی۔ جواہر لال نہرو نے اس تحریک کی تائید کی۔

ترقی پسند ادبی تحریک نے حقیقت نگاری کو باضابطہ اردو ادب میں روشناس کرایا۔ خواب خیال کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں سانس لینا سکھایا۔ نورالحسن نقوی کے الفاظ میں۔

''بہر حال ترقی پسند ادب سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ حقیقت نگاری کو فروغ ہوا۔ ادب کی افادیت پر زور دیا گیا۔ موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا۔ ادب عوام کی امنگوں کا ترجمان بنا اب ادب صرف مسرت حاصل کرنے اور وقت گزاری کا ذریعہ نہ رہا بلکہ زندگی سنوارنیاور بہتر بنانے کا وسیلہ بن گیا''(9)

ترقی پسند تحریک کے اثرات اردو ادب کے تمام اصناف پر پڑے لیکن خاص طور سے افسانہ، شاعر اور تنقید کو آسمانی بلندیوں سے اتار کر زندگی کی خوشبو سونگھنے کی طرف متوجہ کیا اور رومانیت کے بجائے حقائق سے واف کیا۔ ان اصناف کے علاوہ دیگر اصناف پر بھی اس تحریک کے اثرات کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ اس حقیقت نگاری کے رجحان کو بالخصوص ناول کے میدان میں زیادہ فروغ ملا اور ترقی پسند ناول نگاروں نے فن میں گرانقدر اضافے کئے پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی سجاد ظہیر، کرشن چندر، عصمت چغتائی، حیات اللہ انصاری، قرۃ العین، حیدر صالحہ عابد حسین اور قاضی عبدالستار نے بہترین ناول لکھے جو اپنی سیاسی اور سماجی نقطۂ نظر کے اعتبار سے ترقی پسند نظریات کے حامل نظر آتے ہیں۔ اس طرح ادب اور زندگی کا رشتہ ہموار ہوا اور ادب زندگی کا ترجمان بنا۔

تحریک آزادی کے اردو ادب ناول

حقیقی زندگی کو پوری سچائی کے ساتھ پیش کرنے کا کام اردو ناول نگاروں نے شروع سے ہی کیا اور اس ضمن میں پریم چند کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جاسکتا ہے۔ پریم چند نے اردو ناول کو جس مقام تک پہنچایا تھا ترقی پسندوں نے وہیں سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔

اس ضمن میں سب سے پہلے سجاد ظہیر کے ناول لندن کی ایک رات کا ذکر ضروری ہے۔ لندن کی ایک رات (۱۹۳۸) ایک رات کی کہانی پر مشتمل ہے جس میں لندن میں تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

چند ہندوستانی طلباء کے ذہنی انتشار اور جذباتی ونظریاتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ ناول اس زمانے میں لکھا گیا جب ہندوستان میں گاندھی جی کے خیالات قبولیت عا حاصل کررہے تھے۔ گاندھی جی نے اپنے ملک کے نوجانوں کو تشدد ترک کر کے عدم تشدد کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کررہے تھے لیکن ملک میں چند لوگ ایسے تھے جو گاندھی جی کے ان خیالات سے متفق نہیں تھے اور وہ لوگ انقلابی رجحان رکھنے والے تھے۔ خاص طور سے نوجوان طبقہ میں یہ انقلابی رجحان زیادہ پایا جاتا تھا اور یہ انقلابی رجحان تشدد کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ اس لیے کہ

ان نوجوانوں میں اشتراکی خیالات جڑ پکڑ رہے تھے۔اس کی ایک جھلک ناول کے اقتباس میں دیکھی جاسکتی ہے۔

جس میں اعظم اور راؤ کے درمیان گفتگو ہوئی ہے اور اس میں راؤ انہی خیالات کا اظہار کرتا ہے، وہ کہتا ہے:

''وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں کسی کو یہ تک معلوم نہیں وطن کی بھلائی کس چڑیا کا نام ہے۔اس کے لیے کوشاں ہونا تو درکنار۔زنانہ بن کر چرخہ کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا مہاتما گاندھی کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے یا کونسل کی ممبری اور منسٹری میں میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے؟ سرکاری ملازمت میں وطن کی بھلائی ہے؟ یا ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ میں وطن کی بھلائی ہے۔ ہر شخص کے پاس وطن کی بھلائی کا ایک نسخہ ہے ہر شخص معلوم ہوتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہے، ہر شخص پکار پکار کر کہتا ہے کہ وطن کی بھلائی کے لیے کام کررہا ہے۔حد ہوگئی ان کی دیکھا دیکھی انگریز گورنمنٹ تک کہنے لگی کہ وہ بھی ہندوستان کی بھلائی چاہتی ہے اور ملک کی حالت کیا ہے۔ایک طرف تو غربت اور بھوک کا سایہ ملک پر پھیلتا جارہا ہے۔دوسری طرف ظلم و جبر کا جال چاروں طرف سے ہم کو جکڑتا جارہا ہے(10)

اس طویل اقتباس میں پورے شد و مد کے ساتھ عدم تشدد کی پالیسی کو نشانہ بنایا گیا ہے۔اس ناول کا ہر کردار ہمیں کسی نہ کسی طور پر فکرمند نظر آتا ہے۔

اس ناول میں سجاد ظہیر نے جہاں ایک طرف انگریزوں کے دور حکومت کا ذکر کیا ہے وہیں پر نئی معاشی تحریکوں کا بھی ذکر کیا ہے اس ناول کا کینوس اگرچہ بہت زیادہ وسیع نہیں ہے لیکن اس کے باوجود سجاد ظہیر نے اپنے عہد کے نوجوانوں اور طلبہ کے ذہنی انتشار اور داخلی کرب و اضطراب کے پردے میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی، معاشی، مذہبی اور اوخلاقی تمام حالات و کیفیات کو سمیٹنے کی بھرپور کوشش کی ہے اس ناول میں حصول آزادی کے لیے جدوجہد بھی ہے اور سیاسی سماجی اور معاشی نظام کی تبدیلی کی خواہش بھی ہے۔

اس مختصر سے جائزہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جو پہلا ناول

سجاد ظہیر صاحب کے ہاتھوں منظر عام پر آیا اس میں جدو جہد آزادی کی عکاسی موجود ہے۔اس حوالے سے ہم اس ناول پر تفصیلی گفتگو اس مقابلے کے چوتھے باب میں کریں گے جو اس کے لیے مخصوص ہے۔

ترقی پسند ناول نگاروں میں دوسرا اہم نام کرشن چندر کا ہے۔ترقی پسند ناول نگاری کی بنیادوں کو استوار کرنے میں کرشن چندر نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ان کے ناولوں کے ایک طویل فہرست ہے جیسے شکست، جب سھیت جاگے، مزار، طوفان کی کلیاں، دل کی وادیاں سو گئیں۔ایک گدھے کی سرگزشت، ایک عورت ہزار دیوانے، لندن کے سات رنگ اور والکن سمندر کے کنارے وغیرہ۔ان تمام ناولوں میں زندگی کو مختلف اور متنوع پہلوؤں کو مخصوص نقطۂ نظر سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔میری تحقیق اور جستجو کے مطابق ان کے کسی بھی ناول میں جدو جہد آزادی کی عکاسی نہیں ملتی ہے۔جو اس وقت میرا موضوع ہے۔اس لیے کرشن چندر کے ناولوں پر کسی طرح کا تبصرہ نہیں کیا جا رہا ہے۔

ترقی پسند کے اہم ترین ناول نگاروں میں عزیز احمد ایک معتبر نام ہے انہوں نے ہوس، مرمر اور خون، گریز، آگ ایسی بلندی اور ایسی پستی ناول لکھے۔یہ ناول اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتے ہیں۔عزیز احمد کی ناول نگاری میں ایک خاص بات یہ ہے کہ ترقی پسند ناول نگار ہونے کے باوجود اپنے فن پر زبردست گرفت رکھتے ہیں۔عزیز احمد کی ناول نگاری کے تعلق سے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

> ''۱۹۴۷ء تک جو ان کے اہم کارنامے آئے ہیں، ان میں ''ہوس'' مرمر اور خون' ان کے ابتدائی ناول ہیں لیکن گریز اور آگ ایسے ناول ہیں جن میں ان کے فن کا شباب نظر آتا ہے۔یہ ناول ان کی فنی پختگی اور فن کارانہ چابک دستی کی روشن مثالیں ہیں' اس لیے شاہکار کی حیثیت رکھتے ہیں''(11)

عزیز احمد کا ناول ''آگ'' ان کا ایک اہم کارنامہ ہے یہ الگ بات ہے کہ وہ شہرت ومقبولیت نہیں ملی جو ان کے ناول گریز کے حصے میں آئی۔پھر بھی آگ ۱۹۴۵ء میں عزیز احمد کے ہاتھوں سے لکھا گیا ایک شاہکار ہے۔اس ناول میں عزیز احمد نے ۱۹۰۸ء سے لے کر ۱۹۴۲ء کی

کشمیری زندگی کو پیش کیا ہے۔ کشمیر کی تہذیب وثقافت اور کشمیری مسلمانوں کی معاشرت ایک ہی خاندان کی ذریعے اس ناول میں بخوبی سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔

عزیز احمد نے ''آگ'' میں کشمیری زندگی کو مختلف کرداروں کے ذریعہ اس طرح پیش کیا ہے کہ اس ناول میں بے شمار سماجی، تاریخی، سیاسی اور معاشی حقائق آ گئے ہیں۔ اس طرح آگ کشمیری زندگی کے پس منظر میں لکھا گیا ایک سنجیدہ اور اہم معاشرتی ناول بن گیا ہے۔

''اس ناول میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک طویل زمانہ کو ناول نگاری نے صرف تین سو صفحات میں بیان کر کے اپنی فنکارانہ بصیرت ثبوت پیش کیا ہے اور وہ بھی نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ۔ اس ناول میں ناول نگار کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ہندوستان اور دیگر ممالک میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں ان کے پس منظر میں کشمیری زندگی کو پیش کرنے میں بڑی ہنرمندی رکھا ہے۔ نئے حالات نئے نئے خیالات کی بیداری کو جنم دیا اور سیاسی تبدیلیاں کشمیری زندگی میں سرایت کرتی ہیں۔ اسی کی ایک جھلک ناول کے ایک کردار خوشحالی کے بیان سے ہوتی ہے جو اپنے لڑکے کے حالات کو بیان کرتا ہے:

> ''پہلے لاہور اور پھر بمبئی میں پڑھتا تھا اور ایم اے تک پڑھنے کے بعد سب کچھ چھوڑ کر گاندھی جی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے سارے سوٹ اٹھا کر رکھ دیئے تھے یا شاید انہیں جلا ڈالا تھا اور ایک کھادی کی لنگوٹی باندھے پڑا پھرتا تھا۔(12)

اس ناول میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے بالکل اسی طرح جیسے جیسے ہندوستان میں سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد بڑھتی جا رہی تھی اور اس ضمن میں کانگریس اور لیگ کے اختلافات دوسری جنگ عظیم کے اثرات، پاکستان کے قیام کی بحثیں۔ آزادی حاصل کرنے کا شدید جنون اور اس کے لیے جدوجہد، سیاسی شورشیں اور ہنگامے غرض اس وقت حقیقی زندگی کے ہر پہلو کی جھلک آگ میں نظر آتی ہے۔

اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھے گئے ناولوں میں ایک اہم ناول آگ ہے جس میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کی گئی ہے۔

حیات اللہ انصاری کا بھی شمار ترقی پسند ناول نگاری میں ہوتا ہے ان کے قلم سے کئی ایک ناول منظر عام پر آئے لیکن ان میں لہو کے پھول کو کافی شہرت ملی ۔اس ناول کا موضوع بیسویں صدی میں ہندوستان کی تحریک آزادی ہے یہ ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس ناول میں تقسیم ملک سے قبل اور تقسیم کے پس منظر کو خصوصیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔حیات اللہ انصاری کانگریس کے ایک سرگرم رکن تھے چنانچہ اسی ناول میں کانگریسی نظریات کی تبلیغ جگہ جگہ نظر آتی ہے ۔ساتھ ہی ساتھ کانگریس نظریہ سے وابستہ ہونے کے باوجود بھی کانگریس کی خامیوں کو نظر انداز نہیں کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر طنز کرنے سے باز بھی نہیں رہتے ۔

حیات اللہ انصاری نے لہو کے پھول میں ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ کا احاطہ کیا ہے ۔جس میں اس عہد میں رونما ہونے والی سیاسی وسماجی تبدیلیوں اور اہم تحریکوں کا تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے ۔

اس مختصر سے جائزے سے معلوم ہوگیا کہ حیات اللہ انصاری کے ناول میں بھی جدوجہد آزادی کی عکاسی بحسن خوبی ملتی ہے ۔

ترقی پسند ناولوں کی فہرست میں ایک اہم نام خواجہ احمد عباس کے ناول انقلاب کا ہے، یہ ناول ۱۹۷۵ء میں منظر عام پر آیا۔خواجہ احمد عباس نے اس ناول کو چار حصہ میں تقسیم کیا ہے ۔اس ناول کا مرکزی کردار انور ہے ۔انور ملک کے مختلف علاقوں میں جاتا ہے اور ہر طبقہ کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے ۔

انور گاندھی جی کی تعلیم کا شیدائی ہے اور گاندھی جی کے عدم تشدد کے فلسفہ پر یقین رکھتا ہے ۔انور ہندوستان کی سیاست میں اس وقت اپنی دلچسپی کا مظاہرہ پیش کرتا ہے جس وقت جلیانوالہ باغ کا کوئی حادثہ پیش آتا ہے اسے انگریزوں سے سخت نفرت ہے ۔ناول نگار نے انقلاب میں سیاسی، سماجی اور بدلتی ہوئی قدروں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے ۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ انقلاب بھی ایک ایسا ناول ہے جس میں جدوجہد آزادی کی بھر پور انداز میں عکاسی کی گئی ہے ۔اس ناول پر تفصیلی گفتگو اس مقالے کے اگلے صفحات میں کی

جائے گی۔

ترقی پسند ناول نگار جن کے ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی ملتی ہے ان میں سے سجاد ظہیر (لندن کی ایک رات) عزیز احمد (آگ) حیات اللہ انصاری کا ''لہو کے پھول'' اور خواجہ احمد عباس کے (انقلاب) تک ہی تذکرہ کیا گیا ہے اس لیے کہ ان ناول نگاروں کا براہ راست تعلق ترقی پسند تحریک سے پایا جاتا ہے۔اس تحریک کے دوران اور بعد میں بھی کئی ایسے ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں ترقی پسند تحریک کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔لیکن ان ناول نگاروں کی وابستگی ترقی پسند تحریک سے نہیں تھی اس لیے اس باب کو یہیں پر ختم کیا جارہا ہے۔

حلقہ ارباب ذوق:

اردو ادب کے ارتقاء میں جن تحریکوں اور رجحانوں کا نمایاں اثر ہوا انہیں میں سے ایک حلقہ ارباب ذوق بھی ہے۔حلقہ ارباب ذوق کا قیام ۱۹۳۹ء میں لاہور میں عمل میں آیا۔اس کا ابتدائی نام بزم داستان گویاں تھا حلقہ ارباب ذوق، ترقی پسند مصنفین کے متوازی چنا رہا۔حلقہ ارباب ذوق نے ادب میں ادبیت کو لازم قرار دیا۔فرد کی داخلی کیفیات، جذبات واحساسات اور اس کی ذات کو اہمیت دی جب کہ ترقی پسند تحریک نے ادب برائے زندگی کا نظریہ پیش کیا۔ اور اس تحریک سے وابستہ شاعروں اور ادیبوں نے ایک مخصوص نظر کی تشہیر وتبلیغ کے لیے ادب تخلیق کیا۔ان کے یہاں ساری توجہ حقائق پر مبنی تھی ادبیت ثانوی درجہ کی چیز بن گئی۔نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی تخلیقات میں ادبیت مجروح ہوتی رہی اور ادب ادب نہ رہ کر پروپگنڈہ بنتا جارہا تھا۔نتیجہ یہ نکلا کہ اس تحریک میں اختلاف رونما ہوگیا اور کچھ ادیبوں اور شاعروں نے اس تحریک کو خیر باد کہہ دیا اور اپنی ایک الگ راہ نکالی۔

حقیقت یہ ہے کہ حلقہ ارباب ذوق، ترقی پسندوں کے خلاف محاذ کے طور پر نہیں بنایا گیا تھا لیکن ہوا یہ کہ ترقی پسند تحریک سے جن لوگوں نے اختلاف کیا تھا ان حضرات کے لیے حلقہ ارباب ذوق ایک پلیٹ فارم جیسی حیثیت اختیار کر گیا اس حلقہ کے تعلق سے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''مجلس داستاں گویا کا مقصد کسی نئی تحریک کو وجود میں لانا اور ادب میں موضوع یا ہیئت کا کوئی انقلاب بیان کرنا نہیں تھا بلکہ اس مجلس کی نوعیت تقریب ملاقات کی تھی اور اس کی رعایت سے مجلس کی تقاریب شہر کے مختلف حصوں میں ارکان مجلس کے دیوان خانوں میں منعقد ہوئیں بقول قیوم نظر حلقہ گردش میں رہتا۔ اور بعض اوقات اس کی ہے۔ سروسامانی پر لوگوں کو رحم بھی آتا لیکن احباب کا خلوص شرکاء مجلس کا دل موہ لیتا۔(13)

حلقہ ارباب ذوق سے متعلق ایک بحث یہ بھی اٹھائی جاتی ہے کہ حلقہ ارباب ذوق تحریک ہے یا رجحان۔ تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ابتدا میں یہ ایک اوپن پلیٹ فارم تھا جہاں پر ذہن کا قلم کار تخلیق پیش کر سکتا تھا اس حلقہ کا کوئی واضح نظریہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے ابتدا میں یہ ایک رجحان تھا۔ ہاں بعد میں باضابطہ اس کے نظریہ کی وضاحت ہوئی اور اس کے اغراض و مقاصد بتائے گئے۔ اس لیے بعد میں یہ حلقہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا۔

حلقہ ارباب ذوق کی کہانی ڈاکٹر سلیم اختر کی زبان ہم یہاں پر پیش کرتے ہیں جس سے اس حلقہ کے ابتدائی خدوخال واضح ہو جاتے ہیں وہ لکھتے ہیں:

''۲۹ر اپریل ۱۹۳۹ء کو اس کا پہلا اجلاس حفیظ ہوشیار پوری کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں نسیم حجازی نے اپنا افسانہ تلافی پیش کیا۔ ان دنوں اس کے اجلاس لکشمی منشن (میکلوڈ روڈ کے عقیب میں نصیر احمد جامعی کے مکان پر منعقد ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کے جلسوں کی رونق بڑھنے لگی اور ہر ذہن اور فکر کا ادیب یہاں آنے لگا۔ چنانچہ میرا جی۔ شیر محمد اختر قیوم نظر، ن م راشد۔ حفیظ ہوشیار پوری، امجد حسین، شہرت بخاری، یوسف ظفر کے ساتھ ساتھ کرشن چندر، طارق عبد المتین، ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، دیویندر ستیارتھی، صفدر میر، سید مطلبی فرید آبادی، اور کنہیا لال کپور جیسے معروف ترقی پسند ادیبوں کے نام بھی پروگرام میں نظر آتے ہیں''۔(14)

حلقہ ارباب ذوق کی ابتداء افسانہ خوانی سے ضرور ہوتی تھی جیسا کہ عرض کیا گیا۔ مگر بہت جلد اس میں قدر آور شعراء کی شمولیت نے افسانوی ادب کو پس پشت ڈال دیا۔ مجلس کے ادباء کی فہرست پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو اس میں افسانہ نگار کم اور شاعر زیادہ نظر آتے ہیں۔ ابتداء میں راجندر سنگھ بیوی، کرشن چندر اور اپندر ناتھ اشک جیسے قابل قدر فکشن نگار حلقہ کے جلسہ میں آئے

اور اپنی تخلیقات پیش کیں مگر وہ لوگ اس حلقہ میں چھوڑے ہی دن رہے اور بعد میں یہ حضرت ترقی پسند تحریک سے منسلک ہو گئے باقی جو فکشن نگار بچ گئے وہ دوتم کے تھے جب کہ شاعری میں میرا جی ،ن م راشد، یوسف ظفر اور قیوم نظر جیسے چوٹی کے شعراء نظر آتے ہیں۔ایسے حالات میں افسانوی ادب کا پس پشت چلا جانا ایک فطری اثر تھا۔ جہاں تک منٹو کا سوال ہے جب ان کو ترقی پسندوں نے اپنے حلقہ سے خارج کر دیا تو وہ حلقہ کے جلسہ میں آ کر اپنے افسانے پیش کرنے لگے مگر منٹو صاحب کی جہت صرف افسانوں تک ہی محدود تھی اس تفصیل سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ فکشن نگاروں کی کمی کی وجہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کے دائرے کو وسعت دینے کے لیے دوسری اصناف کو بھی شامل کرنے کا خیال بیدار ہوا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان مجالس میں شعراء سے منظومات سننے کی خواہش کی گئی ہو۔اور ایسا ہی ہوا حلقہ ارباب ذوق کا حلقہ وسیع ہوا اور یہ حلقہ صرف افسانے کی دنیا تک محدود نہیں رہا اس لیے اب اس حلقے کا نام بدلنا بھی ضروری ہو گیا۔ ڈاکٹر محمد باقر کے حوالے سیڈاکٹر انور سدید اس تعلق سے لکھتے ہیں۔

''سب لوگ متقاضی تھے اسٹریری سرکل نام رکھا جائے۔سٹریری سرکل کا لغوی ترجمہ ادبی حلقہ ہوتا ہے۔ہم سب نے حلقہ کا لفظ بار بار دہرایا اور بلآخر یہ ہمارے حلق سے نیچے اتر گیا اور میری تجویز پر حلقہ ارباب ذوق نام طے پا گیا''(15)

حلقہ ارباب ذوق کی سب سے قدر آور شخصیت میرا جی کی تھی انہوں نے ہی بکھرے ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر کے ایک مخصوص جہت دی اور یہ حلقہ دن بدن ترقی کی منازل پر گامزن رہا۔میرا جی کی شخصیت کیا تھی ان کے اندر کس قسم کی خوبیاں تھیں اس تعلق سے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''میرا جی ذہنی اعتبار سے مغرب کے جدید علوم کی طرف راغب تھے لیکن ان کی فکری جڑیں قدیم ہندوستان میں پیوست تھیں۔مشرق اور مغرب کے اس دل چسپ امتیاز نے ان کی شخصیت کے گرد ایک پراسرار جان سا بن دیا تھا۔چنانچہ ان کے قریب آنے والا ان کی سحر میں گرفتار ہو جاتا تھا اور پھر ساری عمر اس سے نکلنے کی راہ نہ پاتا تھا۔دور سے یکلھنے والے ان کی ظاہری ہیئت گذرتی جسے ترتیبی اور آزادہ روی پر حیرت زدہ ہوتے ہیں اور پھر ہمیشہ حیرت زدہ

رہتے ۔میراجی کی عظمت کا باعث یہ بھی تھا کہ وہ حلقے کے ارکان میں عمر کے لحاظ سے سب سے بڑے تھے ان کا ادبی ذوق پختہ اور مطالعہ وسیع تھا''۔(16)

حلقہ ارباب ذوق میں میراں جی کی شخصیت ایک پیر مغاں کی تھی ۔ان کی آمد سے اس حلقہ میں ایک نئی روایت کا آغاز ہوا میراں جی کی تحریک پر ہی حلقے میں پڑے گئے مضامین کی خاموں پر نشاندہی کی جاتی تھی اور لوگ بخوشی اپنی خامیاں مانتے اور اصلاح کرتے ۔حلقہ کے تمام ارکان میراجی کی شخصیت سے بے انتہا متاثر تھے اور ان کی تجاویز کو خندہ پیشانی سے قبول کرتے تھے۔

میراجی کی شمولیت سے ایک بہت بڑا فائدہ دیکھنے میں یہ آیا کہ حلقہ ارباب ذوق نے ترقی پسند کی مقصدیت کے خلاف ردعمل بھی ظاہر کیا اور اس کی یکسانیت کے مقابلہ میں تنوع ، پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ چنانچہ اب اس حلقہ نے ایک ایسی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی جس نے ادب کی موجودہ صورت کو بدلنے اور فن کے داخلی حسن کو اجاگر کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔

حلقہ ارباب ذوق نے تمام اصناف پر اپنے اثرات چھوڑے جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو حلقۂ ارباب ذوق کے سب سے نمائندہ شاعر خود میراجی تھے ایک طرح سے وہ حلقہ کے روح رواں بھی تھے ۔اس حلقہ کے دیگر رفقاء یوسف ظفر ، قیوم نظر ، تابش صدیقی ، کا شمار نئے شعراء میں ہوتا تھا۔ان تمام شعراء نے نظم میں داخلیت کے رجحان کو فروغ دیا۔ میراجی اردو نظم نگاری میں اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں ۔ان کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کلام میں ہندوستان سانس لیتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ یوسف ظفر کی داخل کی روح بے حد تیز اور متحرک ہے ۔حب وطن کا جذبہ یوسف ظفر کی شاعری کی قیمتی اساس ہے ۔ قیوم نظر کی انفرادیت یہ ہے کہ ہر لمحہ رنگ بدلتی دنیا کو اپنا موضوع بنایا اور ان کیفیتوں کا شعر کا پیکر عطا کیا۔ان کے علاوہ اور بہت سے شعراء ہیں جن حلقہ ارباب ذوق سے طوالت کے خوف سے ان کو نظر انداز کیا جا رہا ہے ۔

تنقید کے میدان میں بھی اس حلقہ سے وابستہ لوگوں نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں

۔جن میں اہم نام یہ ہیں ۔میرا جی ۔وحید قریشی، ریاض احمد، حسن عسکری وزیر آغا وغیرہ ۔

فکشن کے میدان میں بھی اس حلقہ نے اپنی نمائندگی درج کرائی ہے جیسا کہ عرض کیا گیا کہ حلقہ ارباب ذوق کی ابتداء افسانہ خوانی سے ہوئی تھی ۔حلقہ ارباب ذوق کے روبس افسانہ نگاروں میں، شیر محمد اختر، کرشن چندر، اپیندر ناتھ اشک اور راجندر سنگھ بیدی کا ہونا ہے۔لیکن شیر محمد اختر کو چھوڑ کر تمام افسانہ نگار ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے ۔شیر محمد اختر واحد ایسے افسانہ نگار ہیں جو شروع سے آخر تک اس تحریک سے وابستہ رہے اور افسانے کو ہی اظہار کا وسیلہ بنایا۔ آگے چل کر حلقہ ارباب ذوق سے متعدد افسانہ نگار وابستہ ہو گئے مگر ناول کے میدان میں ممتاز مفتی انتظار حسین اور انور سجاد ہی نظر آ رہے ہیں ۔ان حضرات نے ناول اردو کے لیے رجحان ثابت ہوئے اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس حلقہ کی ناول نگاری کم صحیح مگر کمتر نہیں ۔

تحریک آزادی کی اردو ناول

حلقہ ارباب ذوق کو جس شخص نے وقعت وعظمت بخشی اس میں انتظار حسین کا نام بہت اہم ہے ان کو اردو کے افسانوی ادب میں ایک دبستان کی حیثیت حاصل ہے ان کے ناولوں میں ہمیں فکر وفن کی دنیا آباد نظر آتی ہے اور تکنیک کے لحاظ سے اردو میں ایک منفرد روایت قائم کرتے ہیں ۔ان کے قلم سے کل پانچ ناول منظر عام پر آئے ۔چاند گہن، دن اور داستاں ،بستی ،تذکرہ اور آگے سمندر ہے ۔

ان کے تمام ناولوں میں چاند گہن، واحد ایسا ناول ہے جس کو تحریک آزادی کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔

انتظار حسین کے ناول چاند گہن کا موضوع ۱۸۵۷ کا غدر ہے ۔غدر کے محرکات اور نتائج بیان کرنے کے علاوہ ناول نگار نے گاندھی جی کی شخصیت کے کئی پہلو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے ۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس حلقہ کے تحت صرف ایک ایسا ناول لکھا گیا جس میں جد وجہد آزادی کی عکاسی کی گئی ہے اور یہ شرف انتظار حسین کو ملا ۔

جدیدیت

اردو ادب میں جدیدیت کوئی باضابطہ تحریک کی صورت میں نہیں ابھری اور نہ ہی اس کی افہام وتفہیم کا مسئلہ حل ہوا۔ کچھ لوگ تو اس کو ترقی پسند تحریک کی توسیع خیال کرتے ہیں تو کوئی کچھ اور پھر بھی اس حقیقت سے انکار پیش کیا جا سکتا ہے کہ بیسویں صدی کے رجحانات میں جدیدیت کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ جدیدیت کا کوئی واضح مقصد اور دستور العمل نہیں ہے جو کسی ادبی تحریک کے لیے ناگزیر ہے۔اس لیے جدیدیت کو ایک رجحان کا درجہ حاصل ہے۔

جدیدیت کو سمجھنے کے لیے ترقی پسند تحریک کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ترقی پسند تحریک جو ۱۹۳۶ء میں باضابطہ اجلاس اور منشور کے وقوع پذیر ہوئی تھی اور پھر ادب برائے مقصد یا ادب برائے زندگی کے مطابق ادب کی تخلیق ہونے لگا۔ترقی پسندی نے ادب کو سماج کا خادم اور نہ جانے کیا کیا سمجھا۔مقصدیت کے تحت ادب، سیاست اور صحافت میں تفریق کرنا ناممکن ہونے لگی ۔ترقی پسندوں نے اشتراکیت کے پرچار ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا تھا ادب ایک طرح سے نعرہ بازی بن گیا تھا اور شعر وادب کی جمالیاتی قدریں نظر انداز ہوگئی تھیں ایسے حالات میں جدیدیت ایک تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح اردو ادب میں داخل ہوئی ۔جیسا کہ عرض کیا گیا کہ ترقی پسندوں نے انداز واسلوب کو نظر انداز کر کے موضوع مواد کو ہی سب کچھ سمجھ لیا اور ساتھ ہی ساتھ فرد اور سماج کے رشتے پر اتنا زور دیا کہ فرد کا وجود ہی ایک طرح سے ختم ہوگیا۔ ایسے حالات میں جدیدیت نے فرد کو اس کی ذہنی کیفیتوں کو اس کے شعور اور لاشعور کو اہمیت دی۔نتیجہ یہ سامنے آیا کہ فرد اپنی ذات کے خول میں سمٹ کر رہ گیا اس تعلق سے ڈاکٹر منظر اعظمی لکھتے ہیں:

> ''اصل یہ کہ جب سائنس کی تیز رفتار ترقیوں نے مستحکم عقائد کو بھی تہس نہس کر کے رکھ دیا تو شاعروں اور ادیبوں کے پاس ایسا کوئی عقیدہ نہ رہا جو اس کے پورے وجود کو کسی مقصد سے ہم کنار کر سکے۔اس لیے اسے جماعت اور پیام سے دلچسپی نہ رہی۔اس نے فلسفہ، سیاست، مذہب اور اخلاق کی گرفت سے آزاد ہونے کی کوشش کی اور اپنے پہلوں کی طرح خدا کائنات اور حیات کے تکون کو سمجھنے کے بجائے اپنی ذات کے عرفان کی کوششوں میں محو ہوگیا اور اس طرح

اس نے ادب کے ذریعہ اخلاق کی تلقین، سیاست کی تبلیغ اور سماج سدھار کے کاموں سے منھ موڑ لیا تو لازمی طور پر اس کے اپنے تجربے اور اس کا اپنا اظہار خود اس کی ذات تک محدود ہو کر رہ گیا اور اس طرح اس میں خود کلامی کی کیفیت پیدا ہوئی''(17)

انسان کو جب اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس کائنات میں اس کا کوئی مونس وغم گسار نہیں ہے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جدیدیت سے وابستہ ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس لیے کہ اس وقت ہندوستان میں کیا پوری دنیا کے حالات نہایت ہی مایوس کن تھے ایسے حالات میں جدیدیت کے مبلغوں نے فن کاروں کو یہ مشورہ دیا کہ جب دنیا والوں کو تمہاری کوئی فکر نہیں ہے تو تمہارا قلم سماج کا غلام کیوں ہو اچنانچہ جدیدیت کے زیر اثر شاعر وادیب اپنی ذات کے حصار میں قید ہو کر رہ گیا اور اس نے کہا کہ وہ کسی اور کے لیے بلکہ اپنی ذات کے لیے لکھ رہا ہے۔

جدیدیت کا یہ رجحان کب شروع ہوا اس سلسلہ میں کسی قیمتی تاریخ کا تعین ممکن نہیں اور ایسا ہوتا بھی نہیں ہے کہ کوئی تحریک یا رجحان اچانک شروع ہوتا ہے اور نہ ختم۔

تقسیم ہند کا المیہ اردو ادب کی تاریخ میں اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے اس المیہ نے جہاں انسان سے اس کا تہذیبی ورثہ چھین لیا وہیں اس نے اجتماعیت پر کاری ضرب لگائی۔ فرد خارجیت سے داخلیت کی رجوع کرنے لگا ایسے حالات میں ۱۹۶۰ء کے آس پاس جدیدیت کا آغاز ہوا۔ جدیدیت کے رجحان نے انسان کے باطن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ جدیدیت کے تعلق سے پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''جدیدیت صرف انسان کی تنہائی، مایوسی اس کی اعصاب زندگی کی داستان نہیں ہے اس میں انسان کی عظمت کے ترانے بھی ہیں۔ اس میں فرد اور سماج کے رشتے کو بھی خوبی سے بیان کیا گیا ہے اس میں انسان دوستی کا جذبہ بھی ہے مگر جدیدیت کا نمایاں روپ آج آئیڈیالوجی سے بیزاری فرد پر توجہ اس کی نفسیات کی تحقیق، ذات کے عرفان، اس کی تنہائی اور اس کی موت کے تصور سے خاص دلچسپی ہے۔ اس لیے اسے شعر وادب کی پرانی روایت کو بدلنا پڑا۔ زبان کے رائج تصور سے نپٹنا پڑا ہے۔ اسے نیا رنگ وآہنگ دینا پڑا ہے اس کے اظہار کے لیے اسے

علامتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے''۔(18)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہر وہ تخلیق جو اپنے عصری تقاضے کا ساتھ دیتی ہے وہ جدید ہے اور یہ سلسلہ لا متناہی ہے۔ زمانہ بدلے گا۔ زمانے کی قدریں بدلیں گی۔ مزاج و معیار بلدین گے اور اس کے حسب حال جو تخلیق قدم سے قدم ملا کر چلے گی وہ نئی ہوگی اور جدید ہوگی۔

تحریک آزادی کے اردو ناول: اس تحریک کے زیر اثر کوئی ایسا ناول نہیں لکھا گیا ہے جس میں تحریک آزادی کی عکاسی راست یا براہ راست ہوئی ہو اس لیے جدیدیت کی بحث کو یہیں پر ختم کیا جا رہا ہے۔

☆☆☆

حوالہ جات

باب سوم

(1) خواجہ الطاف حسین حالی، حیات جاوید، ص ۱۸۲

(2) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں ص ۳۱۲

(3) اردو ادب کی تحریکیں ص ۴۴۰ انور سدید

(4) نور الحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ص ۲۰۵

(5) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۷۴

(6) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۷۶

(7) ڈاکٹر سلیم اختر اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ ص ۴۵۵

(8) ڈاکٹر انور سدید۔ اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۷۷

(9) نور الحسن نقوی، تاریخ ادب اردو، ص ۲۶

(10) ڈاکٹر فیروز احمد، لندن کی ایک رات، ص ۶۲

(11) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۳۴۱

(12) عزیز احمد، آگ، ص ۶

(13) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں ۵۳۸

(14) ڈاکٹر سلیم اختر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ، ص ۴۶۲

(15) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ۵۳۹

(16) ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۵۴۱

(17) منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ص ۵۳۶

(18) منظر اعظمی، اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ، ص ۵۴۰

☆☆☆

باب چہارم

''اردو ناولوں میں جدوجہدِ آزادی کی عکاسی کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ''

باب چہارم
''اردو ناولوں میں جدوجہدِ آزادی کی عکاسی کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ''

سماجی

''چوگانِ ہستی''

پریم چند واحد ناول نگار ہیں ،جن کی ناول نگاری اپنے عہد کی سیاسی ،سماجی اور معاشرتی حالات سے براہ راست وابستہ رہی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ کہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں جس عہد کی ترجمانی کی ہے اس عہد کو اپنے سر کی دونوں آنکھوں سے دیکھا تھا ۔ پریم چند نے ساحل پر کھڑے ہوکر صرف طوفان کا نظارہ نہیں کیا تھا بلکہ خود پریم چند اس طوفان کے شکار ہوئے تھے۔

پریم چند بھی اپنے ناولوں کے ذریعہ ملکی اور قومی خدمت برابر انجام دیتے رہے ۔ پریم چند کو اس بات کا اچھی طرح پتہ تھا کہ ہمارے ملک کے محنت کش لوگ جن کی ایک بڑی تعداد ہے وہ بارہ گھنٹے لگا تار محنت کرنے کے بعد اگر کچھ پڑھ سکتا ہے تو ناول ہی پڑھ سکتا ہے ۔ چنانچہ پریم چند نے اپنے ناولوں میں سماجی ،سیاسی اور معاشی ہر طرح کے مسائل کو پیشکیا۔ پریم چند کا پہلا ناول ''اسرار معابد'' ۱۹۰۳ تا ۱۹۰۵، ہندوستان میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی کوششوں کا عکاس وترجمان ہے۔اس کے علاوہ پریم چند نے ایک درجن کے قریب ناول لکھ کر اردو ادب کو

مالا مال کیا ہے اوران ناولوں میں اپنے عہد کی بہترین ترجمانی کی ہے۔ یہاں پر ہم پریم چند کے ان ناولوں کے حوالے سے گفتگو کریں گے جن میں کسی بھی حیثیت سے انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد نظر آتی ہے۔اس سلسلہ میں پریم چند کا ایک نہایت اہم ناول ''چوگانِ ہستی'' ہے۔اب ہم پریم چند کے اس ناول کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں۔منشی پریم کا یہ شاہکار ناول یکم اپریل ۱۹۲۴ء کو پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے۔ پریم چند نے اس ناول میں اپنے عہد کے سیاسی حالات کو بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔اس ناول کے تعلق سے ڈاکٹر یوسف سرمست رقم طراز ہیں:

''اس میں ہندوستانی زندگی کے ہر رخ کو اور ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کے اہم ترین دور کو اس کی پوری وسعت کے ساتھ سمیٹ لیا گیا ہے''چوگانِ ہستی''ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا مکمل اشاریہ ہے اور گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کی بھرپور تفسیر ہے۔عدم تشدد کی وہ جنگ جو مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں ابتداء سے اس ناول کے لکھے جانے تک لڑی گئی اس کی پوری تصویر کشی چوگانِ ہستی میں ہوتی ہے''(1)

''چوگانِ ہستی کا زمانہ تحریر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ھ ہے۔ یہ وہی وقت ہے جب پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف عدم تعاون تحریک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ یکم اگست ۱۹۲۰ء کو عدم تعاون تحریک کا آغاز ہوا۔گاندھی جی نے ۲۲ رجون کو ہی وائسرائے کو ایک نوٹس دیا تھا۔جس میں لکھا تھا کہ بد انتظامی اور بدعنوانی کرنے والی حکومت کی مدد کرنے سے انکار کرنے کا حق ہر آدمی کو ہے۔اگست کی پہلی ہی تاریخ کو بال گنگادھر تلک کا انتقال ہوگیا۔تلک کے انتقال پر تعزیت اور تحریک کا سلسلہ ایک ساتھ شروع ہوا، ملک کے ہر گوشے میں جلسے ہوئے اور جلوس نکالے گئے،مولانا آزاد نے انگریزی حکومت سے عدم تعاون کے پروگرام پر گاندھی جی کی پوری حمایت کی، دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں اس تحریک کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ ہزاروں طلباء نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ دیا، جگہ جگہ قومی اسکول اور کالج کھولے گئے، وکیلوں نے بڑے پیمانے پر وکالت چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ایسے حالات میں اب گاندھی جی پر سول نافرمانی تحریک شروع کرنے کا دباؤ بڑھ رہا تھا چنانچہ ۱۹۲۱ء میں احمد آباد میں کانگریس نے اپنے تاریخی

اجلاس میں مستقبل کی حکمت عملی طے کرنے کی ذمہ داری گاندھی جی کو سونپ دی تھی ۔گاندھی جی نے حکومت کو اس بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ اگر وہ سیاسی قیدیوں کو آزادی کا پروانہ نہیں دیتی ہے تو پورے ملک میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی جائے گی ۔مگر حکومت پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں پڑا۔ مہاتما گاندھی جی نے مجبور ہو کر سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا، اب مہاتما گاندھی کی قیادت وسیادت میں پوری قوم اپنی تمام تر توانائیوں کے ساتھ عدم تعاون اور سول نافرمانی تحریک کو انتہائی شدت سے چلا رہی تھی ۔حالانکہ گاندھی جی نے عوام سے اپیل کیا تھا کہ تحریک پوری طرح پرامن ہونا چاہئے ،لیکن ایسا نہیں ہوسکا اور چوری چورا کا واقعہ پیش آ گیا۔اس واقعہ سے گاندھی جی اتنا زیادہ متاثر ہوئے کہ ۱۲؍فروری ۱۹۲۲ء کو اس تحریک کو نامعلوم مدت کے لیے ملتوی کر دیا۔

اس طرح گاندھی جی نے عدم تشدد کا عملی نمونہ ہمارے سامنے پیش کر دیا۔حالانکہ گاندھی جی کے اس فیصلہ سے ان کے ساتھی ناراض ہو گئے تھے ۔گاندھی جی کا یہ فیصلہ بے مثال فیصلہ تھا تاریخ انسانی میں اس طرح کے فیصلوں کی مثال بہت کم ملتی ہے۔گاندھی جی نے یہ فیصلہ کر کے اخلاقی جرأت وہمت کی ایک مثال ہمارے سامنے رکھدی۔

تحریک آزادی میں گاندھی جی کے اسی روپ کو پیش کرنے کے لیے پریم چند نے ''چوگانِ ہستی'' جیسا ناول لکھا اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے پریم چند کا یہ ناول گاندھی جی کے خیالات اور ان کی تعلیمات کی مکمل تفسیر ہے ۔گاندھی جی کا جو عدم تشدد کا فلسفہ تھا جس کے تعلق سے گاندھی جی کہا کرتے تھے کہ ''عدم تشدد میرے مذہب کا پہلا اور آخری اصول ہے'' چوگانِ ہستی کے ہیرو سورداس کی شکل میں مجسم ہو کر ہمارے سامنے آ گیا ہے ۔اس ناول میں پریم چند نے سورداس کے کردار اور اس کی جدوجہد پیش کرتے ہوئے ہندوستان کی پوری تحریک آزادی کی جدوجہد کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔اس ناول میں سورداس کا کردار ایک علامت کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔

سورداس ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی ایک روشن علامت ہے ،جو بابائے قوم

مہاتما گاندھی کی سرپرستی وقیادت میں عدم تشدد کے ذریعے لڑی جارہی تھی۔سورداس اپنے حق کے لیے لڑتا ہے جبکہ جان سیوک اس کا یہ حق چھین لینا چاہتا ہے۔''چوگانِ ہستی''میں سورداس کی رمزیت، ناول کی وسعت اوراس کی کامیابی کوظاہر کرتی ہے، کیونکہ منشی پریم چند نے اس کے ذریعے جدوجہد آزادی کی پوری فضا ہمارے سامنے پیش کردی ہے، جواس وقت موجود تھی۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ''چوگانِ ہستی''پریم چند کا اتنا کامیاب ناول ہے کہ اردو کا دوسرا کوئی ناول اس کا جواب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جان سیوک کی وجہ سے سورداس ہرطرح کی تکلیف اٹھاتا ہے لیکن انتقام کا جذبہ پیدا ہونا تو دور کی بات ہے، اس کو معاف ہی نہیں کرتا بلکہ جب ایک ناراض جلوس سورداس کی ہمدردی میں اس کی گودام کوآگ لگا دینا چاہتا ہے تو سورداس اپنی جان کی دھمکی دے کراس گودام کو بچاتا ہے وہ کہتا ہے:

''بھائیوتم ادھم مچا کر مجھ پر کیوں کلنک لگا رہے ہو۔آگ لگانے سے میرے دل کی آگ نہ بجھے گی۔لہو بہانے سے میرا دل شانت نہ ہوگا''(2)

''میدان عمل''

''میدان عمل''پریم چند کے کامیاب ناولوں میں سے ایک نہایت ہی اہم ناول ہے۔اس ناول میں پریم چند نے ایک بار پھر ہندوستان کی قومی اور سیاسی جدوجہد کوموضوع بنایا ہے۔اس ناول میں متوسط طبقہ سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں، کاشتکاروں، مزدوروں اوردوسرے تمام افراد کی قومی جدوجہد کو بڑے ہی فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

یہ ناول پریم چند نے ۱۹۲۹ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۰ء میں ختم کیا۔یہ وہی زمانہ ہے جب کہ سیاسی کشمکش میں شدت پیدا ہوگئی تھی۔عوام میں جوش خروش دیکھا جارہا تھا۔تمام تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں۔کانگریس نے ملک کی آزادی کا مطالبہ شروع کردیا تھا بلکہ یوں کہئے کہ ۱۹۲۸ء اوراس کے بعد مسلسل کچھ ایسے حالات پیدا ہوگئے تھے کہ جس کی وجہ سے یہ ہیجان بہت زیادہ شدت اختیار کرگیا تھا۔اسی سال سائیمن کمیشن آیا۔اس کمیشن کا صدر انگلینڈ کا مشہور قانون داں

سرجان سائمن تھا۔ اس کمیشن کا ایک بھی ممبر ہندوستانی نہیں تھا اس لیے کانگریس اور کئی سیاسی جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کیا ہر جگہ اس کمیشن کے خلاف کالی جھنڈیوں کے ذریعے مظاہرے کئے گئے ۔حکومت نے تشدد کے ذریعے اس کو دبانے کی کوشش کی پرامن مظاہرے کرنے والوں پر حکومت نے لاٹھی چارج کیا۔ان حالات میں ہندوستانیوں کا غیض وغضب اور شدت اختیار کر لیتا،ایک فطری بات تھی ۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو، لاہور اجلاس میں مکمل آزادی کا ریزرویشن پاس کیا اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں ڈانڈی کے مقام پر نمک کے قانون کی خلاف ورزی کی گئی اور ملک کے کئی مقامات پر قانون کو توڑ کر نمک تیار کیا گیا۔اسی زمانہ میں کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس طرح آزادی کی یہ جنگ تیز سے تیز ہوتی گئی حکومت نے ہندوستانیوں پر نا قابل بیان ظلم وستم ڈھائے نتیجتاً بہت جلد ہی اس تحریک نے بہت زیادہ شدت اختیار کر لی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو جیل جانا پڑا ۔ انہی حالات میں گاندھی جی کی نرم پالیسی کے خلاف محاذ آرائی شروع ہوئی ۔ خصوصاً نوجوان طبقہ گاندھی جی کے عدم تشدد تحریک سے مایوس ہو کر جدوجہد کے دوسرے راستے تلاش کر رہا تھا اور تشدد کا جواب تشدد سے دینے کے لیے ایک طرح سے تیار تھے ۔ یہ تھے اس وقت کے سیاسی حالات جس میں منشی پریم چند نے اپنا ناول ''میدان عمل'' لکھا۔''میدان عمل'' میں ان تمام حالات کی عکاسی ہمیں ملتی ہے۔اس ناول کا پلاٹ سیدھا سادھا ہے۔

امرکانت اسی ناول کا مرکزی کردار ہے ۔ وہ ایک قوم پرست حریت پسند نوجوان ہے ۔لیکن سمرکانت اپنے بیٹے کی شادی اپنی مرضی سے ایک دولت مند بیوہ کی لڑکی سکھدا سے کر دیتا ہے مگر دونوں کے مزاج میں بڑا فرق ہے۔اس لیے کہ سکھدا چاہتی ہے کہ میرا شوہر اپنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹائے اور دولت کمائے لیکن امرکانت کو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ چنانچہ امرکانت اپنے رئیس باپ کو چھوڑ کر گاندھیائی فلسفلہ کے زیر اثر کھدر بیچ کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے اور ایک گاؤں میں پہنچ کر تعلیم کے فروغ کے لیے کام کرنا شروع کر دیتا ہے

ادھر امرکانت کے گھر چھوڑنے کے بعد اس کی بیوی سکھدا کی زندگی میں بڑی تبدیلی آتی ہے وہ بھی قومی سرگرمیوں میں لگ جاتی ہے۔مزدوروں کی تحریک میں حصہ لیتی ہے اور جدجہد کرتی ہے ۔آخر میں سکھدا اپنی تحریکوں میں کام کرنے کے باعث گرفتار ہوکر جیل چلی جاتی ہے اور اس کا شوہر امرکانت اس تحریک کو آگے بڑھاتا ہے لیکن وہ بھی گرفتار ہوکر جیل چلا جاتا ہے۔اس کے بعد امرکانت کا باپ سمرکانت بھی اس تحریک میں شامل ہوجاتا ہے اور گرفتار ہوجاتا ہے۔اس کی گرفتاری کے بعد تحریک میں جان آجاتی ہے ایک ایک کرکے سب اس تحریک میں شامل ہوجاتے ہیں،سکھدا کی ماں رمادیوی اور سکینہ کی ماں پٹھانی بھی گرفتار کرلی جاتی ہیں اور ان تمام کو لکھنو جیل بھیج دیا جاتا ہے۔اسی سلسلہ میں امرکانت کی بہن نینا تقریر کرتے ہوئے شہید ہوجاتی ہے تو اس کی قربانی سرمایہ داروں اور سامراجیت پسندوں کو متاثر کرتی ہے اور وہ مزدوروں کے مطالبات قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں ناول کے اخیر میں اس علاقے کا گورنر مداخلت کرکے آپس میں سمجھوتہ کرادیتا ہے اور تمام قیدیوں کو رہا کرادیتا ہے۔رہائی ملنے کے بعد سلیم سکینہ سے شادی کرلیتا ہے اور امرکانت اپنی بیوی سکھدا کو اپنالیتا ہے۔اس طرح دیکھا جائے تو اس ناول کا انجام سمجھوتہ پر ہوتا ہے۔یہی وصف کانگریس کی سیاست کا رہا ہے۔اس کو گاندھی جی اور ارون معاہدہ کا اثر بھی سمجھا جاسکتا ہے۔اس معاہدہ کے مطابق گاندھی جی نے سول نافرمان تحریک کو بند کردیا تھا۔اور گورنمنٹ نے سول نافرمانی کے تمام قیدیوں کو رہا کردیا تھا اور قانون نمک میں بھی کچھ ترمیم کی گئی اور مہاتما گاندھی نے دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہونا منظور کرلیا تھا۔

''میدان عمل'' کا ایک کردار منی کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔جو ناول میں زندگی کا ایک نیا رخ ہے اس کے ذریعے ہمیں انگریزوں کے ظلم وستم کا پتہ چلتا ہے جو اس کی عصمت دری کے سلسلہ میں ہے۔منی کا مقدمہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے غم وغصہ اور نفرت کو ظاہر کرتا ہے۔

سلیم کا سرکاری ملازمت سے استعفٰی دے کر اس جدوجہد میں شریک ہونا عدم تعاون کی تحریک کو نمایاں کرتا ہے۔

پریم چند نے اس ناول میں ہندوستان کی پوری سیاسی، سماجی، اور معاشی زندگی کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔اس ناول کے تعلق سے مالک رام نے بڑی اچھی بات کہی ہے۔ان کا کہنا ہے:

''درحقیقت اس ناول میں ہمارے پیچھے دس پندرہ برس کی تمام تحریکوں کا نفسیاتی مطالعہ ہے ۔کہیں اچھوتوں کے لیے مندر کے دروازے کھل رہے ہیں،تو کہیں سیوا آشرم بن رہے ہیں،کہیں لگان کی تخفیف کی تحریک ہے،تو کہیں گرام سدھار کی کوشش ہے،کہیں مزدوروں کی تنظیم ہے تو کہیں ان کی اقتصادی وبہتری کے وسائل کا بیان''(3)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس ناول میں پریم چند نے ہندوستانی زندگی کے بے شمار رخ اور مختلف پہلوؤں کو پیش کیا ہے ۔ان تمام پہلوؤں کو اجاگر کرنا پریم چند کے فن ارتقاء کی ایک واضح دلیل ہے ۔پریم چند نے اس درجہ فنکارانہ انداز میں اپنے کسی بھی ناول میں پیش نہیں کیا ہے۔

''تلاش بہاراں''

یہ ناول جمیلہ ہاشمی کا مقبول ترین ناول ہے، جمیلہ ہاشمی اردو کی معتبر ناول نگار ہیں، یہ ناول ۱۹۶۱ء میں لکھا گیا ہے اس ناول کی اشاعت پر حکومت پاکستان نے جمیلہ ہاشمی کو آدمی جی ایوارڈ سے نوازا۔

آزادی کے بعد لکھے گئے وہ ناول جس میں کسی نہ کسی حیثیت سے جدوجہد آزادی کی عکاسی ہوئی ہے ۔ایک ناول تلاشِ بہاراں بھی ہے ۔جمیلہ ہاشمی جو اس ناول کی مصنفہ ہیں انہوں نے کوشش کی ہے کہ ایک مکمل فنی نمونہ بن کر سامنے آئے وہ اس میں کس حد تک کامیاب ہیں، اگلے باب میں جائزہ لیا جائے گا، یہاں پر ہم پہلے اس ناول کے موضوع سے بحث کرتے ہیں۔

تلاش بہاراں کے واقعات ۶۴۴ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں ۔اس میں ناول نگار نے دکھلایا ہے کہ سو برس تک ایک قوم بہادروں کی تلاش اور خوبصورت مستقبل کی جستجو میں منہمک رہتی ہے اور اس کا انجام فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وغارت گری کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

ناول کا انداز تحریر بیانیہ ہے اسی لیے راوی واقعات و تجربات کو قصے کے رنگ میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ اس ناول کا آغاز رویندر کمار اور کرشنا بوس کے مقدمہ سے ہوتا ہے۔ رویندر کا تعلق اعلیٰ ذات سے ہے جب کہ کرشنا بوس ویش ہے۔ دونوں محبت سے مجبور ہو کر شادی کرتے ہیں مگر حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ رویندر کے والدین کے لیے یہ شادی توہین کے مترادف ہے۔ چنانچہ رویندر کو کرشنا سے الگ کرانے کے لیے عدالت کا سہارا لیا جاتا ہے اس موقع پر کنول کماری کرشنا کی مظلومی و مجبوری اور معصومیت کے دفاع کے لیے سامنے آتی ہے کنول خود اونچی ذات سے تعلق رکھتی ہے مگر وہ ذات پات کی تفریق اور تعصب سے بہت اونچی ہے کرشنا سے رویندر کی علاحدگی کو کرشنا کی بے عزتی اور تمام عورتوں کی توہین تصور کرتی ہے چنانچہ یہ عورت کرشنا کی حمایت میں پرزور بیان دیتی ہے پھر اس عورت کا تعلق مختلف قسم کی سماجی تحریکوں سے ہو جاتا ہے وہ عورتوں کی بیداری اور عورتوں کے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی ہے اور ہر قدم پر آزمائشوں سے گزرتی ہے۔ مگر ان تمام حالات میں وہ ثابت قدم سے رہتی ہے۔ اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے جلسوں اور جلوسوں کی قیادت کرتی ہے اور حقوق نسواں کے سلسلہ میں پیدا شدہ کمزوریوں کا مقابلہ کرتی ہے۔ ملک کی آزادی کی جنگ لڑی جاتی ہے تو کنول کماری بھی عورتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے تحت منظّم کرتی ہے۔ سیاسی لڑائی میں وہ کسی سے پیچھے نہیں رہتی۔

ناول کا آخری قصہ ملک کی آزادی، کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات، پاکستان کے قیام اور فرقہ وارانہ فسادات پر مشتمل ہے۔ یہ ناول اپنی ضخامت کے باوجود ملک کی سیاسی افراتفری کی طرف بہت کم اشارہ کرتا ہے۔ پہلے ایڈیشن کے صفحہ ۴۶۹ سے آزادی کا ضمنی مدھم ذکر ہے اور اس کے بعد اس ناول کا سیاسی رنگ پڑتا جاتا ہے۔

ویسے تو تلاش بہاراں، بنیادی طور پر تقسیم ہند کے موضوع پر لکھا گیا ہے پھر بھی اس میں اس عہد کے تمام سیاسی وسماجی مسائل ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اس مختصر سے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تلاش بہاراں مین بھی جدوجہد آزادی کی عکاسی کسی نہ کسی حد تک ہوئی

ہے۔

تاریخی

لہو کے پھول

اردو کے ممتاز ناول نگاروں میں حیات اللہ انصاری کا بھی شمار ہوتا ہے ان کے قلم سے بہت سے افسانے، ناولٹ اور تنقیدیں بھی منظر عام پر آئی ہیں ''لہو کے پھول'' اور ''گھر وندا'' ان کے اہم ناول ہیں۔لہو کے پھول کو کافی شہرت ومقبولیت ملی ہے لہو کے پھول، اردو کا ضخیم ترین ناول ہے۔ یہ ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اس ناول میں حیات اللہ انصاری نے تقسیم ملک سے قبل اور تقسیم کے بعد کے ہندوستان کے سماجی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور مذہبی حالات کو بڑے ہی فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔اس ناول کے تعلق سے ڈاکٹر خالد اشرف لکھتے ہیں:

> ''گاندھی وادی کانگریسی مجاہد آزادی حیات اللہ انصاری کا ضخیم ناول، لہو کے پھول، ۱۹۹۷ء، دہلی دربار ۱۹۱۱ء سے شروع ہوکر جدوجہد آزادی کے مرحلوں سے گزرتا ہوا ۱۹۴۷ء کے یوم آزادی اور پھر ہندو مسلم فسادات اور گاندھی جی کی شہادت سے ہوکر ہندوستان کے پہلے پنج سالہ منصوبے پر ختم ہوتا ہے اس ناول کے مختلف ابواب بقول مصنف مختلف اوقات میں تصنیف کئے گئے ہیں جن کو بعد میں یکجا کر کے ناول کی شکل دی گئی ہے''۔(4)

حیات اللہ انصاری نے اس ناول کی تسوید۔ ۱۹۶۷ء میں مکمل کر لی تھی

لیکن یہ ۱۹۶۹ء میں اردو کی ناول نگاری کی صدی سالگرہ کے موقع پر زیور طبع سے آراستہ ہوکر کتاب دان لکھنو کے توسط سے منظر عام پر آیا۔اسی ناول پر حیات اللہ انصاری کو ۱۹۷۰ء میں کل ہند ساہتیہ اکادمی کا انعام ملا۔

اس ناول کا مرکزی خیال ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ہے۔اتنا ضخیم ناول کیوں تخلیق کیا گیا اس سے متعلق حیات اللہ انصاری ناول کے پیش لفظ میں رقم طراز ہیں:

''ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر کافی ناولیں لکھی جا چکی ہیں۔اور فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ان

میں سے بعض اچھے بھی ہیں، میں سوچنے لگا کہ کیوں نہ میں ایک ایسی ناول لکھوں جو میرے نقطۂ نظر سے ہندوستانی عوام، جدوجہد آزادی اور لیڈروں کو پیش کر دے (پیش لفظ لہو کے پھول)

اس ناول میں جدوجہد آزادی سے متعلق تاریخی واقعات کو کرداروں کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے۔اس ناول میں بے شمار کردار اور سینکڑوں کہانیاں ہیں۔اہم کرداروں کی حیثیت سے راحت اور فرخ کا کردار سامنے آتا ہے۔

راحت ایک ایسا کردار ہے جو کانگریس کا وفادار رکن ہے اور آزادی کی جدوجہد میں بھر پور حصہ لیتا ہے اور اس کی حصہ داری اس حد تک ہے کہ وہ سرکاری ملازمت بھی ترک کر دیتا ہے اور خلافت تحریک میں شامل ہو کر ملت کی خدمت میں کئی بار جیل جاتا ہے۔ دوسرا کردار فرخ کا ہے جو راحت کا بیٹا ہے اس میں بھی اپنے باپ کی شخصیت کا اثر خوب دکھائی دیتا ہے اور ان دونوں کے کرداروں میں بہت ساری مماثلتیں بھی ملتی ہیں۔ جس طرح راحت آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے ملازمت سے استعفیٰ دے دیتا ہے تو اسی طرح فرخ بھی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے تعلیم ترک کر دیتا ہے۔اسی طرح راحت ایک عرصہ تک بمبئی میں رہتا ہے لکھنو نہیں جاتا۔فرخ بھی دلی میں رہتا ہے لکھنو نہیں جاتا۔

لہو کے پھول کے نسوانی کرداروں میں سلیمہ اور فریدہ کا کردار سامنے آتا ہے۔سلیمہ جو راحت کی بیوی ہے اگر چہ آزادی کی جدوجہد میں براہ راست حصہ نہیں لیتی لیکن پس منظر میں رہ کر اپنے شوہر اپنی اولاد کو آزادی کی تحریک میں تن من دھن کی بازی لگانے پر سہارا دیتی ہے۔ہمت بندھاتی ہے اور ان کے لیے ہر مصیبت برداشت کر لیتی ہے۔سلیمہ کا کردار محنت، جفاکشی، ناقابل شکست عزائم، مستقل مزاجی، اور ایثار و قربانی کا پیکر ہے۔سلیمہ کے کردار کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ کردار وطن کی محبت کے ساتھ اپنے سہاگ اور اپنی اولاد کی محبت کا بھی جیتا جاگتا مرقع ہے۔

مختصر یہ کہ مختلف کرداروں کے حرکات و عمل، مختلف مناظر، واقعات و حادثات کے ذریعہ ''لہو کے پھول'' میں پچاس سالہ تاریخ کا احاطہ کیا گیا ہے۔اور اس عہد میں پیش آنے والے

سیاسی وسماجی تبدیلیوں اور اہم تحریکوں کا تفصیل سے ذکر آیا ہے۔اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ یہ ناول تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے تو بالکل درست ہوگا۔لہو کے پھول کی انہیں خوبیوں کو واضح کرتے ہوئے عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''اس دور کی تاریخیں تو بہت لکھی گئی ہیں اور ان کا سلسلہ جاری ہے اور رہے گا۔اور ابھی تاریخ کے کتنے ہی تاریک گوشے روشن کئے جائیں گے لیکن اس تاریخ کے عوامل نے کس طرح افراد کی روزمرہ کی زندگیوں پر اثر ڈالا اور اس اثر نے کس طرح لوگوں کے ذہن وکردار کو ایک خاص رخ پر موڑا۔واقعات واشخاص کے درمیان عمل اور ردعمل کا چکر کس انداز سے چلا؟ انسانی رشتے کس ڈھپ سے بنے اور بگڑے؟ لوگوں کے جذبات واحساسات اور افکار وخیالات میں کیا کیا پیچ پڑے؟ ان کا شعور کس طرح چونکا؟ کیسی کیسی حسرتیں اور تمنائیں جاگیں؟ خوشی اور غم کے تجربے کس انداز سے کئے گئے؟ مختصر یہ کہ گردش ایام کس طرح نسل در نسل مجسم ہوئی؟ یہ وہ سوال تھے جن کے جواب کا تجسس مجھے اور میرے ہی طرح کتنے ہی لوگوں کو ایک عرصے سے تھا۔اردو زبان وادب کے لیے یہ ایک فخر وامتیاز کی بات ہے کہ سب سے پہلے اور اب تک تنہا اس سوال کا بھرپور جواب ایک اردو ناول ''لہو کے پھول'' نے دیا۔چنانچہ حیات اللہ انصاری کا یہ کارنامہ صرف ادب ہی نہیں بلکہ پوری زندگی کی تاریخ کا جز بن گیا ہے۔(5)

ان تمام تفصیلات سے یہ بات کھل کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ ''لہو کے پھول'' میں جہاں بہت سارے مسائل پیش کئے گئے ہیں وہیں پر جدوجہد آزادی کی عکاسی کو بڑے ہی اچھے انداز سے پیش کیا گیا ہے اسی لیے جدوجہد آزادی کے ناولوں میں لہو کے پھول کا مقام بہت بلند ہے۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

دور جدید کے ناول نگاروں میں نورالحسنین ایک معتبر ناول نگار ہیں۔انہوں نے اب تک دو ناول آہنکار اور ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' جیسے ناول لکھ کر شہرت ومقبولیت حاصل کی ہے۔نورالحسنین کے ناول ''آہنکار'' کی خوبی یہ ہے کہ ہر باب کے آخری جملے سے اس کا اگلا باب شروع ہوتا ہے اس تکنیک کو نورالحسنین ہی پہلی بار اپنے ناول میں بروئے کار لائے ہیں۔آہنکار ناول اس وقت میرا موضوع بحث نہیں ہے؛ اس لیے اس ناول کے تعلق سے مزید کچھ نہیں لکھا

جارہا ہے۔اس وقت میرا موضوع بحث نورالحسنین کا دوسرا ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' ہے۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ،نورالحسنین کا دوسرا ناول ہے۔میرے خیال میں اردو کا واحد ناول ہے جس میں مکمل طور پر جدوجہد آزادی کی عکاسی ملتی ہے۔اس طرح کے ناول لکھنے کی تحریک نورالحسنین کو کہاں سے ملی،انہیں کے الفاظ میں سنتے ہیں،وہ اس ناول کے ابتدائی صفحات میں دو باتیں آپ سے، کے تحت لکھتے ہیں۔

> ''اس ناول کو لکھنے کا خیال میرے دل میں اس طرح آیا کہ میں ڈاکٹر معین الدین جینا بڑے کی تنقیدی کتاب اردو میں بیانیہ کی روایت، پڑھ رہا تھا۔اس میں اپنے ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے کہا تھا کہ ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کا اتنا بڑا مومنٹ مکمل طور پر ہمارے کسی ناول کا حصہ نہیں بن سکا۔اسے پڑھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی اور میں نے اس چیلنج کو قبول کیا اور آٹھ فروری ۲۰۱۲ کی رات دو بجے اس ناول کی پہلی سطر نے کاغذ کی سطح پر آنکھ کھولی اور آٹھ مئی ۲۰۱۲ کی رات دو بجے اس ناول کی آخری سطر نے اپنے مکمل ہونے کا اعلان کیا۔''(6)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زیرنظر ناول ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی پر محیط ہے ہماری تاریخ کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ میں صرف انہیں لوگوں کا نام درج ہے جو کسی نہ کسی طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں کے ناموں سے تاریخ کے صفحات خالیہیں جنہوں نے شہرت و ناموری کی پرواہ کئے بغیر صرف اپنے حوصلے،طاقت اور جذبہ حب الوطنی سے سرشار ہوکر اپنی جانوں کا قیمتی نذرانہ ملک کی آزادی کے لیے پیش کردیا۔ نورالحسنین نے اپنے اس ناول میں ایسے ہی کم نام جانبازوں کو سامنے رکھ کر اس ناول کو ترتیب دیا ہے جو یقیناً قابل ستائش اور بے انتہا مبارکباد کے مستحق ہیں۔

نورالحسنین کے اس ناول کی شروعات ایک ویران قبرستان سے ہوتی ہے۔جس میں اس ناول کے مختلف کردار حیدر خان تارا بائی اور پنڈت کڑاکے کی ٹھنڈ میں ایک الاؤ کے پاس بیٹھے ہیں اور اپنے انقلابی ساتھی کے آنے کا انتظار کررہے ہیں اور وقت گزاری کے لیے اپنی اپنی

کہانی ایک دوسرے کو بتا رہے ہیں کہ کس طرح انگریزوں کو چکمہ دے کر فرار ہو گئے ۔ وہاں پر دینا ناتھ آتا ہے جو جھانسی کی خبر لے کر آیا تھا وہ بتاتا ہے۔

''بری خبریں ہیں انگریز سرکار نے دیسی والیان کے لیے الحاق کا قانون پاس کر دیا ہے تمام راج واڑوں میں اس قانون کے باعث سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔لعنت ہے ان راجواڑوں پر جنہوں نے محض اپنے معمولی مفاد کی خاطر اپنے ہاتھ کاٹ کر فرنگیوں کے حوالے کر دیا پنڈت کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

محمد کچھ سمجھی نہیں.....تارا نے پنڈت جی سے وضاحت چاہی۔

میری بہن صرف تخت تاج کی لالچ میں ان لوگوں نے اپنے ہی بھائی بندوں کے خلاف فرنگیوں سے مدد مانگی ۔ اپنی ریاستوں اور جاگیروں کے داخلی معاملات میں انہیں دخیل کر لیا۔اب تو وہ ان سے کھیل رہے ہیں اور کروڑوں روپئے بٹور کر اپنے ملک کو بھیج رہے ہیں۔

بھیا جھانسی کے احوال بتاؤ۔

''حیدر بھائی دینا ناتھ نے دہکتی ہوئی آگ کی طرف دیکھا۔جھانسی میں تو فرنگیوں کے خلاف نفرت کی آندھیاں اٹھ رہی ہیں۔بس چنگاری کی دیر ہے دیکھنا برٹش سامراج کی اینٹ سے اینٹ بج جائے گی۔''(7)

نورالحسنین نے اپنے اس ناول میں جدوجہد آزادی کے واقعات کو مختلف کرداروں کے ذریعہ پیش کیا ہے اس ناول کے ایک کردار سید علی اختر ہیں جس کو ناول نگار نے شاعر کی حیثیت سے متعارف کیا ہے لیکن وہ آخر میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاتے ہیں ۔اسی طرح ان کی ایک بیٹی نیلوفر ہے جو ایک شوخ ،چنچل حسین ،لڑکی ہے اپنے چچازاد بھائی سلیم سے محبت کرتی ہے اور اسے بار بار آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کے لیے تلقین کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تمہارے سینے پر زخموں کے نشان دیکھنا چاہتی ہوں ۔ جب سلیم لکھنو کی جنگ کے بعد دلی لوٹتا ہے اور نیلوفر سے ملتا ہے تو اس وقت کا مکالمہ دیکھئے:

''آپ لوٹ آئے ہیں۔

ہاں سلیم نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

کیا ہم لکھنو کی جنگ جیت گئے ہیں۔فرنگی وہاں سے بھاگ گئے ہیں۔

اس نے اس کی آنکھوں میں جھانکا' نیلوفر جنگ لڑنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم نہ ابھی پوری طرح جنگ جیتے ہیں اور نہ ہی فرنگی لکھنو سے غائب ہوئے ہیں۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا ہم جنگ کیا لڑتے ہر وقت آپ کی موہنی صورت ہمارے سامنے رہتی ہے۔ آپ کی یادیں ہمیں دن رات ستاتی رہتی ہیں۔ اس لیے ہم سب کو چھوڑ کر آپ کے پاس آ گئے ہیں۔

نیلوفر ایک دم اسی کی بانہوں سے نکل گئی اور اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

ایسے کیا دیکھ رہی ہیں آپ دوسرے سپاہی تو ابھی تک وہیں پر ہیں۔ وہ بھگائیں گے انہیں آپ فکر نہ کریں۔

شاباش، وہ ایک دم بپھر گئی۔ اپنے ساتھیوں کو جنگ میں جھونک کر آپ چلے آئے ہیں آپ کیسے سپاہی ہیں۔ آپ کو پتہ ہے شہر کی ساری ماؤں نے اپنے بچوں کو قسم دے کر بھیجی ہیں کہ بیٹا ملک پر قربان ہو جائیں اور آپ لوٹ آئے۔

ہاں اور دیکھ لیں ہم کسی معرکے میں شریک نہیں ہوئے ہیں۔ ہمارے جسم پر کوئی زخم تک نہ آیا ۔ہم جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس چلے آئے ہیں۔

نیلوفر! اس نے محبت سے آواز دی۔ ناراض ہو گئیں۔ ہم سید اختر علی کے بھتیجے ہیں۔ دیکھ لیں ہم آپ کے لیے سینے پر زخموں کے ہیرے موتی سجا کر لائے ہیں۔

''نیلوفر نے اوپر دیکھا اس کے سامنے سلیم کا کھلا ہوا سینہ تھا جس پر بے شمار زخموں کے نشان تھے وہ اس سے ایک دم لپٹ گئی اور اس کے زخموں کو چومنے لگی۔ یہ جنگ اتنی جلد ختم نہیں ہو گی۔ اب ہم دلی میں جنگ لڑیں گے۔(8)

اس طویل اقتباس سے ہمیں اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہمارے ملک کا ہر فرد کس طرح وطن کی محبت سے سرشار تھا۔ اور وطن کو آزاد کرانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتا تھا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہمیں ناکامی کا سامنا خود اپنے لوگوں کی غداری کی وجہ سے ہوا۔ اگر یہ غدار نہ ہوتے تو ۱۸۵۷ء میں ہی ہمارا ملک انگریزوں سے آزاد ہو چکا ہوتا۔ غرض یہ کہ اس ناول میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی بھرپور انداز میں عکاسی ہوئی ہے اور ان گم نام انقلابیوں کو زندہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جن کو اب تک نامعلوم کیوں نظر انداز کیا گیا تھا۔ نور الحسنین کے

اس کامیاب ناول کے تعلق سے ڈاکٹر احمد صغیر لکھتے ہیں:

''یہ ناول اس لیے اہم ہوجاتا ہے کہ اس میں گم نام انقلابیوں کے ساتھ ساتھ وہ تمام کرداروں پر بھرپور روشنی پڑتی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کسی نہ کسی طور پر شامل تھے اور اپنی جان کی بازی لگا رہے تھے یا اپنی حکمت عملی سے ملک کو غلامی سے نجات دلانا چاہتے تھے لیکن ہم یہ جنگ ہار گئے اور کئی برسوں تک ہمیں غلامی جھیلنی پڑی۔یقیناً یہ ناول ایک اہم ناول ہے۔کیوں کہ پہلی بار کسی ناول نگار نے ان گمنام انقلابیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک تاریخ کا حصہ نہیں بن پائے تھے۔(9)

سیاسی

ابن الوقت

نذیر احمد کے ناولوں میں صرف ابن الوقت ایسا ناول ہے جو اس وقت کی موجودہ سیاست پر روشنی ڈالتا ہے۔اس ناول کو نذیر احمد نے ۱۸۸۸ء میں مکمل کیا ہے۔یہ ناول ان کی زندگی کے تجربات سیاسی وسماجی بصیرت، تہذیبی شعور جرأت اور بے باکی کا آئینہ دار ہے۔اس ناول کا موضوع جدید تہذیب وجدید طرز معاشرت اور اس سے متاثر افراد ہیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک ایسے فرد ابن الوقت کا انتخاب کیا ہے جس نے قدیم تہذیب کے گہوارے میں آنکھیں کھولی ہیں لیکن اس نے تعلیم جدید نظام کے تحت حاصل کی ہے۔

ابن الوقت ایک اچھے گھرانے کا تعلیم یافتہ نوجوان تھا اور ذہنی طور پر انگریزوں سے سخت متاثر' چنانچہ انگریزی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء میں جو پہلی جنگ آزادی ہوئی جس کو انگریزوں نے ''غدر'' کا نام دیا۔اس جنگ میں ابن الوقت نے نوبل صاحب، ایک انگریز اعلیٰ عہدیدار کو پناہ دی تھی۔نوبل صاحب کی قربت اور بعد میں اس کے کہنے سننے سے ابن الوقت نے انگریزی سرکار میں ایک جاگیر اور بڑا عہدہ حاصل کرلیا تھا۔

اس مختصر سے جائزے سے یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ پہلی جنگ آزادی ۱۸۵۷ء جو باقاعدہ اور منظّم جنگ تھی انگریزوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے، نوبل صاحب کے توسط

سے اس کی عکاسی، اردو ناول میں ہوئی ہے۔

آنگن

آنگن ۱۹۶۲ء خدیجہ مستور کا بے حد دل چسپ ناول ہے۔اس ناول میں ایک اچھے ناول کی قریب قریب ساری خوبیاں موجود ہیں۔ پروفیسر احتشام حسین اس ناول کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''اس ناول میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جن کی جستجو ایک ذہین قاری یا نقاد کسی ناول میں کرسکتا ہے کہانی کا ارتقاء بالکل فطری اور منطقی انداز میں ہوا ہے اور اپنی ساری وسعتوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہوا ہے۔یعنی ناول کے ابواب مختصر افسانوں سے نہیں، بلکہ ارتقاء کی مختلف کڑیوں اور منزلوں سے ترتیب پاتے ہوئے منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔اس میں ناول نگاری کی تعمیری صلاحیت اور فنی قدر کا پتہ چلتا ہے۔خدیجہ مستور نے بڑی خوبصورتی سے اس پیچیدہ عمل کو فطری اور سبک بنا دیا ہے۔ناول کے ہر کردار نے اپنا پارٹ اس خوبی اور خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ نہ تو کہیں داستان میں جھول پڑتا ہے نہ منظر غیر فطری ہوتا ہے اور نہ مقصد فن کو یا قصہ کی دلکشی کو مجروح کرتا ہے۔(10)

اس ناول کا آغاز تحریک آزادئ ہند سے ہوا ہے اور تحریک عدم تعاون کی تحریک کے مناظر کو پیش کرتا ہوا فرقہ وارانہ فسادات تقسیم ہند اور اعلان آزادی پر ختم ہوجاتا ہے۔یہ ناول دو حصوں ماضی و حال پر مبنی ہے۔اور ناول کے موضوع کی مقصد کی تکمیل کے پس منظر میں ناول نگار کا صاف ستھرا سیاسی شعور دکھائی دیتا ہے۔ بیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی سماجی اور اقتصادی کشمکش میں ہندوستان کے متوسط طبقے نے جو حصہ لیا ہے اس کا ذکر خدیجہ مستور نے اس ناول میں پیش کیا ہے۔مسلم خاندان کا وہ متوسط طبقہ جس نے جدوجہد آزادی میں اپنی ذہنی صلاحیت اور جان و مال لٹانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی اس ناول کے پلاٹ کا مرکز ہے۔یہ خاندان اتر پردیش سے تعلق رکھتا ہے۔یہ ناول مختلف کرداروں کے ذریعہ آگے بڑھتا ہے اس

ناول کے کرداروں میں عالیہ، بڑے چچا، عالیہ کی والدہ، چھمی جمیل، نجمہ، کریمن بوا اور اسرار میاں اہمیت کے حامل ہیں۔

اس ناول کے مرکزی کردار بڑے چچا ہیں' جو ایک سیاسی مبلغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔لڑکا کانگریسی ہونے کے ساتھ ساتھ آخر تک گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو کے نظریات کی ترویج اور انگریزوں کے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف جدوجہد کرتے رہتے ہیں وہ بیک وقت اتحاد وسلامیت کے تناظر میں ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں انہیں اپنے ملک ہندوستان سے بہت ساری توقعات ہیں وہ انگریز حکومت سے اس قدر متنفر تھے کہ بیٹے کی سرکاری ملامت کی کمائی کو حرام سمجھتے تھے۔

''بڑے چچا اپنی ہانڈی الگ پکواتے تھے۔انہوں نے بڑی صفائی سے انکار کر دیا تھا کہ وہ جمیل بھیا کی کمائی کا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر خرچ نہ ہونے دیں گے۔جمیل بھیا نے یہ ملازمت کر کے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔مجھے پتہ نہیں تھا کہ یہ جمیل، میری اولاد، میری دشمن ہوگی۔بڑے چچا نے کئی بار عالیہ سے کہا تھا اور وہ چچا کی بے قراری دیکھ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔وہ گھنٹوں سوچتی رہتی کہ انسان کے مقاصد میں اتنی دھار کہاں سے آجاتی ہے کہ سارے رشتوں ناطوں کو کاٹ کر پھینک دیتی ہے بڑے چچا نہ کسی کے باپ ہیں نہ چچا، نہ شوہر اسی لیے چھمی راون کے ساتھ لنکا چلی گئی ساجدہ آپا اپنے خاندان کی ساری بڑائی اور امارت کو گوبر میں ملا کر اپنے تھاپ رہی ہیں۔شکیل بھاگ گیا اور جمیل بھیا مامتا کی آگ بھڑکا کر فاشزم کی آگ بجھانے چلے گئے۔(11)

اس ناول کا ہر کردار اپنے دائرہ عمل میں ایک علامت ہے۔خصوصاً اسرار میاں کا رکردار فرسودہ تہذیب کی علامت ہے اسی طرح بڑے چچا کا کردار ایک علامت ہے کہ وہ آزادی کی قربان گاہ پر سب کچھ قربان کر دینے والوں میں سے ہیں۔تحریک آزادی میں گھر پھونک کر شریک ہوئے اور متعدد بار جیل کاٹ چکے ہیں۔آزادی کے متوالوں نے آزادی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔گولیاں کھائیں، جیل گئے اور تختہ دار پر مسکراتے ہوئے چڑھ گئے۔بڑے چچا بھی اپنی جان وطن عزیز پر قربان کر دیں۔

اسی طرح ناول کے دیگر کردار بھی علامت کا لبادہ اوڑھے ہوئے نظر آتے ہیں جو کسی نہ کسی تہذیب، سیاسی پارٹی ہندوستانی رسم ورواج' انگریزی تعلیم، جاگیرداروں کی عیاشیوں، گمراہ اور بے روزگار نوجوان نسل کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر ان کرداروں کا الگ الگ جائزہ لیا جائے تو ان کا تعلق صرف اپنی ذات تک محدود نہ ہوگا بلکہ اس کا سلسلہ اس کردار کے ہم خیال گروہ یا جماعت سے جا ملتا ہے اس طرح پورا ہندوستان اس ناول میں نظر آتا ہے۔

اس ناول کا جب ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ یہ مختصر ناول چھوٹے پیمانے پر تحریک آزادی کے عہد کا سیاسی منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ ''آنگن'' میں متوسط طبقے کے ایک گھر کی قومی سیاست کے زیر سایہ بدلتی ہوئی اقتصادیات اور نفسیاتی کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس گھر کے باشندے تحریک آزادی سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہیں اس لیے گھر کے آنگن ہر وقت مختلف اور مخالف سیاسی نظریات کا اکھاڑا بنا رہتا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہندو مسلمان دونوں قوموں نے کندھے سے کندھا ملا کر حصہ لیا تھا۔ ان کے سامنے صرف ایک مدعا تھا کہ ملک کی آزادی کے بعد ان کا سیاسی واقتصادی بحران دور ہوجائے گا۔ مصیبتوں کے بادل چھٹ جائیں گے۔ خوشیوں اور بہاروں کے دن آئیں گے اپنا ملک اور اپنی حکومت ہوگی جس سے ہر فرد و بشر کو خوش حال زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔ استحصال وتفریق نام کی کوئی چیز نظر نہیں آئے گی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر دونوں قوموں نے قید وبند کی صعوبتیں جھیلیں۔ انگریزوں کی گولیاں کھائیں اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا لیکن ابھی آزادی کا تحفہ ملا بھی نہیں تھا کہ فرقہ واریت کے زبردست بھونچال کی لپٹ میں دونوں قومیں آگئیں ان حقائق کی ترجمانی میں خدیجہ مستور کس حد تک کامیاب ہیں اس سلسلہ میں اس اقتباس پر غور کریں!

> ''بڑے میاں اس صدمے سے جیسے نڈھال ہوگئے تھے بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے تھے یہ کیا ہورہا ہے۔ یہ کیا ہوگیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہوگئے یہ انہیں کس نے سکھایا ان کے دل سے محبت کس نے چھین لی ''زمانے زمانے کی بات ہے وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے تھے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان

نچھاور کر دیتا، ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ پر اب کیا یہ گیا۔ دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا ہے''۔(12)

اس مختصر سے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اردو کے وہ ناول جس میں جدو جہد آزادی کی عکاسی ہوئی ہے' ان ناولوں میں خدیجہ مستور کا ناول ''آنگن'' بھی ہے۔

''اداس نسلیں''

عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' کے واقعات جنگ عظیم سے ہندوستان کی آزادی تک محیط ہیں۔ اس میں باضابطہ کوئی تکنیک یا رجحان کی کارفرمائی نظر نہیں آتی ہے۔ روایتی انداز کا یہ ناول تاریخی شعور کے ساتھ اس دور کے ہندوستان کی تصویر کشی کرتا ہے اس کا تعلق براہ راست معاشرہ اور سماج سے ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک سے رونما ہونے والے طبقاتی کشمکش کا رجحان بھی ہے۔ دیوندر اسر نے ''اداس نسلیں'' کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''اداس نسلیں ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم دور ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء کو پیش کرتی ہے اس میں تواریخ کے واقعات اور کردار کی پیچ در پیچ ساخت کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک مسلط ڈھانچے میں منتقل ہو گئے ہیں۔ اس ناول نے ناول زبانی جذبات واحساسات مسرتوں اور خواہشوں، ناکامیوں اور نامرادیوں، خوابوں اور خوف کو بڑے جاندار طور پر پیش کیا ہے۔ اداس نسلیں ہمارے دور کی بے چینی اور ذہنی کرب کو قاری تک منتقل کرنے میں کامیاب ہے''(13)

نعیم اس ناول کا مرکزی کردار ہے، انگریزوں اور جاگیرداروں کے تسلط اور جبر کو ناول کے ابتدائی حصہ میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بعد ازاں عالمگیر جنگ اپنی تمام خوفناکیوں اور تباہی کے ساتھ چھڑ جاتی ہے نعیم اس میں ایک فریق بن جاتا ہے۔ وہ جنگ میں براہ راست شریک ہو جاتا ہے۔ ناول نگار نے جنگ عظیم کا نہایت فنکارانہ نقشہ پیش کیا ہے۔ نعیم محاذ جنگ سے واپس آ کر ملک کی آزادی کی تحریک میں شامل ہو جاتا ہے۔ پہلے اس نے دہشت پسند قوم پرستوں کی تنظیم میں شمولیت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ کانگریسی تحریک سے وابستہ

ہوگیا۔آزادی کی تحریک سے وابستگی کے نتیجہ میں ملک کی متعدد طاقتوں ، سیاسی لہروں اورقومی دھاروں کی آئینہ داری ہوتی ہے۔''مسلم لیگ'' کا زور،''جلیان والا باغ'' حادثہ نمک تحریک ، عدم تعاون کی تحریک ،صوبہ سرحد میں کانگریس تحریک کا اثر سائمن کمیشن،تقسیم ، تبادلۂ آبادی معاملات ومسائل وغیرہ کہیں ہلکے اورکہیں گہرے رنگ میں پیش کئے گئے ہیں۔کسی کا نقش سیدھا سادھا اوروقتی ہے،کسی کا پیچیدہ اوردیرپا ہے۔

نعیم کی زندگی میں شیلا نام کی ایک لڑکی اہم رول ادا کرتی ہے ۔شیلا طوائف اور بانو بن جاتی ہے اورآخر میں علی سے اس کی شادی ہوتی ہے۔نعیم کی شادی عذرا سے ہوتی ہے۔نعیم کے ساتھ عذرا کے کردار کا تعلق بہت گہرا ہے ۔نعیم اورعذرا دراصل ایک دوسرے کو مکمل کرنے کا ذریعہ ہیں۔مگرعذرا میں بھی یہ خوبی برائے نام ملتی ہے نعیم کے جیل جانے کے بعد عذرا براہ راست سیاسی تحریکوں میں شامل ہوجاتی ہے ۔لکھنو میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ کرتی ہے اورجیل میں اپنے شوہر سے ملاقات کرتی ہے۔

دہشت پسندوں کے گروہ کو چھوڑ کر نعیم کانگریس کے بہت سے پروگراموں میں شریک ہوتا ہے ،وہ''رولٹ ایکٹ'' کے خلاف مظاہرے کراتا ہے ۔جلیان والا باغ کے قتل عام کی انکوائری کمیٹی میں حصہ بھی لیتا ہے ۔گاؤں گاؤں گھوم کر انگریزوں کے خلاف تقریر کرتا ہے اورعوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔جیل جاتا ہے۔حکومت اس کا کراس ضبط کرلیتی ہے لیکن آزادی کی تحریک زور پکڑتی جاتی ہے ۔اور بالآخر ملک آزاد ہوتا ہے اور یہ پوری قوت کے ساتھ پکار اٹھتا ہے۔ان تمام واقعات کی عکاسی ناول کے اس حصہ میں دیکھئے:

''پارلیمنٹ کی عمارت کی بیرونی سیڑھیوں پر کھڑے ہوکر اس نے آزادی اورمسرت کا سانس لیا۔پھر وہ مظاہرین کے ہجوم میں گھس گیا۔اسے ہرطرف سے دھکے پڑ رہے تھے۔اورسیاہ غلیظ بدنوں سے پسینوں کی تیز بو آرہی تھی ۔وہ مضبوط قدموں سے چلتا گیا۔کافی دیر کے بعد وہ ہجوم کے دوسرے کنارے پر نکل آیا۔

''انقلاب زندہ آباد'' کئی ہزار لوگ چلائے ،وہ کھڑا ہوگیا مختلف قسم کے نعروں کا شوراس

کے کانوں میں آ رہا تھا۔ انقلاب زندہ آباد۔ اکھنڈ بھارت زندہ آباد، حکومت برطانیہ مردہ آباد ، پاکستانی زندہ آباد سول نافرمانی، آزادی، آزادی'' (14)

اس طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' میں بھی جدوجہد آزادی کی بہت حد تک عکاسی ہوئی ہے۔

دوگز زمین

جدید ناول نگاروں میں عبد الصمد کا مقام ومرتبہ بہت نمایاں ہے۔انہوں نے اپنے ناولوں میں ہم عصر مسائل کو بڑی ہی خوبی اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔عبدالصمد کے اب تک سات ناول ''دوگز زمیں ۱۹۸۸ء ، مہاتما ۱۹۹۲ء ،خوابوں کا سویرا ،۱۹۹۴ء ،مہاساگر ۱۹۹۹ء، دھمک ۲۰۰۴،بکھرے اوراق ۲۰۱۵، اور شکست کی آواز ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آ کر مقبول عام ہو چکے ہیں۔

دوگز زمین عبدالصمد کا نہایت ہی مقبول ترین ناول ہے۔اس ناول کو ۱۹۹۰ء میں ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا جا چکا ہے اس ناول کی اشاعت اس وقت ہوئی جب جدید ناولوں نے موضوع کے اعتبار سے نئی نئی منزلیں طئے کرنی شروع کر دی تھیں اور موضوع اور تکنیک کے اعتبار سے نئے تجربے بھی ہو چکے تھے۔اس ناول کے بارے میں صغیر ابراہیم لکھتے ہیں:

''عبدالصمد ناول کی دنیا میں خاموشی سے نہیں بلکہ اجتہاد کرتے ہوئے آواز پیدا کرنے والے قدموں کے ساتھ داخل ہوئے اور اپنے پہلے ہی ناول سے انہوں نے اردو دنیا کو چونکا دیا ۔بہادر شاہ ظفر بدنصیب تھا کہ اس کو دوگز زمیں میسر نہیں آئی لیکن عبدالصمد کو دوگز زمین کا صلہ ملا، پذیرائی ہوئی ۔درازئ عمر کی دعائیں دی گئیں کہ وہ اپنے نوک قلم سے سماج میں انقلاب لاسکیں۔فرقہ پرستی اور تنگ نظری کے پڑخچے ادھیڑ سکیں''۔(15)

عبدالصمد کا یہ ناول آزادی کے بعد نصف صدی سے زائد کا زمانہ گزرنے کے باوجود بھی تحریک آزادی کے بعض دلچسپ گوشوں کو پیش کرتا ہے۔''دوگز زمین'' کی ابتداء، بہار کے ایک ایسے گاؤں سے ہوتی ہے جس کے زمین دار شیخ الطاف حسین ہیں جو تحریک خلافت کے زبردست

حامی ہی نہیں بلکہ اس تحریک کے ایک مخلص کارکن کی بھی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ حصول آزادی اور خلافت تحریک میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔انہوں نے تحریک خلافت میں بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سیاست پر خوب روپیہ بھی خرچ کیا۔اس تحریک کی خدمت کرتے ہوئے ان کی زندگی کے چالیس برس گزر جاتے ہیں۔شیخ صاحب کا لوگوں میں کافی رعب و دبدبہ ہے۔ان کے چار لڑکے اور چار لڑکیاں تھیں اور پینتالیس سال کی عمر میں انتقال بھی ہو گیا کہ شیخ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سرور حسین ،اصغر حسین اور داماد اختر حسین کے ذریعہ کہانی ۱۹۷۷ء کے آس پاس پہنچتی ہے۔

شیخ الطاف حسین کی سرگرمیوں کا یہ حال تھا کہ ان کے چھوٹے بیٹے اصغر حسین مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لیتے ہیں مگر اختر حسین کانگریس کے پرستار بن گئے ہیں اس طرح ایک گھر میں دو مختلف نظریات کے ماننے والے اپنی اپنی سیاسی سرگرمیوں کو پروان چڑھاتے ہیں۔اس طرح حویلی گویا متحدہ ہندوستان کی علامت کے طور پر نمودار ہوتی ہیں:

''گھر کی عورتیں ایک طرف مسلم لیگ کارکنوں کے لیے دیگیں چڑھاتی ہیں تو دوسری طرف کانگریس کارکنوں کے لیے پرہیزی غذائیں تیار کرتی ہیں''(16)

دو گز زمین ،کانگریس پارٹی کی ابتداء سے ۱۹۸۱ء تک کے سیاسی ،سماجی حالات کا خصوصی تجزیہ ہے۔اور اس ناول سے اس بات پر روشنی بھی پڑتی ہے کہ کس طرح کانگریس کا مقصد آزادی سے قبل انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اور عوام کی بہبود و سلامتی تھا۔عبدالصمد کے ناول ''دو گز زمین'' کا آغاز تحریک خلافت سے ہوتا ہے۔تحریک خلافت اس زمانے کی تحریک تھی جس وقت تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ ہندو مسلم اتحاد تحریک خلافت کے عہد میں بے مثال تھا۔اس سلسلہ میں ناول کا یہ اقتباس دیکھئے:

''اس زمانے میں تحریک خلافت اپنے شباب پر تھی یوں تو یہ تحریک مسلمانوں سے مذہبی اور جذباتی طور پر منسلک تھی مگر مقتدا اور ہندو رہنماؤں کی حمایت نے اسے ایک قومی تحریک بنا دیا تھا''(17)

عبدالصمد کا یہ ناول چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ خلافت تحریک سے شروع ہوکر الطاف حسین کی مدت تک جاتا ہے دوسرا حصہ ملک کی تقسیم سے پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش کے قیام وفساد تک ہے تیسرا حصہ خطوط کے طرز میں لکھا گیا ہے جو ایک طرح سے کانگریس پارٹی کا خصوصی مطالعہ اور ہندوستان کی سماجی صورتحال کا تجزیہ ہے۔ چوتھا حصہ پاکستان میں مہاجروں اور سندھیوں کی درمیانی کشیدگیوں اور عرب کی سماجی اور تہذیبی اخلاقیات کو پیش کرتا ہے اس جائزے سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ''دوگز زمین'' میں بھی جہاں بہت سارے مسائل زیر بحث آتے ہیں وہیں پر جدوجہد آزادی کی عکاسی بھی ملتی ہے۔

''آخری شب کے ہم سفر''

آزادی کے بعد جن ناول نگاروں نے اردو ناول کو نئی سمت ورفتار عطا کی ہے ان میں قرۃ العین حیدر کا نام سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔ قرۃ العین حیدر مشہور مصنف سجاد حیدر پلارم کی بیٹی ہیں اور ادبی ذوق انہیں ورثے میں ملا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تخلیقات وراثت سے زیادہ ان کی محنت وریاضت کا ثمرہ ہیں۔ انہوں نے یورپ کا سفر بھی کیا ہے اور یورپی ادب کا بغور مطالعہ بھی کیا جس سے ان کی نظر میں وسعت اور فن میں گہرائی پیدا ہوئی۔ ان تمام خوبیوں کی حامل ناول نگار کی ایک اہم تصنیف ''آخری شب کے ہم سفر'' ہے۔

قرۃ العین حیدر نے یہ ناول ۱۹۷۹ء میں لکھا ہے اس ناول کا عنوان فیض احمد فیض کے شعر:

آخر شب کے ہم سفر نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

سے مستعار ہے۔

یہ اس ناول میں بنگال کی دہشت پسندی، اور انقلابی تحریک ۱۹۴۲ء کے آندولن، مطالبۂ پاکستان، تقسیم ہند اور قیام بنگالہ دیش کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کی کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ڈھاکہ کے ایک معمولی ڈاکٹر بنوئے چندر سرکار کا گھر چندر کنج ہے، جن کی بیٹی دیپالی سرکار، بنگال کے دہشت پسندوں کے گروہ کی ایک فرد ہے وہ اپنی پارٹی کی مالی امداد کے لیے

خود اپنے گھر میں سیند لگا کر چوری کرتی ہے۔اور چوری کے سامان کوفروخت کر کے ایک بڑی رقم سے اپنی پارٹی کی مدد کرتی ہے یہ دسمبر ۱۹۳۹ء کا واقعہ ہے۔ یہ رقم تحریک کے رہنما ریحان الدین عرف ریحان کو پہنچا دی جاتی ہے جو دور کہیں سندر بند میں بیٹھا ہوا تحریک کو ڈائرکٹ کر رہا ہے ۔گرفتاری کے خوف سے کسی سے ملتا بھی نہیں ہے۔ بہت قریب کے لوگ اس کو جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے خود دیپالی نے بھی اس کو کبھی نہیں دیکھا اگر چہ وہ بھیس اور نام بدل کر دیپالی کے گھر بھی آتا ہے اور تحریک سے متعلق ہدایات دے کر غائب ہو جاتا ہے۔ دیپالی سرکار متوسط ہندو طبقے کی ایک تعلیم یافتہ دوشیزہ ہے جو حصول آزادی کے لیے ریحان کے ساتھ مل کر دہشت گردی میں حصہ لیتی ہے۔ پھر روزی بنرجی جو ایک غریب پادری کی بیٹی ہے۔ وہ سین پر نمودار ہوتی ہے، انگریزوں کے خلاف تحریک میں حصہ لیتی ہے، لاٹھی چارج میں حصہ لیتی ہے۔لاٹھی چارج میں زخمی ہو کر جیل جاتی ہے اور پھر ضمانت پر رہا ہوتی ہے۔ ضمانت لینے والا ایک سوشل ورکر عزیز بسنت کمار ہے۔جس سے روزی بعد کو شادی کر لیتی ہے۔

آخر شب کے ہم سفر ایک کرداری ناول ہے اس میں ناول نگار نے دیپالی کا کردار سنوارنے میں بڑی محنت کی ہے۔ دیپالی ہی اس ناول کی روح رواں ہے اور اس کی کارکردگی سے ناول میں جان پیدا ہوتی ہے۔ دیپالی اپنا گھر بھی دیکھتی ہے۔تحریک کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈال کر خفیہ کام بھی کرتی ہے اور ہر آفت جھیلنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ یہاں تک کہ انجام کی پرواہ کئے بغیر سندر کے جنگل میں تحریک کے رہنما' نوجوان ریحان الدین سے ملنے بھی چلی جاتی ہے اور تقریباً ایک ماہ تک وہاں رہتی ہے۔اس درمیان ایسے موقع بھی آتے ہیں جب وہ حالات کا شکار ہو سکتی تھی۔مگر وہ ریحان الدین کے ساتھ ایک خاص منزل تک جا کر خود کو روک لیتی ہے۔تحریک آزادی اور انقلابی تحریک کو کارگر اور موثر بنانے میں دیپالی سرکار کا کردار اپنی مثال آپ ہے۔ ہندوستانیوں کے خلاف انگریز کی سازش کا راز اٹھانے کی غرض سے کلکٹر کی کوٹھی پر کلثوم کا روپ اختیار کر کے گھریلو ملازمہ تک بن جاتی ہے۔ دراصل دیپالی کے اندر حب الوطنی اور ایثار و قربانی کا جذبہ ورثے میں آیا ہے۔اس کے چچا نے ملک کی آزادی کو ترجیح دیتے ہوئے خود کو پھانسی پر لٹکانا گوارا کیا تھا۔ناول کے ایک مقام پر دیپالی سرکار نے

تحریک آزادی میں اپنے خاندان کی خدمات کا حال جس دردناک انداز میں اومارائے سے سنایا ہے اس سے مجاہدین آزادی کی بدحالی اور عسرت کا نقشہ کھینچ گیا ہے۔

''ٹھاکر داس کی زندگی میں ہی بابا اور کاکا تحریک میں شامل ہو کر جیل یاترا کے لیے گئے تھے اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے۔صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا کہ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیش کے اندر سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائیگا۔''(18)

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سارے ملک کے باشندوں کو انگریزوں سے نجات پائی کتنی شدید خواہش تھی اور اس آزادی کے حصول کے لیے سخت سے سخت محنت ومشقت برداشت کرنا گوارا تھی۔

انقلاب

خواجہ احمد عباس کا ناول ''انقلاب'' ایک سیاسی ناول ہے۔خواجہ احمد عباس تحریک آزادی کے ابتدائی مراحل کے واقعات کو موضوع بنایا ہے جس میں ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک کے ہندوستان کے سیاسی حالات کی بڑی ہنرمندی اور سلیقہ سے ناول کے پیرائے میں عکاسی کی گئی ہے یہ ناول جلیان والا باغ کے خونی واقعات سے شروع ہو کر نمک ستیہ گرہ اور گاندھی ارون پیکٹ پر ختم ہو جاتا ہے،خواجہ احمد عباس نے لگ بھگ آٹھ ناول لکھے ہیں جن میں انقلاب، دو بوند پانی، سات ہندوستانی وغیرہ ان کے نمائندہ ناول قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس کا یہ ناول اردو میں نومبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا لیکن یہ ناول اگست ۱۹۴۶ء میں شروع کیا گیا تھا اور اس کی تکمیل ۱۹۴۹ء میں ہوئی اور وہ بھی انگریزی زبان میں۔خواجہ احمد عباس کا یہ ناول مختلف زبانوں مثلاً انگریزی، روسی زبانوں میں شائع ہونے کے بعد نومبر ۱۹۷۵ء میں انقلاب کے نام سے اردو دنیا میں منظر عام پر آیا۔اس ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلا حصہ بادل گھر آتے ہیں، دوسرا حصہ طوفان کی آمد آمد' تیسرا حصہ بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور چوتھا حصہ طوفان اور طوفان کے بعد کے نام سے موسوم ہے۔

ناول کا ہیرو انور ہندوستان کے سیاسی حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے ،انور ایک ایسا کردار ہے جو ہندوستان کے سیاسی حالات کو کیمرہ کی تصویروں کی طرح پیش کرتا چلا جاتا ہے۔ناول کے پس منظر میں انور کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور اور اس کے ذاتی حالات پر روشنی پڑتی ہے ۔جس میں اس کا اپنا نظریہ بھی شامل ہے ۔وہ مختلف حالات وواقعات سے گزرتا ہوا شوشلزم کی جانب قدم بڑھاتا ہے اور تحریک آزادی میں اشتراکی نقطہ نظر کے ساتھ اپنی شمولیت درج کراتا ہے۔انور ملک کے مختلف شہروں اور گاؤں جاتا ہے وہ ہر طبقہ کی زندگی کا بڑے قریب سے مطالعہ کرتا ہے دوسری طرف انور گاندھی جی کی تعلیمات سے حد درجہ متاثر ہے۔ان کے بتائے ہوئے راستے کو اپنے لیے مشعل راہ بناتا ہے۔اس کا گاندھی جی کے نظریہ عدم تشدد میں پورا پورا یقین ہے۔انور میں اپنے وطن سے محبت کا جذبہ اس قدر زیادہ ہے کہ وہ اپنے والد اکبر علی کی قیمتی ریشمی شیروانی کو خود اپنے ہاتھ سے جلاتا ہے۔انور ہندوستانی سیاست میں دلچسپی لیتا ہے جب جلیان والا باغ کا خونی حادثہ پیش آتا ہے تو اس وقت اسے انگریزوں سے شدید نفرت ہوجاتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ انور کا دوست بھی باغی ہوجاتا ہے اس لیے کہ اس کا باپ اسی حادثہ میں مارا جاتا ہے۔

اس ناول میں مختلف سیاسی نظریوں ،گروہوں اور تحریکوں کا جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ تک شروع ہوئی تھیں ۔ان کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جس سے جدوجہد آزدی کے واقعات کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔مثلاً مارکس کی اشتراکیت ،گاندھی جی کی اہنسا، کانگریس پارٹی ،مسلم لیگ ، جمعیۃ العلماء ،سبھاش چندر بوس ، بھگت سنگھ ،خان عبدالغفار ، راج گوپال آچاریہ ، راج گرو، سکھ دیو ،کسانوں اور مزدوروں وغیرہ کے سیاسی نظریوں اور تحریکوں پر روشنی پڑتی ہے۔ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ خواجہ احمد عباس کے اس ناول میں بھی بڑی تفصیل سے جدوجہد آزادی کی عکاسی کا تذکرہ ہوا ہے۔

تہذیبی

آگ ۱۹۴۶ء

عزیز احمد نے ''آگ'' میں کشمیر کے معاشرتی اور تہذیبی حالات اور مسائل کو جن سے اہل کشمیر دوچار ہیں پیش کرنا ہی عزیز احمد کا بنیادی مقصد ہے ۔ اس ناول میں جدوجہد آزادی ، دوسری جنگ عظیم میں ایٹمی تجربات اور اس کے نتائج ،انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ کی باہمی آویزش ، قیام پاکستان کی پیشن گوئیاں، اشتراکی نظریات کا نفوذ،سماجی استحصال وانتشار اور داخلی اضطراب واختلال کو بڑے ہی مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

کشمیر میں مختلف قسم کی آگ بھڑک رہی تھی ، یہی آگ اس ناول کا موضوع بھی ہے اور پس منظر بھی ۔ اس ناول میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ پیش کیا گیا ہے ۔ اتنے طویل زمانے کو عزیز احمد صاحب نے بڑے خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اور تین سو صفحات میں مکمل کر دیا ہے ۔ ناول نگار کا یہاں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اس کے پس منظر میں کشمیر کے حالات کی عکاسی کی ہے ۔ نئی بیداری نئی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کشمیری زندگی میں سرایت کرتی دکھائی گئی ہیں ۔ اس کی ایک مثال ناول کے اس اقتباس میں دیکھئے:

''یہ ۱۹۱۸ء کا ذکر ہے ۔ اس زمانے میں عضنفر جو کے کاروبار میں کئی طرح کے انقلابات آ گئے تھے ۔ سمرقند اور بخارا وغیرہ کی طرف بدامنی کی وجہ سے ادھر کا مال آنا بالکل رک گیا تھا ۔ کابل میں بھی بے چینی اور بدامنی بڑھتی جا رہی تھی اور اس کی وجہ سے چمڑوں اور سموروں کی تجارت پر اثر پڑ رہا تھا ۔ سکندر جو کے کالج میں پڑھنے کی ان کے خیال میں ایسی زیادہ ضرورت نہیں تھی ۔ ان کے لالہ خوش حال چند نے جو اس زمانہ میں ہوم منسٹر تھے ۔ یہ کبھی کہہ دیا تھا کہ زیادہ پڑھنے سے دماغ خراب ہو جاتا ہے ، ۔ اس کی مثال لالہ خوش حال چند نے اپنے لڑکے کے حالات بیان کر کے دی تھی ۔ جو پہلے لاہور اور پھر بمبئی میں پڑھتا تھا اور ایم اے تک پڑھنے کے بعد سب کچھ چھوڑ کر گاندھی جی کے ساتھ ہو گیا تھا ۔ اس نے اپنے سارے سوٹ اتار کر رکھ دیئے تھے یا شاید انہیں جلا ڈالا تھا اور ایک کھادی کی لنگوٹی باندھے پڑا پھرتا تھا ۔ بہر حال خواجہ عضفر جو اس روپ میں سکندر جو کہ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتے تھے''۔

جوں جوں ناول کے صفحات آگے بڑھتے ہیں، اسی طرح ناول میں سیاسی حالات کا تذکرہ بڑھتا جاتا ہے ہندوستان میں سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد بڑھتی جارہی تھی۔ کانگریس اور لیگ کے اختلافات دوسری جنگ عظیم کے اثرات، پاکستان کے قیام کی بحثیں، اشتراکیت کی طرف میلان، آزادی حاصل کرنے کی خواہش اور اس کے لیے جدوجہد، سیاسی شورشیں اور ہنگامے، غرض حقیقی زندگی کے یہ مختلف پہلو اور ساری چہل پہل ''آگ'' ناول میں جھلکتی نظر آتی ہے۔

''آگ'' ناول میں جہاں ایک طرف کشمیری عوام کی غریبی اور جہالت کو بیان کیا گیا ہے وہیں پر یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلم کانفرنس کی شکل میں ایک سیاسی قوت وادیٔ کشمیر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمارہی تھی جو ایک طرف دوگرہ شاہی کے ظلم وستم کو چیلنج کررہی تھی تو دوسری طرف ڈوگروں اور مقامی سرمایہ داروں کے اصل آقاؤں انگریزوں کے خلاف بھی لڑ رہی تھی۔ وادی کشمیر میں مسلم کانفرنس وہی مجاہدانہ کردار ادا کررہی تھی جو گاندھی جی، نہرو اور مولانا آزاد کی قیادت میں کانگریس ہندوستان میں کررہی تھی۔

آگ کا دریا

آگ کا دریا قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناول ہے جو ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آیا اس ناول کو اردو ناول کی تاریخ میں موضوع و ہیئت دونوں ہی اعتبار سے اہم مقام حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس ناول کے بعد جو ناول سامنے آئے اس میں سے اکثر پر اس ناول کی چھاپ نظر آتی ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس ناول کے ذریعہ اردو ناول کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا یہ ناول تقسیم ہند کے المیہ کے موضوع پر لکھا گیا ہے۔

۱۹۴۷ء ہماری تاریخ کا ایک اہم مرحلہ ہے، ہندوستان تقسیم ہوکر آزاد ہوا ملک ہی نہیں، تہذیب، خاندان، گھر بار حتی کہ انسان کا وجود تقسیم ہوگیا۔ اس تقسیم کا درد وکرب ہندوستان کے سارے ادب خصوصاً اردو ادب میں زیادہ ملتا ہے۔ اس المیے پر سارے ادیب ایک آواز ہوکر چیخ اٹھے۔ اس پورے درد وکرب کا اظہار اردو ناول اور افسانوں میں بھرپور ہوا ہے ان ناولوں کے پس منظر میں جنگ آزادی کی وہ تمام تحریکات، واقعات اور اس کے ردعمل کا احاطہ پر اثر انداز

میں کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہر طبقے کے لوگوں کو دکھایا گیا ہے اور اس کے بعد ہندوستان کے تقسیم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن میں معاشرتی، معاشی، جذباتی، مذہبی اور سیاسی مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں سے چند پہلوؤں کو چن کر ہندوستان کی روح کی عکاس کرداروں کے ذریعہ کی گئی ہے۔

اس طرح ''آگ کا دریا'' میں ہندوستانی تہذیب کے ارتقاء کی کہانی شراوستی اور پاٹلی پتر کی تہذیب، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب، انگریزی سماج کی چیرہ دستیاں اور پھر اس کا زوال، مختلف قومی تحریکیں، ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد اور پھر آزادی کے بعد تقسیم کے مسئلہ کا احاطہ بڑے کامیاب ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔

اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے ہندوستان کی عظیم ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ مقدس مذہبی کتابوں کا بھی ذکر موجود ہے۔ مثلاً ویدا اور گیتا کے قول اور منتر ملتے ہیں۔ مہاویر اور گوتم بدھ، رام کرشن تلسی داس اور کبیر داس وغیرہ کے خیالات کی عکاسی کی گئی ہے۔

اسی طرح جدوجہد آزادی کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی، جناح، اور جواہر لال نہرو بھی اس ناول کے پس منظر میں موجود ہیں۔ جن کی اعلیٰ انسانی خدمات اور روحانیت کے فلسفے کو سراہا گیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''آگ کے دریا'' میں بھی کسی نہ کسی حوالے سے جدوجہد آزادی کا تذکرہ ملتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے متحدہ ہندوستان کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ ابتدا سے انگریزوں کی آمد سے کچھ قبل تک ہندوستان کی بڑی نرالی دنیا تھی اس میں ہندو مسلمان کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن زمانے کے تغیر کے ساتھ ہی معاشرتی زندگی میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ انیسویں صدی میں جو سیاسی شعور ابھرا اس سے دونوں قوموں میں مذہبی تجدید واحیا کی لہر چلی۔ دونوں فرقے اپنے اپنے مذہبی رہنماؤں اور سیاسی پیشواؤں کو یاد کرنے لگے پراچین ہندو سنسکرتی اور اسلامی عہد زریں کے تذکروں سے متحدہ قومیت اور خالص ہندوستانی تصور میں غیر معمولی تغیر وتبدل ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں آزادئ ہند کی تحریک اپنے شباب پر پہنچ چکی تھی۔

لیکن سارے لوگ صورت حال کا تجزیہ ایک ہی انداز میں نہیں کر رہے تھے۔ آزادی سبھی چاہتے تھے لیکن مستقبل کی تصویر مختلف طبقوں کی نظروں میں مختلف تھی۔ جہاں ایک طرف ایسے

لوگ بھی تھے جو ملک کی آزادی پر جھوم رہے تھے دوسری طرف ایسے لوگ بھی تھے جن کے نزدیک خوشی ادھوری تھی۔

آگ کے دریا کا فکری پس منظر قدیم ہندوستانی تہذیب کے اولین دور سے شروع ہوتا ہوا نئے ہندوستان میں مکمل ہوتا ہے۔اس ناول میں ہندوستان میں رہنے والے سب ہی قوموں کی زندگی اور ان کا رہن سہن ،ان کا عروج وزوال بیان کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں ہیں اور برباد ہوگئیں اس کے باوجود ہندوستانی تہذیب کی انفرادیت ہر دور میں برقرار رہی ہے۔قرۃ العین حیدر نے ہندوستانی تہذیب کی اس امتیازی خصوصیت کو''آگ کے دریا'' میں نمایاں کیا ہے۔تقریباً آج سے ڈھائی ہزار سال قبل ہندوستانی تہذیب کے دور سے ناول کا آغاز ہوتا ہے اس ناول میں جگہ جگہ ہندو مسلم کلچر کا امتزاج بڑے ہی اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ایک طرف انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کی تدبیریں کی جارہی تھیں تو دوسری طرف دوقومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم ہند کی تجویز رکھی جارہی تھی۔اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تین ہزار سالہ تاریخ کو قرۃ العین حیدر نے بڑی ہنرمندی سے ناول کے سانچے میں ڈال دیا ہے۔یہ سب کے بس کی بات نہیں ہے۔واقعی اردو ناول ان کی اس عظیم تخلیق پر بجا طور پر فخر کرسکتا ہے۔

نفسیاتی

''لندن کی ایک رات''

''لندن کی ایک رات'' ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا جانے والا اولین ناول ہے۔یہ ناول اصل میں ۱۹۳۶ میں لکھا گیا،لیکن اس ناول کی اشاعت ۱۹۳۸ میں عمل میں آئی۔پریم چند کے مشہور ومعروف ناول گئودان کے بعد جو اہم ناول اردو میں لکھا گیا وہ ''لندن کی ایک رات'' ہے۔

اس ناول کو ترقی پسند تحریک کے روح رواں سجاد ظہیر نے لندن میں زمانہ طالب علمی میں لکھا تھا۔ناول کے دیباچہ میں سجاد ظہیر خود لکھتے ہیں:

''اس کتاب کو ناول یا افسانہ کہنا مشکل ہے۔یورپ میں ہندوستانی طالب علموں کی زندگی کا

ایک رخ اگر دیکھنا ہو تو اسے پڑھئے۔اس کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور ہندوستان واپس آتے ہوئے جہاز پر لکھا گیا''(19)

''لندن کی ایک رات'' اردو ناول نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ناول کو مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے سراہا گیا ہے۔

جس وقت یہ ناول تصنیف کیا گیا اس وقت ہندوستان جن حالات سے دوچار تھا اور جو خیالات نوجوانوں میں پرورش پا رہے تھے۔اس ناول میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔یہ وہی وقت تھا جب ملک کے نوجوانوں میں انقلابی رجحان تشدد کی طرف مائل ہو گیا تھا۔اس لیے کہ اس وقت اشتراکی خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔اس ناول میں اعظم اور راؤ میں جو گفتگو ہوتی ہے ان میں وہ اس خیالات کا اظہار کرتا ہے:

''وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں، ذرا مجھے بتایئے تو سہی کسی کو یہ تک معلوم نہیں، وطن کی بھلائی کس چڑیا کا نام ہے، اس کے لیے کوشاں ہونا تو درکنار، زنانہ بن کر چرخہ کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے۔یا مہاتما کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے یا کونسل کی ممبری میں یا منسٹری میں وطن کی بھلائی ہے یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے۔''(20)

اس ناول میں انگریزی سامراجیت کے خلاف اندر ہی اندر دہکتی آگ کے اثرات بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔اس ناول کے کردار داخلی انتشار اور کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔سجاد ظہیر نے ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات کے پس منظر میں اس طبقہ کی تصویر کشی کی ہے جو پرانی قدریں کھوتا ہے اور نئی قدروں کو اپنانے سے گریز کرتا ہے۔کیونکہ اس کا رشتہ اپنے ماضی سے بھی وابستہ ہے۔لندن میں مقیم طلباء مغربی افکار و نظریات سے متاثر ہیں۔ان میں سے ایک احسان بھی ہے جو اشتراکی خیالات سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ انگریزی سامراج اور ہندوستانی سرمایہ دارانہ نظام دونوں کو نہ صرف یہ کہ ناپسند کرتا ہے۔بلکہ اس کی خرابیوں پر بھی کھل کر تنقید کرتا ہے۔وہ کہتا ہے:

''تم سب کے سب رئیس بنتے ،مہاجن ،بیرسٹر،وکیل ،ڈاکٹر،پروفیسر،انجینئر،سرکاری نوکر کی طرح ہو اور ہندوستان کے مزدوروں اور کسانوں کا خون پی کر زندہ رہتے ہو۔ایسی حالت قیامت تک قائم نہیں رہے گی ۔کسی نہ کسی دن ہندوستا کے لاکھوں کرڑوں مصیبت زدہ انسان خواب سے چونکیں گے بس اسی دن تم سب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہوجائے گا''(21)

اس ناول کے تمام کردار ایک جگہ جمع ہوکر علمی موضوعات پر فلسفیانہ گفتگو کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ملک کے سیاسی وسماجی حالات پر بھی آزادنہ اظہار خیال کرتے ہیں ۔یہ تمام کردار لندن میں زیرِ تعلیم ہیں ۔لیکن اس کے باوجود ان کی جڑیں ہندوستان میں پیوست ہیں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اپنے مستقبل کے لیے فکرمند ہیں ۔اس کا اندازہ ذیل کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے۔

''آج کل بے روزگاری بڑھتی جارہی ہے۔اس کا انجام کیا ہوگا۔میں امتحان میں پاس بھی ہوں گا یا نہیں اور اگر ہو بھی گیا تو پھر اس کے بعد نوکری بھی ملے گی یا نہیں۔اور جو لوگ گولی سے مارے گئے ان کے بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا۔''(22)

اس طرح دیکھا جائے تو اس ناول میں سجاد ظہیر نے جہاں انگریزوں کے دور حکومت کا ذکر کیا ہے ۔وہیں پر نئی معاشی تحریکوں کا بھی ذکر کیا ہے ۔یہ ناول نوجوان طبقے کی ذہنی کشمکش کی کہانی ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم جزو ہے ۔سجاد ظہیر کے اس ناول کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے وقار عظیم لکھتے ہیں:

''اس مختصر سے ناول میں کرداروں کے عمل اور ان کے جذباتی ہیجان کے پیچھے کوئی نہ کوئی نفسیاتی گرہ ہے۔زندگی کے پس منظر میں ہر وقت اس کے انتشار کا احساس ہے ۔سیاست اور زندگی کا جو گہرا ربط ہوگیا ہے ،اس کا پرتو ہے ۔جنس اور اس کے مسائل کو علمی نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہے ۔فلسفہ اخلاق ، پرانے رسوم وقیود کا نہیں بلکہ فطرت کا پابند ہے ۔اس ناول کا انداز سرتاسر فکری ہے اور اس فکری انداز نے ہندوستان اور اس سے باہر یورپ کے ذہن کی الجھنوں کی مصوری کی ہے ۔کہیں کہیں اس میں سیاسی اور معاشی نقطہ نظر کی جھلک بھی ہے جو زندگی سے بھی زیادہ ادب پر چھانے کی کوشش میں مصروف ہے''(23)

حوالہ جات

باب چہارم

(1) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۲۰۶
(2) منشی پریم چند، چوگانِ ہستی، ص ۳۷۶
(3) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص ۲۲۵
(4) ڈاکٹر خالد اشرف، برصغیر میں اردو ناول، ص ۲۱۹
(5) عبدالمغنی، تنقیدی جائزے، ص ۱۵۲
(6) نورالحسنین۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ ص
(7) نورالحسنین۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ ص
(8) نورالحسنین۔ ایوانوں کے خوابیدہ چراغ ص
(9) ڈاکٹر احمد صغیر، اردو ناول کا تنقیدی جائزہ، ص ۲۲۰
(10) پروفیسر احتشام حسین، آنگن کا دیباچہ، ص ۱۵
(11) خدیجہ مستور، آنگن، ص ۲۴۱
(12) خدیجہ مستور، آنگن، ص ۳۰۴
(13) ڈاکٹر ایم اسلم قرۃ العین حیدر، بحیثیت ناول نگار ص ۲۳
(14) عبداللہ حسین، اداس نسلیں، ص ۸۱۳
(15) قمر رئیس علی احمد فاطمی، ہم عصر اردو ناول ص ۱۳۳
(16) خدیجہ مستور، دو گز زمین، ص ۲۴
(17) عبدالصمد، دو گز زمین، ص ۵
(18) قرۃ العین حیدر، آخری شب کے ہمسفر، ص ۳۵
(19) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۵۱
(20) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۶۲
(21) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص
(22) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص
(23) وقار عدیم، داستان سے افسانے تک، ص ۱۵۷

☆☆☆

باب پنجم

اردو ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی کا فنی، تنقیدی تجزیہ

باب پنجم
اردو ناولوں میں جدو جہد آزادی کی عکاسی کا فنی ،تنقیدی تجزیہ

پلاٹ

واقعات وحادثات کے اس خاکے کو کہتے ہیں جس میں قصہ کو اس اعتبار سے ترتیب دیا جاتا ہے جو ناول نویس کے پیش نظر شروع سے ہی رہتا ہے اور اسی پلاٹ پر ہی ناول کی کامیابی کا دارومدار منحصر ہوتا ہے ، پلاٹ کی بناوٹ میں جتنی زیادہ دل کشی ہوگی اتنا ہی اچھا پلاٹ سمجھا جائے گا۔ پلاٹ میں ان واقعات کی عکاسی ہوتی ہے جو انسان کی زندگی میں پیش آتے ہیں ۔ پلاٹ ایک طرح سے کہانی کا ایک جز ہے ۔اگر کہانی اچھی ہوگی تو پلاٹ بھی اچھا ہوگا، اگر پلاٹ میں ذرا بھی ناہمواری ہوگی تو وہ دل کشی سے محروم ہوجائے گا۔ ایک کامیاب فن کار واقعات کو اس طرح ترتیب دیتا ہے جیسے موتی لڑی میں پروئے جاتے ہیں ۔ان واقعاقت میں ایسا منطقی تسلسل ہونا چاہئے کہ ایک کے بعد دوسرا واقعہ بالکل فطری معلوم ہو۔ پلاٹ کے تعلق سے احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی کا خیال ہے کہ:

> ''پلاٹ بنانا ایک قسم کا فن تعمیر ہے اور اچھے پلاٹ والے ناول کا ہر حصہ اس طرح تعمیر ہوتا ہے جیسے کسی عمارت کے الگ الگ حصے ،ایک سیدھے سے پلاٹ کے عموماً پانچ حصے ہوتے ہیں، پہلے حصہ میں تمام کرداروں کا تعارف ہوجاتا ہے۔ دوسرے حصے میں ان کرداروں کے معاملات میں گتھیاں پڑنے لگتی ہیں۔ تیسرے حصہ میں یہ گتھیاں اس طرح الجھ جاتی ہیں کہ ان کا سلجھانا محال معلوم ہونے لگتا ہے ۔ چوتھے حصے میں یہ سب گتھیاں سلجھنے لگتی ہیں اور پانچویں

حصہ میں تمام معاملات خاتمہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ایک بہت سیدھی سے ترکیب ہوئی، ناول نگار پلاٹ بنانے میں صرف کرتا ہے۔(1)

اگر کسی پلاٹ میں تمام واقعات وحادثات ایک دوسرے سے پوری طرح پیوست ہوں تو پلاٹ مربوط یا گٹھا ہوا کہلائے گا اور اگر پلاٹ اس طرح کا نہ ہوتو پلاٹ ڈھیلا ڈھالا کہلائے گا م جو ایک خامی ہے۔ امراؤ جان اور گٹھے ہوئے پلاٹ کی ایک بہترین مثال ہے اور فسانہ آزاد کا پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے۔ اس جائزے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ جدوجہد آزادی کے عکاس ناول پلاٹ کے کس طرح کے ہیں؟

ابن الوقت:

اس ناول کا پلاٹ سیدھا سادھا ہے، پلاٹ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے، واقعات میں ایک منطقی ربط اور تسلسل ہے، لیکن حجۃ الاسلام کے قصہ میں داخل ہونے کے بعد پلاٹ کی رفتار سست ہوجاتی ہے اور انجام کچھ غیر منطقی اور ابن الوقت جیسی خوددار طبعیت کے اعتبار سے غیر فطری سا معلوم ہوتا ہے۔

چوگانِ ہستی:

چوگانِ ہستی کو پریم چند نے اپنا بہترین ناول کہا ہے، اور یہ حقیقت بھی ہے اس لیے کہ گئو دان کو چھوڑ کر ان کے باقی تمام ناولوں کی بہ نسبت یہ زیادہ فنکارانہ ہے، اس ناول کا پلاٹ بہت سیدھا سادھا ہے، ''چوگانِ ہستی'' ایک اندھے بھکاری سورداس کی کہانی ہے، یہ مہاتما گاندھی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے والا انسان ہے۔ اس کی زمین ایک چالاک آدمی جان سیوک لے کر اس پر اپنا کارخانہ بنانا چاہتا ہے سورداس اس زیادتی کے خلاف ستیہ گرہ کرتا ہے لیکن جان سیوک چالاکی سے جیت جاتا ہے۔ سورداس مرنے سے پہلے کہتا ہے: ''ہم ہارے تو کیا میدان سے بھاگے تو نہیں، روئے تو نہیں، دھاندلی تو نہیں کی پھر کھیلیں گے ذرا دم تو لینے دو۔ ایک نہ ایک دن ہماری جیت ہوگی ضرور ہوگی''

میدانِ عمل

میدانِ عمل کا پلاٹ ایک ایسے کردار کی سیرت کے ارتقا سے متعلق ہے جو آہستہ آہستہ ایک سیاسی لیڈر بن جاتا ہے۔شروع میں امرکانت اپنے گھر کی زندگی سے غیر مطمئن ہے اسے اپنے باپ سمرکانت کی سودخوری، مکاری، وریاکاری بالکل پسند نہیں وہ اپنی بیوی سکھدا کی فیشن پرستی اورامیرانہ ذہنیت سے ناخوش ہے، آخر میں کسان تحریک کا لیڈر بن کر گرفتار ہوجاتا ہے اور لکھنؤ سنٹرل جیل بھیج دیا جاتا ہے۔ نیز اس ناول میں زندگی کا ایک نیا رخ یعنی انگریزوں کا ظلم وستم سامنے آتا ہے جو منی کی عصمت دری کے واقعے کے سلسلے میں نمایاں ہوتا ہے۔منی کا مقدمہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں کے غم وغصہ اورنفرت کو ظاہر کرتا ہے۔ بڑھیا پٹھانی سے امرکانت کا تعارف غریب مسلمان طبقہ کی معاشی حالت اور کسم پرسی کو ظاہر کرتا ہے۔اس ناول میں دیہاتی زندگی کے مسائل، کسانوں اورزمین داروں کی کش مکش اور کسانوں کی جدوجہد کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔

لندن کی ایک رات

''لندن کی ایک رات'' کا پلاٹ بہت سیدھا سادھا ہے۔ یہ پلاٹ ایک رات کی کہانی پر مشتمل ہے جس میں لندن میں تعلیم حاصل کررہے چند ہندوستانی طلباء کے ذہنی انتشار اور جذباتی ونظریاتی کشمکش کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس ناول کے تعلق سے سجاد ظہیر خود لکھتے ہیں:

> ''اس ناول میں ہندوستان کے طالب علموں کی داخلی اور خارجی زندگی کو بھرپور طریقے سے پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔لندن میں تعلیم کے سلسلہ میں مقیم طلبہ کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ لندن کے مقابلے میں ہمارا ملک ہندوستان' زندگی کے تمام شعبوں میں کس قدر پیچھے ہے۔نہ تو اس کی اقتصادی حالت ہی بہتر ہے اور نہ معاشرتی۔لہٰذا یہ سب کے سب طالب علم مل کر ہندوستان کی غلامی، افلاس، جہالت اور مظلومی کے بارے میں غورفکر کرتے ہیں اور اظہار افسوس بھی کرتے ہیں۔ناول کے تمام کردار نعیم، اعظم، احسان اور راؤ ذہنی کشمکش کے شکار ہیں''(2)

''آگ''

عزیز احمد کا ایک نہایت ہی اہم ناول ''آگ'' ہے، اس ناول میں انہوں نے کشمیر کے قدرتی پسِ منظر میں تہذیبی زندگی کو پیش کرنے کی ایک اچھی کوشش کی ہے۔اس ناول کی کہانی ایک ہی خاندان کی تین نسلوں عضنفر جو کے بیٹے سکندر جو اور اس کے بیٹے انور جو کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔ بنیادی طور پر یہ تینوں کردار سرمایہ دارانہ وجاگیردارانہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔خواجہ عضنفر جو پہلی نسل سے تعلق رکھتا ہے، وہ قالینوں کی خرید وفروخت کے کاروبار سے وابستہ ہے اور قالینوں کے بارے میں معلومات میں ان کو کمال حاصل ہے۔اسی لیے ان کا کاروبار ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ دولت کی فراوانی اور سرمایہ دارانہ ذہنیت نے عضنفر جو کو غلط راہ پر ڈال دیا،ان کی بے راہ روی اس وقت سامنے آتی ہے، جب وہ اپنے پڑوس میں رہنے والی نانبائی کی انتہائی خوبصورت بیوی ''زون'' سے تعلقات قائم کرلیتا ہے زون کا ماموزاد بھائی رمضان بھی اس پر عاشق ہے،لیکن وہ رمضان کی بدشکلی کی وجہ سے اسے منہ نہیں لگاتی۔غصے میں آکر ایک دن رمضان اس کے اوپر تیزاب پھینک دیتا ہے،جس سے زون کی خوب صورتی ضائع ہوجاتی ہے۔اس کے بعد عضنفر جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا،عضنفر جو اور زون کے تعلقات پیش کرکے ناول نگار کشمیر کی غریب عوام کی غربت، اخلاقی پستی اور بے حسی کو اس طرح پیش کیا ہے کہ بجائے نفرت وکراہت کے عوام کی بے چارگی اور سرمایہ داروں کی بے حسی پر کفِ افسوس ملنا پڑتا ہے۔

آگ کا دریا

''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر کی بہترین اور اعلیٰ پایہ کی تصنیف ہے۔اس ناول کے پلاٹ کے سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ ناول کا فکری پسِ منظر قدیم ہندوستانی تہذیب کے اولین دور سے شروع ہوتا ہے اور نئے ہندوستان میں مکمل ہوتا ہے تقریباً آج سے ڈھائی ہزار سال قبل کی ہندوستانی تہذیب کے دور سے ناول کا آغاز ہوتا ہے، اس ناول میں جگہ جگہ ہندو مسلم کے

کلچر کا امتیاز دکھایا گیا ہے اور اس کے بعد ہندوستان کی تقسیم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ جن میں معاشرتی، معاشی، جذباتی، مذہبی اور سیاسی مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ جن منازل سے ہوکر گزرتی ہے، ان میں سے چند روشن پہلوؤں کو چن کر ہندوستان کی روح کی عکاسی کرداروں کے ذریعہ کی گئی ہے۔

اس طرح ''آگ کا دریا'' میں ہندوستانی تہذیب کے ارتقا کی کہانی، شراوشی اور پائلی پتر کی تہذیب، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب، انگریزی سماج کی چیرہ دستیاں اور پھر اس کا زوال، مختلف قومی تحریکیں، ہندوستان کی آزادی کے لیے جدو جہد پھر آزادی کے بعد تقسیم کا مسئلہ اور پھر جدید ہندوستانی اور پاکستانی معاشرتوں کا احاطہ بڑے کامیاب ڈھنگ سے کیا گیا ہے، اس ناول میں کلچر، تہذیب وتمدن، فلسفہ، رقص وموسیقی، روحانیت اور تخیل کی پرواز ایک وسیع کینوس پر موجود ہے، غرض یہ کہ ''آگ کا دریا'' کا پلاٹ ایک وسیع وعریض منظرنامے پر محیط ہے اور اس کو قرۃ العین حیدر نے بڑے ہی فنکارانہ اور ماہرانہ انداز میں برتا ہے۔

آخر شب کے ہم سفر

قرۃ العین حیدر کا ناول آخر شب کے ہم سفر بلاشبہ اپنے موضوع اور اہمیت کے اعتبار سے ان کی سابقہ تحریروں میں آگ کا دریا کے بعد سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بیانیہ، سوانح اور خطوط وڈائری جیسی قدیم تکنیکوں کے اشتراک سے عمل میں آیا ہے۔ اس ناول کے قصے کا خمیر بنگال کے کلچر سے اٹھا ہے۔ اس کی کہانی کچھ اس طرح سے ہے۔ ڈھاکے کے ایک معمولی ڈاکٹر بنوئے، چندر سرکار کا گھر چندر کنج ہے۔ جن کی بیٹی دیپالی سرکاری، بنگال کے دہشت پسندوں کے گروہ کی ایک ممبر ہے اور اپنی پارٹی کی مالی امداد کے لیے گھر میں لگا کر چوری کرتی ہے اور اس کی رقم سے پارٹی کی حالیہ ضرورتوں کو پوری کرتی ہے۔ اس تحریک کے رہنماء ریحان الدین عرف ریحان گرفتاری کے خوف سے کسی سے ملتا بھی نہیں۔ بہت قریب کے لوگ اس کو جانتے ہیں کہ وہ کہاں ہے، خود دیپالی نے بھی اس کو نہیں دیکھا یہ اپنا لباس بدل کرتا ہے اور اس تحریک سے متعلق ہدایات دے کر روانہ ہوجاتا ہے۔ اس کہانی میں آگے چل کر روزی

بنرجی جو ایک غریب پادری کی بیٹی ہے وہ سین پر نمودار ہوتی ہے۔انگریزوں کے خلاف تحریک میں حصہ لیتی ہے، لاٹھی چارج میں زخمی ہوتی ہے اور گرفتار ہو کر جیل چلی جاتی ہے اور پھر ضمانت پر رہا ہوتی ہے۔ضمانت پر لینے والا ایک شخص عزیز بسنت ہے۔جس سے روزی شادی کر لیتی ہے ۔اس طرح یہ کہانی آگے بڑھتی رہتی ہے۔غرض یہ کہ اس ناول کا پلاٹ سبب ومسبب کے مطابق کرداروں کے حرکات وسکنات سے تیار ہوتا ہے۔

آنگن

خدیجہ مستور کے اس ناول کا پلاٹ بہت منظّم اور مربوط ہے۔آنگن میں جس خاندان کی کہانی بیان کی گئی ہے پہلے تو وہ خوش حال تھا کہیں جاگیردارانہ نظام کے ختم ہونے کی وجہ سے مالی دشواریوں کا شکار ہو جاتا ہے ایسے وقت میں ملازمت یا تجارت کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس خاندان کے کچھ افراد ملازمت کر لیتے ہیں اور کچھ تجارت میں ہاتھ آزماتے ہیں۔اس ناول کا مرکزی قصہ گھر کے آنگن اور کنبے کے افراد کی دنیا سے باہر نہیں نکلتا ہے۔اس ناول کے پلاٹ کی تشکیل میں خدیجہ مستور نے بڑی ہنرمندی سے کام لیا ہے ناول کا پلاٹ بے حد مربوط اور جامع ہے جس کا ارتقاء بے حد فطری اور منظّم انداز میں ہوا ہے۔

اداس نسلیں

اس ناول کے پلاٹ کی وسعت برصغیر کے پیچیدہ تر معاشی حالات کی ترجمانی کرتی ہیں اور غیر منقسم ہندوستان کے ایک بڑے ماحول کو پیش کرتی ہے۔اس ناول کا پلاٹ ۶۴۸ صفحات پر مشتمل ہے اور اس میں زندگی کے بہت سارے تجربات ومشاہدات ملتے ہیں۔قبرص ،بلجیم،فرانس اور مصر وغیرہ ممالک کی تفصیلات بھی یہاں ہیں۔ظاہر بات ہے اتنا بڑا امکانی علاقہ ناول کے پس منظر میں موجود ہو تو اس کے تجربات کی وسعت لازمی طور پر بڑھ جائے گی۔

اچھے ناول کے واقعے آپس میں اس طرح جڑے اور مربوط ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو تمام واقعات ایک ہی قصہ کے اجزاء معلوم ہوتے ہیں۔یہ صفت اداس نسلوں میں نظر نہیں آتی۔ پلاٹ ڈھیلا ڈھالا ہے واقعات پھیلتے ہیں تو اس پھیلاؤ کا کوئی منطقی جواز اور معقول سبب فراہم

نہیں کیا جا سکتا، جس کی وجہ سے ناول کے واقعات کا تاثر کم ہو جاتا ہے اور ماجرا نگاری پھیکی معلوم ہوتی ہے۔ پلاٹ میں کساوٹ اور جامعیت ہو تو یہ ناول موجودہ دور میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتا۔

تلاش بہاراں

اس ناول کے پلاٹ میں حسن واثر کی کمی صاف دکھائی دیتی ہے۔ ماجرا نگاری بھی ایک طرح سے ڈھیلی ڈھالی ہے۔ واقعات گٹھے ہوئے نہیں ہیں کرداروں میں زندگی کی حرارت اور تنوع نظر نہیں آتا۔ لیکن جمیلہ ہاشمی نے نسوانی کرداروں کے جذبات اور کیفیات کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

اس ناول کا انداز تحریر بیانیہ ہے اس لیے راوی واقعات و تجربات کو قصے کے رنگ میں بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ رویندر کمار اور کرشنا بوس کے مقدمہ سے ناول کا آغاز ہوتا ہے۔ رویندر اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتا ہے اور کرشنا بوس ویش ہے۔ دونوں جذبۂ محبت سے معمور ہو کر شادی کے بندھن میں بندھتے ہیں۔ مگر رویندر کے والدین کے لیے یہ شادی توہین کے مترادف ہے۔ چنانچہ رویندر کو کرشنا سے الگ کرانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے۔ اس موقع پر کنول کماری کرشنا کی مجبوری و مظلومی اور معصومیت کے دفاع کے لیے سامنے آتی ہے۔ کنول خود اونچی ذات سے تعلق رکھتی ہے مگر وہ ذات پات کی تفریق اور تعصب سے بہت اونچی ہے۔ کرشنا سے رویندر کی علیحدگی کو کرشنا کی بے عزتی اور تمام عورتوں کی توہین تصور کرتی ہے۔ چنانچہ کرشنا کی حمایت میں پرزور بیان دیتی ہے پھر اس کا تعلق مختلف قسم کی سیاسی تحریکوں سے ہو جاتا ہے۔

لہو کے پھول

حیات اللہ انصاری نے ناول کے پلاٹ کی تشکیل میں فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے'' لہو کے پھول'' کے بنیادی قصے کا مرکز اتر پردیش کا قصبہ بن کٹ پور ہے۔ جہاں کسان امر سنگھ اپنی بیوی چیتا کے ساتھ ایک زمین دار کے ذریعہ اپنے آبائی وطن سے محروم کئے جانے پر آ کر

بود و باش اختیار کرتا ہے وہ مہاراج کی بنجر زمین کو کاشت کے قابل بناتا ہے ۔ برجو اور اس کی بیوی سانولی چماری اسی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں ۔ان دونوں خاندانوں کے توسط سے ناول نگار نے کسانوں کے استحصال اور اچھوتوں کے مسائل کو پیش کیا ہے۔

انقلاب

خواجہ احمد عباس کا انقلاب ایک سیاسی ناول ہے ۔اس ناول میں سیاسی شعور جلیان والا باغ سے شروع ہوکر نمک ستیہ گرہ اور گاندھی ارون پیکٹ پر ختم ہوجاتا ہے ۔ناول کا ہیرو ایک ایسا کردار ہے جو ہندوستان کے سیاسی حالات کو کیمرہ کی تصویروں کی طرح پیش کرتا چلا جاتا ہے ۔ناول کے پس منظر میں انور کی بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور اور اس کے ذاتی حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔جس میں اس کا اپنا سیاسی نظریہ بھی شامل ہے وہ اپنے سیاسی نظریات وخیالات کا اظہار کرتے وقت زیادہ جوشیلا اور جذباتی نظر آتا ہے ۔ناول میں ملک کی سماجی زندگی کی اس طرح عکاسی برائے نام کی گئی ہے جس طرح کا سماج گئودان ، ٹیڑھی لکیر، شکست یا عزیز احمد کے ناولوں میں ملتی ہے۔

دوگز زمین

دوگز زمین کا پلاٹ تحریک خلافت سے شروع ہوکر کانگریس کی پالیسیوں، مسلم لیگ کی تعمیر وتشکیل، حصول آزادی کے بعد کی صورتحال اور قیام بنگلہ دیش پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔

دوگز زمین کی ابتداء بہار کے ایک ایسے گاؤں سے ہوتی ہے جس کے زمین دار شیخ الطاف حسین ہیں جو خلافت تحریک کے پرزور حامی ہی نہیں بلکہ اس تحریک کے ایک مخلص کارکن کی حیثیت رکھتے ہیں ۔حصول آزادی کی تحریک میں اور خلافت تحریک میں بھی ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔

اس ناول کا پلاٹ بے حد مربوط اور جامع ہے ۔اس کا آغاز وارتقاء اور انجام جدا جدا نقوش پر بے حد فطری اور منظّم انداز پر ہوا ہے۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' کا پلاٹ سیدھا سادھا اور آسان ہے اس ناول کی کہانی ایک ویران قبرستان سے شروع ہوتی ہے جس میں حیدر خان تارا بائی اور پنڈت کڑا کے کی ٹھنڈ میں ایک الاؤ کے پاس بیٹھے ہیں اور اپنے انقلابی ساتھی کے آنے کا انتظار کر رہے ہیں اور وقت گزارنے کے لیے اپنی اپنی کہانی ایک دوسرے کو بتا رہے ہیں کہ کس طرح انگریزوں کو چکمہ دے کر فرار ہو گئے۔

☆☆☆

کردار نگاری

کسی بھی ناول کی ادبی اہمیت اس کی کردار نگاری پر منحصر ہے اگر کوئی ناول نگار کردار نگاری کی قوت نہیں رکھتا تو وہ صحیح معنی میں ناول نگار کہلانے کا مستحق نہیں ہے، اس لیے کہ ناول ایک طرح سے انسانی زندگی کا بیانیہ ہے اور پوری زندگی کا عکاس بھی ناول کے عناصر ترکیبی میں جو اہمیت پلاٹ کو حاصل ہے وہی اہمیت بہت حد تک کردار نگاری کو بھی حاصل ہے۔ ناول کے واقعات کو عموماً کرداروں کے ذریعہ ہی پیش کیا جاتا ہے۔ کامیاب کردار نگاری کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس لیے ناول نگار زندگی کے حقائق پر ہی کرداروں کی تشکیل کرتا ہے۔ ایم، اے فورسٹر کردار نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ناول کی ادبی اہمیت اس کی کردار نگاری پر منحصر ہے اور اگر کوئی ناول نگار کردار نگاری کی قوت نہیں رکھتا تو وہ صحیح معنی میں ناول نگار کہلائے جانے کے لائق نہیں ہے، کردار کی زندگی عام زندگی نہیں ہوتی بلکہ ناول نگاری کی قوت متخیلہ اس کو ایسی زندگی بخش دیتی ہے کہ وہ عام لوگوں سے زیادہ پر کیف اور پر اثر ہو جاتی ہے۔(3)

ناول میں جو کردار پیش کئے جاتے ہیں وہ دو طرح کے ہوتے ہیں ایک کردار تو وہ ہوتا ہے جو شروع سے ہی ایک پختہ اور پائدار رنگ میں رنگا ہوتا ہے، واقعات وحادثات اس پر کچھ اثر نہیں کرتے بلکہ خود لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں جیسے نذیر احمد کی اصغری اور بعض کردار ایسے ہوتے ہیں جو شروع سے ہی پختہ نہیں ہوتے بلکہ شروع سے آخر تک ان کی سیرت میں ارتقائی عمل دکھائی دیتا ہے۔ ''امراؤ جان ادا'' کا امراؤ۔ اسی طرح کے کردار جیتے جاگتے کردار کہلاتے ہیں اور ادب کی دنیا میں امر ہو جاتے ہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ ناول میں کسی کردار کی مکمل شخصیت

وسیرت کا اظہار کیا جاتا ہے، اس لیے ناول میں کردار نگاری کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔اس جائزے کے بعد آیئے دیکھتے ہیں کہ جدوجہد آزادی کے ناولوں میں ناول نگاروں نے اپنے کرداروں کو کس انداز میں پیش کیا ہے؟

ابن الوقت:

اس ناول کے کرداروں میں ابن الوقت ایک زندہ اور متحرک حقیقت ہے، ماحول سے متاثر ہو کر اس میں تبدیلیاں آتی ہیں۔ان تمام تبدیلیوں کو نذیر احمد نے واقعات اور ردعمل کے ذریعے اجاگر کیا ہے۔نذیر احمد کا آئیڈیل کردار تو حجۃ الاسلام ہے لیکن اس کی ہمدردیاں ابن الوقت کے ساتھ ہیں وہ اس کو نشانۂ ملامت تو بناتے ہیں لیکن کہیں اسے ذلیل بے غیرت نہیں کہتے۔نذیر احمد کے کرداروں میں ابن الوقت کا کردار معتوب ہونے کے باوجود ایک ایسا کردار ہے جو آفاقیت لیے ہوئے ہے۔

چوگانِ ہستی

گاندھی جی کے عدم تشدد کا مجسم روپ ''چوگانِ ہستی'' کے سورداس کی شکل میں نظر آتا ہے کچھ نقاد تو سورداس کے کردار کو گاندھی جی ہی کے کردار سے مماثل قرار دیتے ہیں۔سورداس ہندوستانی عوام کے جذبات واحسات اور حریت پسندی کی علامت ہے۔سرمایہ دار جان سیوک اس کی زمین چھین کر اس پر فیکٹری قائم کرنا چاہتا ہے لیکن سورداس عدم تشدد پر مبنی مزاحمت کرتا ہے، ''چوگانِ ہستی'' ان دونوں کرداروں کی آویزش پر مبنی ہے۔ان دونوں کرداروں کے علاوہ سورداس ہی کی طرح غریب اور کچلے ہوئے عوامی طبقے کے نمائندے۔نائک رام، سوبھاگی اور بجرنگی وغیرہ بھی ہیں۔اور یہ تمام افراد اپنے اپنے طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔

میدانِ عمل

اس ناول کا مرکزی کردار جس کے اردگرد کہانی کا تانا بانا بنتا ہے' امرکانت ہے۔ امرکانت ذات کے بھید بھاؤ کے خلاف اس طرح اعلان جنگ کرتا ہے نظر آتا ہے۔''میں ذات پات نہیں جانتا جو سچا ہو وہ چمار بھی ہو تو عزت کے لائق ہے۔جو دغاباز، جھوٹا اور مکار ہو وہ

برہمن بھی ہوتو عزت کے لائق نہیں''

ہندوستان میں مذہبیت عام ہونے اور روحانیت گم ہونے کا شکوہ پریم چند کو بھی رہا اس کی اصلاح کے لیے بھی ''میدانِ عمل'' میں کافی زور دیا گیا ہے۔ سمر کانت کے کردار کی آڑ لے کر پریم چند نے دکھاوے کے مذہب کا خوب مذاق اڑایا ہے، اس کی ایک جھلک دیکھئے ''سمر کانت کی عملی زندگی ان کی مذہبی زندگی سے بالکل الگ تھی۔ دنیاوی معاملات اور لین دین میں وہ دھوکہ دھڑی، دغابازی سب کچھ جائز سمجھتے تھے'' ''میدانِ عمل'' میں عورتوں کے کردار میں ہندوستانی عورت کی تماہ جلوہ سامانیاں موجود ہیں، جس میں شوہر سے وفاداری، عزت وناموس کی حفاظت شرم وحیا کا احساس اور بے خوفی اور یقین کی صفات، دامنِ دل کو کھینچتی ہے۔

لندن کی ایک رات

اس ناول کے بیشتر کردار فکر واحساس کی سطح پر اپنی الگ الگ شناخت رکھتے ہیں اور مختلف ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہیں، مثلاً نعیم جو اس ناول کا سب سے اہم مرکزی کردار ہے، بے فکر، لاابالی پن، اور تعلیم سے بے پروائی کا شکار ہے، اس کی تھیسیس پانچویں باب سے کبھی آگے نہیں بڑھی، ختم ہونا تو درکنار، وہ ہر طرح کی سوسائٹی سے خود کو ہم آہنگ کرنے کا گر جانتا ہے۔ اسے سیاسی، سماجی اور تہذیبی تحریکوں سے بھی دل چسپی ہے۔ وہ دوستوں کی غم وخواری اور ہر موقع پر ان کی مدد کرنے کا جذبہ بھی رکھتا ہے، ''لندن کی ایک رات'' کا ایک اہم کردار اعظم ہے۔ جو ایک خوبصورت لڑکی جین سے عشق کرتا ہے۔ اور اس کا عشق ایک طرفہ ہے۔ یہ کس حد تک ہندوستانی زندگی سے مایوس وبیزار ہے اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے بہ آسانی لگایا جاسکتا ہے:

> ''آج کل بے روزگاری بڑھتی جارہی ہے۔ اس کا انجام کیا ہوگا۔ میں اپنے امتحان میں بھی پاس ہوں گا یا نہیں اور اگر ہو بھی گیا تو پھر اس کے بعد نوکری بھی ملے گی یا نہیں اور جو لوگ گولی سے مارے گئے، ان کے بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا''۔(4)

اس ناول کا ایک کردار عارف ہے، جو اپنا کوئی نظریہ نہیں رکھتا ہے، اس کی صرف ایک

خواہش ہے کہ وہ آئی ،ایس کا امتحان پاس کر کے کسی بڑے عہدے پر فائز ہو جائے اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنا سارا زور صرف کر دیتا ہے ،حتی کہ انگریزی نظامِ حکومت کی تعریف بھی کرتا ہے ۔ مذکورہ کرداروں کے علاوہ دو ایسے کردار بھی ہیں جو سیاسی ،سماجی ،معاشی اور ذہنی بیداری کے ترجمان ہیں اور یہ کردار احسان اور راؤ کے ہیں ، یہ دونوں ہی سماجی ، سیاسی اور معاشی نظام کی تبدیلی کے دلدادہ ہیں لیکن دونوں کرداروں میں فرق یہ ہے کہ احسان کا نقطۂ نظر بالکل واضح اور صاف ہے وہ اشتراکیت کے ذریعے سیاسی آزادی ،سماجی انصاف اور معاشی مساوات پیدا کرنے کا حامی ہے ۔ جب کہ راؤ ملک کی آزادی اور اشتراکیت کا حامی تو ضرور ہے ،لیکن اس کے نظریات واضح نہیں ہیں بلکہ وہ تشکیک کا شکار ہے ۔

آگ

عزیز احمد کے اس ناول کا اگر کردار نگاری کے اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو اس ناول کا ایک کردار سکندر جو ہے ۔ ناول نگار نے اس کردار کو ایک تعلیم یافتہ اور فیشن زدہ نوجوان کی شکل میں پیش کیا ہے ،اس نوجوان کو انگریزی زبان بھی آتی ہے ۔اس لیے اپنے والد کی تجارت میں مدد بھی کرتا ہے ۔لیکن سکندر جو بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے زون کی بیٹی فضلی سے عشق کرنے لگتا ہے ۔شروع شروع میں فضلی اس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتی اور سکندر جو عجیب طرح کے احساس کا شکار ہوتا ہے ۔لیکن عین اپنی شادی کے موقع پر چار سو روپئے اور دو زیوروں کے عوض اس کو حاصل کر لیتا ہے اور بیوی بے چاری انتظار کی گھڑیاں دیکھتی ہے ۔سکندر جو کے کردار کے ذریعہ ناول نگار نے ،سرمایہ دارانہ ذہنیت کی پستی واضح کرنے کی کوشش کی ہے ۔

عضنفر جو اور سکندر جو کے برعکس انور جو تیسری نسل سے تعلق رکھتا ہے جدید تعلیم ، بدلتے ہوئے ماحول ،اور جدید عہد کے مطالبات ورجحانات کے باعث مزدوروں ،کسانوں اور محنت کشوں کی حمایت کرتے ہوئے خود کو عصری تقاضے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے ۔اس نے علی گڑھ میں بی ،اے تک تعلیم حاصل کی ہے ،اس لیے ہندوستان کی سیاست کا اثر اس پر پڑنا لازمی تھا ۔اس لیے وہ پرانی روایتوں پر اندھا دھند چلنے کا قائل نہیں ہے ۔ اپنے باپ

دادا کے برعکس اپنی بیوی کو انسان سمجھتا ہے، وہ اپنی بیوی کو پردے میں رکھنا چاہتا ہے ،لیکن ہوا اور دھوپ سے محروم بھی رکھنا نہیں چاہتا۔انور جو کے کردار میں ہمیں عہد جدید کے انسان کی جھلک صاف صاف نظر آتی ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ باشعور اور زمانے کی رفتار سے بھی ہم آہنگ ہے۔

اس ناول میں ایک کردار شبانہ کا بھی ہے جو بے انتہا چرب زبان اور چلتا پرزہ انسان ہے جو سکندر جو کا خاص آدمی ہے ،اس کردار کے ذریعہ ناول نگار نے کشمیری عوام کے ایک طبقے ملالوں کی طرز زندگی ،ان کے طور طریقے اور ذہنیت کی بخوبی عکاسی کی ہے۔

اس ناول میں ایک کردار مہتاب جنگ کا بھی ہے، جو خودغرض ،عیاش' ابن الوقت اور موقع پرست ہے ،لیکن اسے شروع سے آخر تک مہتاب جنگ کا کردار ایک خاص لہجہ پر ہی کام کرتا ہے ،اس کردار کے اندر ابتدا میں تحریک آزادی سے متعلق ان کے اندر جوش وخروش تھا، وہ ملازمت کے بعد یکسر بدل جاتا ہے۔ایسے حقیقی کرداروں سے ہماری ملاقات آج کے سماج میں بھی قدم ،قدم پر ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا تمام کرداروں کی تخلیق کے ذریعہ ناول نگار نے اپنے حقیقت پسندانہ نظریہ کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

آگ کا دریا

''آگ کے دریا'' میں قرۃ العین حیدر نے تقریباً دھائی ہزار سال پرانی تہذیبی وتاریخی زندگی کا سفر طے کیا اور دکھلایا ہیکہ سیاست ہر دور میں اپنی بساط بچھاتی ہے۔جس میں ہمیشہ عوام خسارے میں رہتے ہیں' عوام کی مرضی کبھی نہیں پوچھی جاتی' عوام عموماً امن پسند ہوتے ہیں ؛مگر سیاست ان کو لڑاتی ہے۔اس طرح کے مسائل کی عکاسی اس ناول کے مختلف کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے۔اس ناول کا ایک کردار گوتم ہے۔

گوتم ،عہد عتیق کا برہمن ،قانون ساز اور فلسفی ہے،اس نے وجود اور عدم وجود، بھاؤ ابھاؤ کی تفصیلات کا مطالعہ کیا،ادراک ،منطق اور استنباط کے ذریعے چیزوں کی کھوج لگانے کی سعی کی

تھی ۔اس جیسے طالب علم کو بھی چندر گیت موریہ اور چانکیہ (کوئلیہ) کی سیاسی چالیں اور ملک کی ہوس گیری کی وجہ سے اپنے وطن کی حفاظت کے لیے جنگ کرنی پڑی جس میں اس مشہور مصور کی انگلیاں کٹ گئیں اور پھر وہ کبھی تصویر نہ بنا سکا۔

اسی طرح مسلمانوں کے دورِ حکومت میں سیاست نے اپنی فوج میں علاقائی لوگوں کو شامل کیا اور عوام نے حکومت کی سربراہی میں ایک راجا کے ساتھ دوسرے راجا سے جنگ کی ،مسلمان راجاؤں کے ساتھ ہندو سپاہیوں اور ہندو راجاؤں کے ساتھ مسلمان سپاہیوں نے جنگیں کیں ،حکومت اور سیاست کے لیے قربانیاں دیں مگر بعد میں انہیں لوگوں کو غدار کہا گیا اس کی بہترین مثال ابوالمنصور کمال کی ہے جو اس آگ کے دریا کا ایک کردار ہے۔اس کی ایک مثال ناول کے اس اقتباس میں دیکھئے:

''اس نے کس کا قصور کیا؟ اسے افغانوں اور مغلوں کے جھگڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے وہ صرف اتنا چاہتا ہے کہ یہاں اسے امن سے رہنے دیا جائے ، یہ اس کا ملک ہے، اس کا وطن ہے ۔ یہاں اس کے بچے پیدا ہوئے ہیں، یہاں اس کی بی بی کی قبر ہے، یہاں اس کے دھان کے کھیت ہیں، اس نے زبان کی آبیاری کی ہے اس نے گیت بنائے ہیں، وہ یہیں رہے گا۔اس کو غدار کہنے کا حق کسی کو حاصل نہیں یہ دارالحرب نہیں ہے، دارالسلام ہے۔''اس لمحے سے انکشاف ہوا کہ دارالحرب اور دارالسلام میں صرف روپے کا فرق ہے ،لڑائیاں دو مذہبوں کے درمیان نہیں ہوتیں، دو سیاسی طاقتوں کے درمیان ہوتی ہیں۔''(5)

آگ کے دریا سے ایک اور اہم بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جو لوگ پاکستان کے حامی اور چاہتے تھے کہ ملک تقسیم ہو جائے ، ان میں سے زیادہ تر لوگ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم پر پاکستان نہیں گئے ۔قرۃ العین حیدر نے اس بات کی طرف اشارہ اپنے بہت اچھے کردار چمپا احمد کے ذریعہ کیا ہے ان کے علاوہ اس ناول میں اور بھی بہت سے کردار ہیں مثلاً ہری شنکر، چمپا، طلعت ،روشن ، ساجدہ ، فیروز وغیرہ ان کرداروں کے توسط سے یہ ناول آگے بڑھتا ہے۔

آخر شب کے ہم سفر

''آخر شب کے ہم سفر'' ایک کرداری ناول ہے اس میں مصنفہ نے دیپالی کا کردار سنوارنے میں بڑی محنت کی ہے۔ دیپالی ہی ناول کی روح رواں ہے اور اس کی کارکردگی سے ناول میں جان پیدا ہوتی ہے وہ تحریک آزادی اور انقلابی تحریک کو کارگر اور موثر بنانے میں اپنی مثال آپ ہے' ہندوستانیوں کے خلاف انگریز کی سازش کا راز اٹھانے کی غرض سے کلکٹر کی کوٹھی پر کلثوم کا رخ اختیار کر کے گھریلو ملازمہ تک بن جاتی ہے۔ دراصل دیپالی کو حب الوطنی اور ایثار وقربانی کا جذبہ ورثے میں ملا ہے۔ اس کے چچا ملک کی آزادی کو ترجیح دیتے ہوئے خود کو پھانسی پر لٹکانا گوارا کیا تھا۔ ناول کے ایک مقام پر دیپالی سرکار نے تحریک آزادی میں اپنے خاندان کی خدمات کا حال جس دردناک انداز میں اوما رائے سے سنایا ہے اس سے مجاہدین آزادی کی بدحالی اور عسرت کا نقشہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو!

> ''ٹھاکردا کی زندگی میں بابا اور کاکا تحریک میں شامل ہو کر جیل یاترا کے لیے گئے تھے۔ اس زمانے میں ہمارے یہاں ایسی غربت چھائی کہ بعض دفعہ رات کو مٹی کا تیل خریدنے کے لیے پیسے بھی نہیں ہوتے تھے صرف اسی امید نے ہم سب کو زندہ رکھا کہ انگریز سے چھٹکارا ملنے کے بعد دیش کے اندر سارے اندھیرے گھروں میں اجالا ہو جائے گا۔(6)

اس کے علاوہ اس ناول میں کئی چھوٹے موٹے کردار بھی اپنا ایک رول ادا کرتے ہیں اگرچہ وہ بڑے کرداروں کے لیے مددگار ہیں۔

آنگن

آنگن کی کردار نگاری نہایت متوازن، مکمل اور پرکشش ہے اس کے کم وبیش تمام کردار زندگی کی سچائیوں سے وابستہ ہیں' ان کرداروں میں ایک اہم کردار بڑے چچا کا ہے۔ بڑے چچا پر مذہب کا خاصا اثر دکھائی دیتا ہے اس کے باوجود بھی وہ سیاست سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ کاروبار اور گھر کے مسائل سے بڑی حد تک بے نیاز ہو جاتے ہیں ان کی لاپرواہی اور بے خبری نے ان کی تجارت کو شدید نقصان پہنچایا اور گھر کی اقتصادی حالت بگڑتی

چلی گئی۔

اس ناول میں صفدر کا کردار بھی قابل توجہ ہے' یہ بہت حساس کردار ہے' عالیہ کی بڑی بہن تہمینہ سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے مگر اس کی یہ محبت شادی میں تبدیلی نہیں ہوتی ۔صفدر حالات کے طمانچے کھاتا ہے پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتا ہے ۔صفدر کا کردار ناول کے ابتداء میں کچھ متحرک نظر آتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو باپ سے بھی ٹکرانے کو تیار ہے۔فطرت کے چیلنج کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہی کردار جب علی گڑھ سے واپس آتا ہے تو بدلا بدلا دکھائی دیتا ہے۔وطن کی بھلائی میں دن رات سرگرم رہنے والا ،جیل کی مشقتوں کو برداشت کرنے والا پست ہمتی کا شکار ہوگیا ۔ یہی کردار عالیہ کا رشتہ مانگتے ہوئے کہتا ہے :اب میں کوٹھی اور کار کا خواب پورا کردوں گا۔

اس ناول کے ضمنی کرداروں میں اسرار میاں کا کردار سب سے جاندار ہے یہ کردار پڑھنے والوں پر اپنا اثر دیر تک قائم رکھتا ہے ۔اس کی زندگی المناکیوں ،محرومیوں اور دکھوں کی داستان ہے ۔ یہ شرافت ،ایثار اور خلوص کا پیکر ہے ۔مگر دادا کی داشتہ کی اولاد ہے ۔اس لیے وہ کوئی سماجی وقار حاصل نہیں کرسکا۔

اداس نسلیں

اس ناول کا قصہ پہلی جنگ عظیم سے کچھ پہلے کے ماحول سے شروع ہوتا ہے ۔نعیم اس ناول کا مرکزی کردار ہے جب جنگ عظیم چھڑ جاتی ہے تو نعیم اس میں شریک ہوتا ہے اور بہت سے محاذ پر اپنی بہادری اور جوان مردی کے جوہر دکھاتا ہے پھر محاذ جنگ سے واپس ہندوستان آتا ہے ۔ یہاں واپس آکر وہ ملک کی آزادی کی تحریک میں شامل ہوجاتا ہے، پہلے اس نے دہشت پسندوں قوم پرستوں کی تنظیم میں شمولیت حاصل کرتا ہے ۔اس کے بعد وہ کانگریسی تحریک سے وابستہ ہوجاتا ہے۔آزادی کی تحریکوں سے وابستگی کے نتیجہ میں ملک کی متعدد طاقتور سیاسی لہروں اور قومی دھاروں کی نمائندگی ہوتی ہے ۔مسلم لیگ کا زور، جلیان والا باغ کا حادثہ،نمک تحریک ،عدم تعاون تحریک،صوبہ سرور میں کانگریس تحریک کا اثر وغیرہ۔اس طرح دیکھا جائے تو نعیم کے

کردار میں وسعت ضرور ہے لیکن اس کردار کا فطری ارتقا ناول میں نہ ابھر سکا اس لیے کہ ناول نگار اسے واقعات میں کھپاتا نظر آتا ہے حالانکہ نعیم کو خود ہی فعال اور متحرک ہونا چاہیے تھا۔

اس ناول کا دوسرا کردار عذرا ہے۔ نعیم کے ساتھ عذرا کے کردار کا گہرا تعلق ہے نعیم کے جیل جانے کے بعد عذرا براہ راست سیاسی تحریک میں شامل ہو جاتی ہے۔ لکھنو میں سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرہ کرتی ہے اور جیل میں اپنے شوہر نعیم سے ملاقات کرتی ہے۔

تلاش بہاراں

اس ناول کا مرکزی کردار کنول کماری ٹھاکر ہے۔ یہ مثالیت پسندی کا بہترین نمونہ ہے دنیا کی تمام خوبیاں اس کے اندر موجود ہیں۔ خوبصورتی، ذہانت، لیاقت، خدمتِ خلق کا جذبہ، حریت پسندی، حق گوئی، قوم پرستی، دوستی وغیرہ خوبیوں پر مشتمل ایک مثالی پیکر ہے جمیلہ ہاشمی نے اسے ایک آسمانی عورت بنا دیا ہے مگر اس کے اندر زندگی کی حرارت نہیں ملتی۔ پتھر کی ایک دیوی ہے' واقعات آگے بڑھتے ہیں' وقت گزرتا جاتا ہے مگر اس کی جوانی، ذہانت اور حسن پر وقت کی رفتار کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ اسے مردوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

رادھے کرشن شہر کا ایک با اثر اور معزز شخص ہونے کے باعث ہر جلسہ اور پارٹی میں مدعو کیا جاتا ہے۔ دل کھول کر چندہ دیتا ہے اور جلسوں کی صدارت کرتا ہے' کسی پارٹی میں کنول سے ملاقات ہوتی ہے تو اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے لیکن اس میں اس کو منھ کی کھانی پڑتی ہے۔ رنگین مزاجی اور عیاشی کی وجہ سے شہر میں بدنام بھی ہے۔

شوبھا بنرجی ایک فیشن پرست، آزاد خیال، عیش پسند اور آوارہ مزاج لڑکی ہے۔ دل چسپ بات تو یہ ہے کہ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے ہر قدم پر کنول ٹھاکر کی مخالفت کرتی ہے۔ اس کی راہوں میں رکاوٹ ڈالتی ہے لیکن ان تمام کے باوجود وہ ایک حساس اور جذباتی کردار کی حامل ہے لہٰذا وہ بعد میں کنول کی مداح اور پرستار بن جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس ناول کے تمام کردار خیال پیکر معلوم ہوتے ہیں اس لیے ان کے اندر دل کشی اور حسن معدوم ہے۔ کردار نگاری کے لحاظ سے یہ ناول کمزور ہے۔

لہو کے پھول

اس ناول میں کرداروں کا ظہور تشریحی نہج سے ہوا ہے۔حیات اللہ انصاری نے کرداروں کی تخلیق میں فن ناول کے تقاضوں کا خاص خیال رکھا ہے۔راحت رسول ،سلیمہ ،مقصود ،فریدہ ،مولانا پاورملت ،مولوی نظیر ،فرخ ،موہن جی ،سلیندر ،رمضان ،رجبن ،رام لال وغیرہ اس ناول کے کردار ہیں۔ان کرداروں کی سیرتوں کے مطالعے کے بعد ناول لہو کے پھول پر یہ مقولہ صادق آتا ہے۔

بہترین ناول وہی ٹھہرایا جائے گا جس میں قصہ وکردار متوازن ہوں اوراس کی صورت یہ ہے کہ کردار قصہ کے تسلسل اوراس کے ہر واقعے سے اثر پذیر ہوتے ہوئے دکھائے جائیں ''۔(7)

اس ناول کے اہم کرداروں کی حیثیت سے راحت اور فرخ کا کردار سامنے آتا ہے ۔راحت کانگریس کا وفادار رکن ہے اور آزادی کی جدوجہد میں بھر پور حصہ لیتا ہے اوراس کی حصہ داری اس حد تک بڑھی کہ وہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہوجاتا ہے جب تحریک خلافت شروع ہوتی ہے تو اس میں شرکت کرتا ہے اور گاندھی جی کے اصول ونظریات اتفاق کرتے ہوئے کانگریس کی رکنیت اختیار کر لیتا ہے۔تحریک آزادی کو بااثر بنانے کی غرض سے وہ قید و بند کی زندگی بھی گذارتا ہے ۔مجموعی طور پر راحت کے کردار کو متوازن کیا جاسکتا ہے۔

فرخ جو راحت کا بیٹا ہے اس میں اپنے باپ کی شخصیت کا اثر خوب جھلکتا ہے۔راحت اور فرخ کے کرداروں میں چند مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے کے لیے راحت ملازمت سے استعفیٰ دے دیتا ہے تو فرخ تعلیم ترک کر دیتا ہے۔اسی طرح راحت ایک عرصہ سے بمبئی میں رہتا ہے لکھنونہیں جاتا۔فرخ بھی دلی میں رہتا ہے اور لکھنو نہیں جاتا۔فرخ کا کردار سراپا عمل ہے یہ ایک فعال اور متحرک کردار ہے۔اسی لیے اس میں بے حد جذباتیت اور کشش پائی جاتی ہے۔فرخ کو جب بھی جہاں بھی موقع ملتا ہے کچھ کر دکھانے کی کوشش کرتا اس کی بے غرض خدمت ، وفا شعاری ،

اپنے ساتھیوں اور عوام کے ساتھ خلوص، ایثار و قربانی کا جذبہ، بلند ہمتی، عالی ظرفی ہنستے مسکراتے مصیبتوں کو جھیلنے کی صلاحیت، اس کے نا قابل شکست عزائم اور حوصلے سب کچھ مل کر اس کردار کو بے مثال اور بے نظیر بنا دیتے ہیں:

''موہن جی ایک کٹر کانگریسی لیڈر ہیں ان کی سیرت کو پیش کرنے میں حیات اللہ انصاری نے اس تاریخی نکتے کو ملحوظ رکھا ہے جس کے تحت بقول تارا چند کانگریس کی چند عظیم شخصیتیں کانگریس سے اپنی وفاداری رکھتے ہوئے بھی ہندو مہا سبھا کی حمایت کرتی تھیں۔(8)

''لہو کے پھول'' کے نسوانی کرداروں میں سلیمہ اور فریدہ کا کردار سامنے آتا ہے۔ سلیمہ جو راحت کی بیوی ہے' اگر چہ آزادی کی جدو جہد میں براہ راست حصہ نہیں لیتی' لیکن پس منظر میں رہ کر اپنے شوہر اور اپنی اولاد کو آزادی کی تحریک میں تن من دھن کی بازی لگانے پر سہارا دیتی ہے۔ ہمت بندھائی ہے اور ان کے لیے ہر مصیبت برداشت کر لیتی ہے۔

سلیمہ کا کردار، محنت، جفاکش، نا قابل شکست عزائم، مستقل مزاجی اور ایثار و قربانی کا پیکر ہے۔ سلیمہ کے کردار کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہ کردار وطن کی محبت کے ساتھ اپنے سہاگ اور اپنی اولاد کی محبت کا بھی جیتا جاگتا مرقع ہے۔

''لہو کے پھول'' کے دیہی کرداروں میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والا امر اور چیتا کے کردار ہیں۔ شہری زندگی میں موہن جی اور وفا رام کے کردار کانگریس کو ایک قومی سیکولر جماعت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

ناول کے تمام کرداروں کو فرداً فرداً کہاں تک پیش کیا جائے۔ مجموعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس ناول میں کرداروں کا ایک سمندر ہے جو پورے ناول میں بہتا نظر آتا ہے۔ کرداروں کی زیادتی کی وجہ سے سب کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکا ہے۔ ان سب کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ حیات اللہ انصاری نے کرداروں کی پیشکش میں ایسی فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ ہر کردار اپنی اپنی جگہ مکمل اور بھرپور نظر آتا ہے۔ ناول کے کرداروں کے بارے میں حیات اللہ انصاری ناول کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں:

''ناول کے کردار سب فرضی ہیں مگر وہ بنائے گئے ہیں حقائق کے مسالے سے، کوئی کردار ایک درجن حقیقی کرداروں سے مل کر بنا ہے تو کوئی ایک ہزار حقیقی آدمیوں سے، تصوری کہو یا آئیڈیل کہو، یا آدرشی کہو، نہ تو یہاں ایسا کوئی کردار ہے اور نہ سیاسی نظریہ، ہر ایک کی خوبیاں بھی دکھادی گئی ہیں اور کمزوریاں بھی۔ اس معاملے میں نہ کسی قسم کی رورعایت کو دخل دیا گیا ہے اور نہ مروت کو۔(9)

انقلاب

انقلاب کا مرکزی کردار انور ہے وہ مختلف حالات وواقعات سے گزرتا ہوا شوشلزم کی طرف قدم بڑھاتا ہے اور تحریک آزادی میں اشتراکی نقطۂ نظر کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ انور ملک کے مختلف شہروں اور گاؤں میں جاتا ہے۔ وہ ہر طبقہ کی زندگی کا قریب سے مطالعہ کرتا ہے۔ انور گاندھی جی کی تعلیم سے از حد درجہ متاثر ہے۔ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا ہے۔ وہ گاندھی جی کے نظریۂ عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے۔ انور میں حب الوطنی کا جذبہ اس قدر پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنے والد اکبر علی کی قیمتی ریشمی شیروانی کو خود اپنے ہاتھ سے جلاتا ہے۔ انور ہندوستانی سیاست میں اس وقت سے دل چسپی لیتا ہے جب جلیان والا باغ کا حادثہ رونما ہوتا ہے۔ اسے انگریزوں سے نفرت ہو جاتی ہے انور کا دوست بھی باغی ہو جاتا ہے کیوں کہ اس کا باپ بھی اسی حادثہ میں مارا جاتا ہے۔

دوگز زمین

اختر حسین ایک وکیل اور پکے کانگریسی ہیں جنہوں نے آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے وہ اپنے علاقہ میں بہت مقبول ہیں۔ انہیں دونوں فرقوں کے لوگ پسند کرتے ہیں۔ اسی کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہ چاپلوسی، سفارش اور رشوت کو پسند نہیں کرتے محکمۂ اوقاف میں وزیر ہیں۔ انہیں نئے زمانے کی سیاست سے واقفیت نہیں ہے۔ وہ ایک عقل مند انسان ہیں مگر وقت کے ساتھ چلنے کا ہنر ان میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اپنی اولاد کے لیے وہ نہ تو کچھ کر سکے اور نہ ہی وہ اسے اچھی تعلیم دلا سکے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اختر حسین کا کردار ایک اصول پسند

انسان کا ہے جو ہر محاذ پر نا کام ہوگیا ہے ۔اصغر حسین مسلم لیگی نظریات کے حامی تھے اس لیے تقسیم کے بعد وہ پاکستان ہجرت کر جاتے ہیں جو لوگ پاکستان بن جانے کے بعد فوراً ہجرت کر گئے انہیں تقسیم کا سب سے زیادہ فائدہ ہوا۔ جیسے اصغر حسین جب پاکستان گئے تو ان کی ہوس زراس قدر پروان چڑھی۔ جلد ہی ایک حویلی اور پکچر ہال کے مالک بن بیٹھے اور آرام سے زندگی کے مزے لینے لگے ۔انہیں نہ تو اپنی ماں کا خیال ہے اور نہ اپنے خاندان والوں کا' وہ دولت کو رشتوں پر ترجیح دیتے ہیں۔

نسوانی کرداروں میں بی بی صاحبہ کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے، سارے گھر کی ذمہ داری سنبھالنے والی ، خاموش طبعیت کی یہ خاتون ہر کام خوش اسلوبی سے کرتی ہے ۔خلافت تحریک میں آنے والے مہمان ،خصوصی مہمان ، رہنما ہوں یا پھر آزادی کی تحریک کے وقت کانگریسیوں کا آجانا ہے وہ ہر طرح سے اور ہر وقت اپنی ذمہ داری سنبھالتی ہیں۔

اجودھیا پرشاد اختر حسین کے دوست اور صلاح کار ہیں۔ وہ ضلع کانگریس کے نائب صدر بھی ہیں۔ وہ ہمیشہ اختر حسین کے ساتھ رہتے ہیں۔عوام کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ۔کانگریس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں کسی بھی طرح کے لالچ کے بغیر وہ اپنے پاس سے رقم خرچ کرتے ہیں اور کانگریس کے لیے کام کرتے ہین وطن کی محبت ان میں کوٹ کوٹ کر سمائی ہوتی ہے ۔ان میں اقتدار کی ہوس نہیں کے برابر پائی جاتی ہے۔ وہ تو صرف اور صرف قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں' وہ اختر حسین کا ساتھ دینے والے اور ہر برے وقت پر ان کی مدد کرتے ہیں۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

نورالحسنین کا یہ ناول کردار نگاری کے اعتبار سے ایک کامیاب ناول ہے ۔اس لیے کہ اس ناول کا ہر کردار اپنے مقصد میں رواں دواں ہے ۔اس ناول میں سید اختر علی کا کردار ایک شاعر کی حیثیت سے شروع میں متعارف ہوتا ہے لیکن وہ آخر میں لڑتے لڑتے شہید ہو جاتے ہیں ۔ان کی بیٹی نیلوفر جو ایک شوخ چنچل حسین لڑکی ہے' اپنے چچازاد بھائی سلیم سے محبت کرتی ہے اور

اسے بار بار آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کی تلقین کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں تمہارے سینے پر زخموں کے نشان دیکھنا چاہتی ہوں۔

اس ناول میں ایک کردار بردادخان کا بھی ہے جو ایک انگریزی لڑکی جینفر کو انگریزوں کی ایک محاذ پر ہار کے بعد لے کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہ جینفر سے محبت کرتا ہے لیکن جینفر اس سے نفرت کرتی ہے اور اس سے چھٹکارا پانا چاہتی ہے لیکن بہادری سے لڑتے ہوئے کئی مقام پر جینفر کی جان بچاتا ہے اور آخر میں جب انگریز کی ایک فوج بالکل جینفر کے سامنے سے گذرتی ہے اس میں شامل ہونے کے بجائے دلبر دادخان کی بانہوں میں سما جاتی ہے۔ اب یہاں سے گویا اسے بھی محبت ہوگئی ہے۔

زمان ومکان

کسی بھی ناول کا ایک اہم عنصر زمان ومکان ہے یعنی قصے کے لیے اس بات کا تعین بھی ضروری ہے کہ کہاں ہوا اور کب ہوا۔ اس لیے کہ ہر علاقے کی کچھ نہ کچھ مخصوص خصوصیات ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہر زمانہ بھی کچھ مخصوص خصوصیات کا حامل ہوتا ہے۔ جس طرح مقامات کے بدلنے سے افعال وحرکات بدل جاتے ہیں۔ اسی طرح زمانے اور وقت کے تغیر سے بھی ان میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

ابن الوقت:

اس ناول کو نذیر احمد نے ۱۸۸۸ء میں مکمل کیا۔ نذیر احمد کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی بیان کی گئی ہے۔ اس ناول میں اس وقت کی سیاست پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

چوگانِ ہستی

''چوگانِ ہستی'' پریم چند کے تمام ناولوں میں سب سے ضخیم اور ایک رہزار صفحات پر مشتمل

ہے ۔اس ناول میں ہندوستانی زندگی کے مختلف رخ اور سیاسی جدوجہد کے اہم ترین دور کے واقعات کوخوب صورت طریقے سے ناول میں سمیٹ لیا گیا ہے۔

یہ ناول اس دور میں لکھا گیا تھا جب سائمن کمیشن کے بائیکاٹ سے آزادی کی تحریک میں دوبارہ زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی ۔ جو ۱۹۳۰ء میں نمک قانون کی خلاف ورزی اور سول نافرمانی کی شروعات سے اور تیز ہوگئی تھی۔

''چوگانِ ہستی میں اس دور کے ہندوستان کی سیاسی ،سماجی اور مذہبی زندگی کے پیچ وخم کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے،اس ناول میں ہندوستان کے ہر طبقے ، جماعت اور مذہب کے لوگوں کے مسائل کو بیان کرتے ہوئے ہندوستان کی مکمل اور جامع تصویر پیش کی ہے۔

یہاں ایک طرف سامراجی حکومت سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی آڑ لے کرعوام پرظلم وستم کے پہاڑ توڑ رہی ہے اورعوام کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے کی کوشش کررہی ہے تاکہ عوام بے دست وپا ہوکررہ جائیں۔

میدانِ عمل

پریم چند نے یہ ناول ۱۹۳۱ء میں لکھا جو سیاسی اعتبار سے حد درجہ ہیجان اور انتشار کا زمانہ تھا۔ عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریکیں اپنے شباب پر تھیں ،اسی زمانے میں کانگریس نے پہلی بار مکمل آزادی کا مطالبہ کیا تھا۔ اسی دوران کانگریس کی قیادت میں سول نافرمانی کی جو تحریک اٹھی ، اس نے ملک کے باشعور طبقے کو اس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ جب تک ملک کا محنت کش طبقہ آزادی کی اس جدوجہد میں شریک نہیں ہوگا ، آزادی کا نصب العین پورا نہیں ہوسکتا،لہٰذا آزادی حاصل کرنے لیے محنت کش طبقے کا بھرپورتعاون اشد ضروری ہے ، اسی زمانے میں خصوصاً یوپی کے کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی زمین دار اور ساہوکاران پرنت نئے مظالم ڈھاتے تھے۔ کسانوں اور مزدوروں کی اس ناگفتہ بہ حالت سے متاثر ہوکر پریم چند نے ''میدانِ عمل''، قلم بند کیا اور اپنے قلم کے طاقت کے ذریعے کسانوں پر بڑھتے ہوئے مصائب کے اوپر احتجاج کیا اوران کے دکھ درد میں برابر کے شریک رہے۔

لندن کی ایک رات

یہ ناول اس زمانے میں تحریر کیا گیا جب گاندھی جی کے خیالات قبولیتِ عامہ حاصل کررہے تھے۔ گاندھی جی اپنے ملک کے نوجوانوں کو تشدد ترک کر کے عدم تشدد کی راہ اختیار کرنے کی تلقین کررہے تھے۔ بیشتر لوگ گاندھی جی کے خیالات سے متاثر تھے، لیکن چند ایسے لوگ بھی تھے جو گاندھی جی کے ان خیالات سے متفق نہیں تھے۔ خاص طور سے نوجوانوں میں انقلابی رجحان رکھنے والے زیادہ تھے۔ اس کی شاید یہ وجہ بھی رہی ہو کہ اشتراکی افکار لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کررہے تھے۔ محنت کش طبقہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے لگا تھا۔ اپنے بنیادی حقوق اور حصولِ آزادی کے لیے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے، اور پورے ملک میں ظلم واستحصال کے خلاف بلند ہوتی ہوئی آواز کو واضح طور پر محسوس کیا جارہا تھا'' لندن کی ایک رات ''اسی مخصوص سیاسی اور سماجی پسِ منظر میں لکھا گیا ناول ہے۔

''آگ''

عزیز احمد نے اس ناول میں ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۵ء تک کے سبھی واقعات کو مختلف کرداروں کے ذریعے اس طرح پیش کیا ہے کہ'' آگ'' کشمیر کی ایک تہذیبی تاریخ کے پسِ منظر میں لکھا ہوا ایک سنجیدہ اور اہم معاشرتی ناول بن گیا ہے۔ ناول نگار نے کشمیر کے حسن کے ساتھ ساتھ وہاں کی غربت اور کثافت پر بھی روشنی ڈالی ہے ایک طرف حسن اور دولت کی فراوانی ہے تو دوسری طرف بدصورتی، غربت وافلاس کی زیادتی ہے، گویا دولت اور جاگیرداری کی آگ میں کشمیر کا ہر غریب، محنت کش اور مزدور جھلستا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

''آگ کا دریا''

'' آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر تیسرا ناول ہے، جو ۱۹۵۹ء میں منظرعام پر آیا اور پوری ادبی دنیا میں دھوم مچادیا۔ اس ناول پر مختلف جہتوں سے بحثیں بھی ہوئیں۔ آخر میں اس ناول نے ثابت کردیا کہ جادو وہی ہوتا ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اس وقت قرۃ العین کے ناولوں میں سب سے زیادہ مقبولیت اسی ناول کے حصے میں آئی'' آگ کا دریا'' اس واسطے اہمیت کا حامل

ہے کہ اس میں انہوں نے مشترکہ تہذیب ،مشترکہ کلچر،ایک عظیم قوم ،اور ہندوستان کی عظمت کے بارے میں خیالات قلم بند کئے ہیں ۔جس میں ہندوستان کی روح کی آواز سنائی دیتی ہے ۔ ہندو مسلم ،سکھ ،عیسائی ،انگریز ، جرمن ،ایرانی اور ترکی سبھی کرداروں کو بٹور کر اس سرزمین کو ایک مشترکہ خاندان بنا دیا ہے۔

آخر شب کے ہم سفر

''آخر شب کے ہم سفر'' کے قصے کا محور و مرکز ڈھاکہ ہے اور ڈھاکہ کے ہی چار مختلف حویلیوں کے ٹوٹنے وبکھرنے کے حوالے سے برصغیر کی تقسیم در تقسیم کے المیے کی پیش کش ہوتی ہے ۔اس سے قبل قرۃ العین حیدر نے اپنے بیشتر ناولوں میں اتر پردیش کے جاگیردارانہ نظام کو مرکزی حیثیت دی ہے اور اس کے انحطاط وزوال کے تناظر میں تقسیم ہند کے المیے کو پیش کیا ہے ۔صوبہ بنگال کو زیر نظر ناول کے قصے کا محور و مرکز قرار دینے کا سبب یہ ہوسکتا ہے کے قرۃُ العین حیدر اپنے قارئین کو انگریز کی شاطرانہ وعیارانہ چال سے واقف کرانا چاہتی ہیں جس نے ہندوستان کے ایک گروہ کو ملک کے بٹوارے جیسے افسوسناک عمل پر اکسایا۔قرۃ العین حیدر نے یہ ناول ۱۹۷۹ء میں لکھا ہے اور پیش لفظ میں اس بات کی وضاحت کی ہے کہ یہ ناول بنگال کی دہشت پسند اور انقلابی تحریک ۱۹۴۲ء کے آندولن' مطالبۂ پاکستان اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔

آنگن

آنگن میں اتر پردیش کے ایک مسلم جاگیردارانہ خاندان کی کہانی پیش کی گئی ہے ۔یہ کہانی ۱۹۳۲ء سے شروع ہوکر تقسیم کے چند سال بعد کے عرصے پر محیط ہے۔

آنگن میں ایک ہی آنگن کی کہانی ہے بڑے چچا کے لڑکے کانگریسی ہیں ،وہ آئے دن جلسے اور جلوس میں اس قدر سرگرداں رہتے ہیں کہ گھریلوں ذمہ داریوں کا احساس بھی باقی نہیں رہتا۔ردعمل کے طور پر چھمی لیگ میں شامل ہوجاتی ہے اور گھر میں لڑکیوں کو اکٹھا کر کے مسلم لیگ اور پاکستان کی حمایت میں نعرے لگواتی ہے۔

اداس نسلیں

بیسویں صدی کے تہذیبی ثقافتی' سماجی وسیاسی رجحانات کا آئینہ دار عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' اردو ناول نگاری کی تاریخ میں اہم مقام رکھتا ہے ۔ زیرِنظر ناول کے قصے کا محور دہلی اور پنجاب کے مقام اتصال پر واقع روشن پور گاؤں ہے ۔اس گاؤں میں دو مختلف قومیں مسلمان اور سکھ رہتی ہیں ۔''اداس نسلیں'' دو خاندان کی زندگیوں کو اس طرح پیش کرتا ہے جس کے مطالعہ سے ہندوستان کے تاریخی اور سیاسی پسِ منظر میں پنجاب کے جاگیردارانہ نظام میں کسانوں اور مزدوروں کے رہن سہن اور وقت کے ساتھ ان کی بدلتی ہوئی زندگی پر روشنی پڑتی ہے ۔ دونوں خاندان مشرقی پنجاب اور دہلی کے درمیانی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ روشن پور کی تاریخ بہت مختصر ہے، لیکن اپنے اختصار کے باوجود یہ مشترکہ تہذیب کا خوبصورت نمونہ ہے ۔

تلاش بہاراں

تلاش بہاراں ، ۱۹۶۱ء میں تقسیم کے موضوع پر پاکستان میں لکھا گیا اور ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا ۔ اس کا اہم کردار ہندوستان کی ایک ترقی یافتہ خاتون کملی کماری ٹھاکر ہے جو مذہبی ،قومی اور طبقاتی تعصب سے پرے ہے ۔ اس کا مذہب انسانیت ہے ۔ ناول کے ابتدا میں کملی کماری اپنے قارئین سے دو مرتبہ متعارف ہوئی ہے ۔ پہلی مرتبہ ایک وکیل کی حیثیت سے اور دوسری مرتبہ کافی عرصہ کے بعد لڑکیوں کے اسکول کی پرنسپل کی حیثیت سے' اس کردار کے حوالے سے ناول نگار نے ہندوستان کے سماج کی خرابیوں ، روایتی اصولوں اور رسم ورواج کی سختیوں پر روشنی ڈالا ہے ۔ ناول کا ابتدائی حصہ خالص ہندو معاشرے کی خامیوں اور اصلاح نسواں پر مشتمل ہے ۔ تلاش بہاراں ،آزادئ نسواں اور اس کی تعلیم کے متعلق مشرقی اور مغربی روایات اور تہذیب کے فرق کو واضح کرتا ہے ۔

لہو کے پھول

حیات اللہ انصاری کا ناول ''لہو کے پھول'' کافی شہرت حاصل ہوا ۔ یہ ناول ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا ۔ پانچ جلدوں پر مشتمل اس ضخیم ناول میں ہندوستان کی جنگ آزادی اور تقسیم ہند کے

بعد کے پس منظر کو خصوصیت سے ابھارا گیا ہے دراصل یہ ناول ۱۹۱۱ء سے لے کر ہندوستان کے پہلے پنج سالہ منصوبے تک محیط ہے۔

اس ناول کی ایک خاص خصوصیت اس کی مفادیت یعنی ہندوستانیت کی پیش کش ہے ۔ ہندوستانیت کی وسیع وعریض اصطلاح میں ہندوستان کے دیہات اور شہر سب سمائے ہوئے ہیں۔اور ناول نگار نے ہندوستان کے دیہات وشہر کو کما حقہ پیش کرنے کی سعی بلیغ کی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں ہندوستان کے شہر اور دیہات کو پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے پہلے پریم چند نے اپنے ناولوں میں ہندوستان کے دیہات وشہر کو بخوبی پیش کیا ہے، لیکن پریم چند نے دیہی زندگی کو پیش کرنے میں جس فنی بصیرت کا ثبوت فراہم کیا ہے یا ہندوستان کے دیہات کو پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے ویسی فنی بصیرت یا ویسی کامیابی شہری زندگی کی پیش کش میں انکو حاصل نہ ہوسکی ۔لیکن پریم چند کے برعکس حیات اللہ انصاری کی دیہی وشہری زندگی کی پیش کش میں اعتدال وتناسب پایا جاتا ہے۔

انقلاب

خواجہ احمد عباس کا یہ ناول مختلف زبانوں میں چھپنے کے بعد نومبر ۱۹۷۵ء میں ''انقلاب'' کے نام سے اردو دنیا میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول اردو دنیا میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے کیوں کہ اس کی بنیاد خالص سیاست پر رکھی گئی ہے۔ناول انقلاب ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک کے ہندوستان کے سیاسی جدوجہد کی تاریخ ہے جسے خواجہ احمد عباس نے ناول کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ پہلی بار اس وقت شائع ہوا' جب ہندوستان میں جنگ آزادی اپنے عروج پر تھی اور ملک کی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک بڑا انقلاب رونما ہو چکا تھا۔

دوگز زمین

یہ ناول ہندوستان کی خلافت تحریک سے شروع ہوکر مسلم لیگ کے قیام' پاکستان کے مطالبات ،سقوط پاکستان اور ڈھاکہ فسادات کا ذکر کرتا ہوا ۱۹۸۱ء تک کے سیاسی اور سماجی حالات کا خصوصی تجزیہ ہے ۔جس سے کانگریس پارٹی کے ابتدائی اور موجودہ سیاسی مقاصد کی

تبدیلیوں پر روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح کانگریس کا مقصد آزادی سے قبل انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اور عوام کی بہبود وسلامتی تھا۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

زیرنظر ناول ۱۹۵۷ء کی جنگ آزادی پر محیط ہے یہ حقیقت ہے کہ جنگ آزادی میں صرف ان ہی لوگوں کا نام تاریخ میں درج ہے جو کسی نہ کسی طور پہلے سے جانا پہچانا ہوا تھا یا مشہور تھا۔ جیسے بادشاہ وقت، نواب ، راجا، سپہ سالار وغیرہ لیکن ان لوگوں کا نام تاریخ میں کہیں نہیں ملتا جو اپنے حوصلے، طاقت اور جذبۂ حب الوطن سے سرشار ہوکر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ نورالحسنین نے ایسے گم نام جانبازوں کو سامنے رکھ کر یہ ناول لکھا ہے۔ جو یقیناً قابل ستائش ہے۔ کس طرح دلی اور پورے ہندوستان میں جنگ آزادی کے لیے عام آدمی سوچ رہا تھا، کس طرح اپنے مال واسباب لٹا کر اور جان کی بازی لگا کر انگریزوں سے لوہا لے رہا تھا۔ یہ جان کر یقیناً ان لوگوں پر فخر ہوتا ہے اور انہیں سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔

☆☆☆

اسلوب بیان

اسلوب سے مراد بات کہنے کا ڈھنگ اور طرز تحریر ہے جس کے ذریعہ ایک فنکار اپنے احساسات وجذبات اور تجربات کو موثر طریقے سے پیش کرتا ہے ،اسلوب بیان ہمارے خیال کے تابع ہے ۔خیالات کا انحصار مواد،قوتِ مشاہدہ ، وسعتِ مطالعہ اور مہارتِ فن پر ہے ۔ چنانچہ جن ناول نگاروں کے یہاں جملوں کی دلکش مسافت ،کلام میں معانی و بیان کا لحاظ ، خیال میں ندرت اور لفظوں کے استعمال میں دلآویزی ، ان کی تقریر وتحریر کا خاصہ بن جاتی ہے ایسے ناول نگاروں کا ناول اعلیٰ مقام حاصل کرتا ہے ۔اس عنوان کے تحت بھی ہم جدو جہد آزادی کے اردو ناولوں کا جائزہ لیں گے ۔

ابن الوقت:

نذیر احمد کے اسلوب کی ایک خوبی زور بیان ہے ۔ان کا لہجہ پر جوش اور اثر انگیز ہوتا ہے ۔اس ناول کے دوران مطالعہ یہ خوبیاں ہمیں جا بجا نظر آتی ہیں ۔

اس ناول میں مختلف طبقوں کے افراد کے لب ولہجہ اور حرکات وسکنات کی نقالی طنز ومزاح کی ایک عام صورت ہے جس سے ابن الوقت میں جا بجا کام لیا گیا ہے ۔فصل ششم اور ہفتم میں مزاحیہ صورتحال کی مصوری اور ذہنی ناہمواریوں کی تضحیک کے کئی دلچسپ نمونے ملتے ہیں ۔

چوگان ہستی

''چوگان ہستی'' میں سورداس کو غیر شعور طور پر علامت بنا کر پریم چند نے آزادی کی پوری جدو جہد کو پیش کر دیا ہے جو عدم تشدد اور ستیہ گرہ کے ذریعہ اس وقت لڑی جا رہی تھی ۔سورداس کے کردار کی رمزیت اس ناول کی وسعت اور اس کی کامیابی کو ظاہر کرتی ہے کیوں کہ اس کے ذریعہ جدو جہد آزادی کی پوری فضا سامنے آجاتی ہے جو اس وقت موجود تھی ۔اصل میں پریم چند

اس ناول میں فنی کامیابی حاصل کرنے میں اسی لیے کامیاب ہو سکے۔ وہ اس رمزیت سے کام لے کر حقیقی سماجی، معاشی اور تاریخی حقائق کو ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے ارتعاشات میں اس طرح سمو کر پیش کرتے ہیں کہ ہم ایک بالکل نئے تجربہ سے دوچار ہوتے ہیں۔ چوگانِ ہستی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی ٹھوس تاریخی حقائق پر ہے۔ مثلاً ونے کا جسونت نگر میں قیام دیسی ریاستوں کی اس درجہ حقیقی اور سچی تصویر ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ دیسی ریاستوں کے حالات کے بارے میں پریم چند نے ''چوگان ہستی'' میں جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھنے کے بعد ''میری کہانی'' میں پنڈت جی نے ریاست ناتھ کے جو واقعات لکھے ہیں اس کا مطالعہ کرنے کے بعد ان دونوں کی مطابقت حیرت ناک معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح برطانوی تسلط میں میونسپل کی جو حالت پنڈت جی نے بیان کی ہے بالکل وہی حالت پریم چند نے چوگان ہستی میں کونسل کی دکھائی ہے۔

میدان عمل

اس ناول میں جہاں تک اسلوب بیان کا تعلق ہے وہ پریم چند کی دیگر تحقیقات کی طرح ان کے اجتماعی، سیاسی اور جمہوری شعور کا مظہر ہے۔ پریم چند کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ، ان کی صداقت، ان کی تڑپ، ان کی حریت پسندی، انسان دوستی، بابے باکی اور بے خوفی کا زندہ جاوید نقش ہے۔

میدان عمل میں پریم چند نے خارجی دنیا کو تکمیل کے ساتھ ساتھ پیش کرنے کے علاوہ، داخلی دنیا پر بھی اچھی طرح روشنی ڈالی ہے۔ یہ توازن اس ناول کی وقعت کو اور بڑھاتا ہے اور بلا شک وشبہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ''میدان عمل'' پریم چند کا زبردست فنی کارنامہ ہے اور جہاں تک ہندوستانی زندگی کے سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کا سوال ہے، یہ پریم چند کا شاہکار ہے کیوں کہ اس سے پہلے ہندوستان کی جدوجہد آزادی کو اس کے مختلف پہلوؤں سمیت اس درجہ فنکارانہ تکمیل سے پریم چند نے کبھی پیش نہیں کیا۔

لندن کی ایک رات

جہاں تک اس ناول میں اسلوب بیان کا تعلق ہے تو اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ اس ناول کے ذریعہ سجاد ظہیر نے پہلی مرتبہ ناول نگاری کی جدید تکنیک شعور کے رو سے اردو ناول کو متعارف کرادیا اور مروجہ روایتی تکنیک سے ہٹ کر شعور کے رو کی تکنیک کو برتا، اس ناول میں سجاد ظہیر نے الفاظ کے تخلیقی استعمال کی جو سطح دریافت کی ہے وہ پریم چند کے ناولوں میں بھی نہیں ملتی۔ نیز اس ناول میں ایمائی اور بیانیہ اسلوب کے دوسرے نمونے بھی ملتے ہیں۔

آگ

عزیز احمد کا یہ ناول دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ شنیدہ ہے اور دوسرا حصہ دیدہ ہے ، دوسرا حصہ زیادہ تر ایک سفرنامہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ شروع بھی ہوتا اس طرح سے۔

''میں واحد متکلم بڑے شش وپنج میں ہوں، کسی ایک قوم کا کارنامہ لکھنا، جس سے لکھنے والے کا محض خارجی طور پر واقف ہونا بہت مشکل ہے اور سنیدہ سے دیدہ کی طرف آتے ہوئے بھی واحد متکلم محض ناظر رہ جاتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ اندر کی زندگی مجھ واحد متکلم نے کم دیکھی ہے اور اس لیے میں واحد متکلم ناظر ہوں، تماشائی ہوں، اور ۱۹۴۲ء پر اپریل کے پہلے ہفتے میں ناظر میں تماشائی کشمیر آتا ہے۔(10)

اس ناول میں مختلف باتوں اور واقعات کی ڈرامائی پیشکش نہیں ملتی بلکہ یہ واقعات اور باتیں جو تاثر مرتسم کرتے ہیں اور جو احساس بیدار کرتے ہیں انہیں کو پیش کیا گیا ہے۔

عزیز احمد نے اس ناول میں روایتی تکنیک سے انحراف کرتے ہوئے نیا انداز اختیار کیا ہے جس میں روایتی انداز کا کوئی ہیرو ہیروئن نہیں بلکہ مختلف کرداروں اور واقعات وحادثات کے ذریعہ کشمیری زندگی کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ لیکن یہ مسائل صرف کشمیر ہی کے نہیں بلکہ پورے ملک عوام کی زندگی کے مسائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آگ کا دریا

قرۃ العین حیدر کا ناول ''آگ کا دریا'' اردو ناول کی تاریخ میں گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے خاص مقام رکھتا ہے۔ اس ناول میں مصنفہ نے جدید تکنیک استعمال کر کے اردو ناول کو نئے

تجربے سے آشنا کیا ہے اسی ناول میں مصنفہ نے شعور کے رو کی تکنیک کو سب سے زیادہ کامیاب انداز میں پیش کرنے میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔اس ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ اپنے سینے کے اندر سربستہ رازوں کو بتدریج یکے بعد دیگرے کھولتی جارہی ہے ۔کیوں کہ یہ ناول ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جس کی ابتداء بدھ مذہب کے عروج کے زمانے سے ہوتی ہے اور اس میں بدھ مت کا اساس فلسفہ یعنی زندگی کو دکھوں کی آماجگاہ بنا کر اس سے نجات کے لیے عمل کا راستہ بنایا گیا ہے اور ہر شنکر اسی بودھ فلسفے کا نمائندہ کردار ہے۔

اس ناول میں قرۃ العین حیدر نے جہاں ایک طرف شعور کی رو کی تکنیک کو بے حد فنکاری برتی ہے تو دوسری طرف چھوٹے بڑے جملوں کو اشاروں، کتابوں میں ملفوف کر کے، کرداروں کے مکالمے کے ذریعہ مخصوص خیالات کے اظہار اور ذاتی تبصروں کے بیان میں روانی عطا کر کے اپنے منصب سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔اس تعلق سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

> ''آگ کا دریا'' میں زبان و بیان کی موزونیت اور بلیغ رمزیت سے معمور سادہ شستہ اور رواں اسلوب سے مزین سینکڑوں مناظر ملتے ہیں۔جن میں انہوں نے الفاظ و بیان کے تجربے بھی کئے ہیں۔انگریزی، ہندی اور کہیں کہیں اودھی کے الفاظ، اظہارات اور لب ولہجہ کو جس تخلیق حسن سے انہوں نے اپنی نثر میں سمویا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔(11)

آخر شب کے ہم سفر

اس ناول کو اگر اسلوب بیان کی نظر سے دیکھا جائے تو ایک طرح سے یہ ناول پورے کا پورا ایک بیانیہ کرداری ناول ہے، جیسے کردار ہی لے چلتے ہیں اور واقعات کو توڑتے مروڑتے ہیں۔

آنگن

خدیجہ مستور نے اس ناول میں الفاظ اور زبان، سماجی پس منظر کے ساتھ استعمال کئے ہیں ۔الفاظ خود اپنی داستان سناتے ہیں، خصوصاً وہ طنزیہ جملے جو نجمہ پھوپھی، عالیہ کی ماں اور کہیں

کہیں چھمی اور جمیل کی زبان سے ادا ہوتے ہیں ۔ان سے یہ ناول قاری کو بدلتی ہوئی تاریخ وتہذیب، تقسیم کی افراتفری، خاندانوں کا بکھراؤ اوران کی نفسیات کی بڑی اچھی تصویریں پیش کرتا ہے جس سے ناول کا مجموعی تاثر عہد آفریں بن جاتا ہے۔

اداس نسلیں

ناول کے اسلوب پر قرۃ العین حیدر کا اثر بہت واضح ہے لیکن عبداللہ حسین ان کے اسلوب کی کامیاب تقلید کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں، ناول کے آغاز کو بھی انھوں نے قرۃ العین حیدر کے اسٹائل سے قریب تر کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ناول کے ابتداء میں بائبل کا ایک انگریزی اقتباس درج ہے۔ناول نگار نے اس کا اردو میں ترجمہ کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں فرمائی ۔ناول کے اسلوب پر انگریزی ادب کا گہرا اثر ہے، جملوں اور فقروں کی ترتیب بھی انگریزی طرز عبارت کی تقلید معلوم ہوتی ہے۔تاہم اس ناول کی اہمیت اور انفرادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

تلاش بہاراں

''تلاش بہاراں'' کی زبان سلیس، رواں اور سادہ ہے۔ناول چونکہ واحد متکلم کے انداز میں لکھا گیا ہے اس لیے مکالموں کی گنجائش کم ہے، راوی کے بیانات نے کرداروں کے انداز گفتگو کو مصنوعی بنادیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناول کے کردار خواہ مخواہ بولتے چلے جانے کے خوگر ہیں ۔نظریات اور تصورات کے اعتبار سے ان کی گفتگو میں گہرائی اور فکری بصیرت ہونی تو ہے مگر اس میں جذبہ واحساس کی آنچ اور صداقت مفقود ہے۔

لہو کے پھول

''لہو کے پھول'' کی کامیابی میں اس کے اسلوب نے بھی خاص مدد پہنچائی ہے۔حیات اللہ انصاری نے اس ناول میں پریم چند کے سادہ اسلوب کی پیروی کی گئی ہے اور لہو کے پھول کو ایک اچھے زیور سے آراستہ و پیراستہ کیا ہے اس ناول کے اسلوب کے تعلق سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''حیات اللہ انصاری نے پریم چند کے سادہ بیانیہ اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے ناول کے اسلوب کو فن کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ بنایاہے ۔ان کا اسلوب بیان ،روانی،شفافیتاور بے تکلفی کا مظہر ہے۔اس اسلوب میں نہ افراط وتفریط ہےاور نہ جذباتی جوش وخروش۔ایک اچھوتی دلکش سبک روئی،دھیما پن اور نرم روی ہے جونفسیاتی اور جذباتی پیچیدگیوں کی گرہیں دھیرے دھیرے کھول کر پڑھنے والے کے ذہن پر نقش ثبت کرتی ہے۔(12)

انقلاب

اس ناول کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے''پہلا حصہ'' بادل گھر آتے ہیں ۔ دوسرا حصہ ''طوفان کی آمد آمد'' تیسرا حصہ''بادل گرج'' اور چوتھا حصہ''طوفان اور طوفان کے بعد'' کے نام سے موسوم ہے۔اس ناول میں بعض مقامات پر ایسے فقروں اور خیالات کا ذکر ناول نگار نے کیا ہے جو ایک کامیاب ناول میں ہونے چاہئیں ۔انور کسی بات کو نظر انداز نہیں کرتا جو ذہن کو اس کے متعلق سونچے پر مجبور کرتی ہے۔مثلا''ہندو پانی اور مسلمان پانی'' ہندو کا خون اور مسلمان کا خون ،مزدوروں اور کسانوں کی زندگی ،سرکاری حکاموں اور ملازموں ملک کے ساتھ غداری اور انگریزوں کی چاپلوسی ہندوستان کے سورماؤں کی قربانی ، ان کی جدوجہد اور قید کی مشقت ، رئیسوں کی حویلی اور مزدوروں کی جھونپڑی وغیرہ پر انور خود کلامی کے ذریعے جو روشنی ڈالتا ہے۔ وہ ناول کا اہم حصہ ہے۔

دوگز زمین

عبدالصمد نے اپنے اس شاہکار ناول میں ایسی زبان کا استعمال کیا ہے جو تصنع وتکلف سے پاک صاف ہے۔ان کا اسلوب بیان سلیس ہے'انہوں نے علامتوں کا استعمال کیا ہے۔

اس ناول کے تعلق سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی لکھتے ہیں:

''عبدالصمد نے اپنے اسلوب کو سجانے سنوارنے کی شعوری کوشش نہیں کرتے ۔اپنی عبارتیں روانی سے لکھتے ہیں۔صنائع وبدائع یا پرتکلف اسلوب کے دیگر عناصر خود بخود شامل ہوجاتے ہیں اس لیے ان کی نثر میں ہمیں تشبیہات واستعارات بھی ملتے ہیں اور ضرب الامثال اور محاورے بھی۔کہیں علامتوں سے کام لیا گیا ہے اور کہیں اور اشاروں اور کنایوں سے بھی۔مگر

کہیں بھی یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ ان عناصر کو زبردستی اسلوب کا حصہ بنایا گیا ہے۔ دراصل عبدالصمد کے انداز اظہار میں وہ شگفتگی اور شیفتگی ہے جو دلنشین اور دلکش نثر کے عناصر سے خالی نہیں رہ سکتی۔''(13)

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ بیک وقت کئی کہانیاں ایک ساتھ چلتی ہیں لیکن ناول اختتام تک پہنچتے پہنچتے ساری کہانی، سارے واقعات جنگ آزادی کی جدوجہد میں بدل جاتے ہیں اور کوئی کردار آزادی کی لڑائی میں مارتے جاتے ہیں۔

☆☆☆

مقصدحیات

اللہ رب العزت نے اس کائنات میں کوئی چیز بے مقصد نہیں بنائی ہے۔

ہر ایک چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔اسی طرح ایک ادیب وفنکار جب کوئی شہ پارہ نہیں کرتا ہے۔اس میں بھی کوئی نہ کوئی مقصد پنہا رہتا ہے خواہ وہ مقصد کیسا ہی ہو۔تفریحی ،تفننی ،اقتصادی ،اخلاقی ،مذہبی یا سیاسی وغیرہ جس شخص کا نظریہ جتنا اعلیٰ ہوگا اتنا ہی اس کا مقصد وقیع ہوگا۔اسی طرح ایک ناول نگار بھی جو کچھ لکھتا ہے وہ کسی خاص مقصد،کسی خاص نظریہ کی تعلیم وتبلیغ کے لیے ہی ہوتا ہے۔لیکن ایک ادیب اور معمولی لکھنے والوں میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک معمولی آدمی اپنے مقصد کو واضح کردیتا ہے اور اس کی تصنیف محض تبلیغ اور پروپیگنڈہ ہوکر رہ جاتی ہے اس کے برعکس ادیب جو اثر پیدا کرنا چاہتا ہے اسے واقعات اور بیان کی ترتیب سے حاصل کرلیتا ہے وہ پروپیگنڈہ اور تبلیغ نہیں کرتا ہے۔ہاں ایک ناول نگار کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جو بھی بیان کررہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہو۔وہ حقیقت کے ظاہر وباطن دونوں پر نظر رکھتا ہو۔اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا فلسفۂ حیات پیش نہ کرے جو حقیقت سے بعید ہو۔

ابن الوقت:

ابن الوقت نذیر احمد کا بہت دلچسپ ناول ہے اس ناول میں بتایا گیا ہے کہ دوسروں کی نقل کرنے والا بالآخر پچھتاتا ہے،ابن الوقت نے انگریزوں کی نقالی کی اور حجۃ الاسلام کے سمجھانے کے باوجود بھی باز نہ آیا۔انجام کار اپنے طرز زندگی پر اسے پچھتانا پڑا۔

چوگان ہستی

پریم چند کے دیگر ناولوں کی طرح اس ناول میں بھی وطن پرستی کا جذبہ موجود ہے اس ناول میں جدوجہد آزادی کی پوری فضا کو حد درجہ کامیابی کے ساتھ سمیٹ لینے کی وجہ سے پریم چند کا فن

اپنے ارتقاء، اور پختگی کی معراج پر نظر آتا ہے۔ پریم چند کی یہ آرزو تھی کہ حصولِ آزادی کو مقصد بنا کر ناولیں لکھیں وہ آرزو ''چوگان ہستی'' میں بڑی حد تک مکمل ہوگئی ہے۔ انہوں نے ایک خط میں لکھا تھا:

''ہاں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ دو چار بلند پایہ تصنیفیں چھوڑ جاؤں لیکن ان کا مقصد بھی حصول آزادی ہو'' (14)

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پریم چند اپنی حقیقی زندگی میں سچے محبّ وطن تھے اور تخلیقی زندگی میں تو جگہ جگہ حصول آزادی کے جذبات بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پانڈے پور کی تحریک میں جب 'ونے'' کی موت واقع ہوجاتی ہے تو اس کی ماں نالہ وبکا کرنے کے بجائے کہتی ہے:

''جاؤ اور ونے کی طرح قربان ہونا سیکھو، ملک اور قوم کی آنکھیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں (15)

میدان عمل

میدان عمل کی تصنیف کا اصل مقصد مزدوروں اور کسانوں کو ان کے جائز حقوق کا احساس دلانا ہے اور ان کے اوپر جو جبر وتشدد کے پہاڑ توڑے جارہے تھے' اس کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔

تاکہ وہ متحد ہوکر اپنی بہتر زندگی کی بقا کے لیے جدوجہد کریں اسی لیے جب ہم میدان عمل کے کرداروں کا باریک بینی سے تجزیہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس ناول کے سبھی کردار عمل اور جدوجہد کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔

لندن کی ایک رات

لندان کی ایک رات کا بغور مطالعہ ومحاکمہ کرنے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ اس ناول کے ذریعہ سجاد ظہیر کا مقصد کھل کر اشتراکی نظام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینا ہے، ناول میں ایک جگہ ہندوستان میں اشتراکیت کے اثرات کا ذکر انتہائی جرأت مندی کے ساتھ کیا گیا

ہے۔

''وکیل، مہاجن، سوداگر یا سرمایہ دار سب کی یہی تمنا رہتی ہے کہ کس طرح اس کے ساتھی مٹ جائیں۔ تباہ ہو جائیں اور ان کی ساری دولت سمٹ کر اس کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور دوسری طرف ان تمام لوگوں کو اپنے سے نیچے طبقے والوں سے ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں مزدوران کے لیے مزدوری کرنا نہ چھوڑ دیں کہیں کسان یہ نہ کہنے لگیں کہ زمین اس کی ہے جو اس کو جوتتا ہے کہیں کایا پلٹ نہ ہو جائے۔ یہ لوگ بار بار اپنے دل کو تسکین دیتے ہیں کہ ہندوستان روس نہیں ہے لیکن اشتراکیت کی بڑھتی ہوئی طاقت انہیں اب تو ایک دم چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔(16)

آگ

اس ناول میں عزیز احمد نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر کشمیر کی تہذیب وثقافت اور کشمیری مسلمانوں کی معاشرت ایک ہی خاندان کی تین نسلوں کے ذریعے پیش کرنے کی کوشش کی ہے مختصر یہ کہ کشمیر کے حسین مناظر، کشمیری معاشرت، سیاسی اور سماجی مسائل سے دوچار عوام کی بے بسی اور محنت کشوں کی غربت وافلاس کی عکاسی کرنے والا ''آگ'' کشمیر کے مسائل پر لکھے جانے والے ناولوں میں اہم مقام کا حامل ہے جس میں عزیز احمد نے تاریخ معاشرت، سیاست اور ادب کو ایک جان بنا دیا ہے۔ ناول کی خوبیوں کی تعریف کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف سرمست لکھتے ہیں:

''یہاں کشمیر جنت نشان ہی نہیں جہنم زار بھی نظر آتا ہے۔ یہاں قدرت کا رحم وکرم ہی نہیں بلکہ اس کا قہر وغضب بھی ہے۔ کشمیر کی ایسی سچی تصویر جو کسی ناول نگار کے یہاں نظر نہیں آتی ،کشمیر کا افلاس، غربت، گندگیاں، اس کی نجاستیں، اس کی بے کسی، مجبور عوام بھوک افلاس کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہوئی اخلاقی حالت غرض کشمیر کے سبھی کربناک پہلو سامنے آگئے ہیں''(17)

آگ کا دریا

عالمِ تحریر میں جو کچھ وجود میں آتا ہے اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بیکار اور بے فائدہ نہیں بنایا تو انسانوں میں تخلیق کام کرنے والے کیوں بے مقصد

تصنیف پیش کریں گے۔آگ کا دریا، یا قرۃ العین حیدر کا سب سے زیادہ موضوع بحث ناول ہے ۔اس ناول کی تخلیق کا کیا سبب ہے،ہم خود مصنفہ کی زبانی سنتے ہیں وہ لکھتی ہیں:

''ملک کیوں تقسیم ہوا کیا تقسیم تاریخی حیثیت سے ناگزیر تھی۔اس سوال نے مجھے فلسفۂ وتاریخ کی طرف کھینچا۔اس کا جواب دینے کی کوشش میں ایک ناول''آگ کا دریا'' لکھا اور دریا کو زمانے کا Symbol بنا کر تین ہزار سال کی پھیلی اور الجھی ہوئی ہندوستانی تاریخ میں سے ہندوستانی شخصیت کی عظمت کو گرفت میں لانے کی کوشش کی''(18)

مندرجہ بالا اقتباس سے جہاں آگ کا دریا، کی تخلیق کے محرک کا پتہ چلتا ہے' وہیں پر قرۃ العین حیدر کا نقطۂ نظر بھی واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔کسی بھی تخلیق میں تین ہزار سالہ تاریخ کو اس طرح ہنرمندی سے ناول کے سانچے میں ڈھالنا سب کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس کام کو قرۃ العین حیدر نے اپنے ناول''آگ کے دریا'' میں دریا کو وقت کی علامت بنا کر بڑی ہنرمندی سے انجام دیا ہے۔

آخر شب کے ہم سفر

''آخر شب کے ہم سفر'' میں مصنفہ نے بڑے ہی سلیقہ اور ہنرمندی سے بنگالی کلچر اور بنگلہ زبان سے بنگالی مسلمانوں کی انسیت اور طرفداری پر قلم فرسائی کی ہے جو برصغیر کی تقسیم ثانی کا ایک اہم سبب بنی۔اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آخر''شب کے ہم سفر'' اردو کا واحد ناول ہے جس میں کلچر اور زبان کے فرق و امتیاز کی بنیاد پر ملک کے بٹوارے کی ٹریجڈی پیش کی گئی ہے اور مصنفہ نے اس امر کی بھی وضاحت کی ہے کہ جنگ آزادی سے ہی بنگالی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بنگالی کلچر اور بنگلہ زبان و ادب کی دلدادہ تھی۔

آنگن

آنگن ایک سماجی ناول ہے لیکن اس میں سیاسی کشمکش بھی ہے، کانگریس اور مسلم لیگ کے نظریے کی وضاحت بھی ہے۔دراصل خدیجہ مستور نے اس ناول میں سماجی حقائق پر توجہ دی ہے اور جاگیردارانہ سماج کے زوال اور سماج میں نیپ رہی برائیوں کو کمال خوبی سے پیش کیا ہے

۔آنگن کے کردار اس سماج اور معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں ۔تہمینہ کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے جس کے سبب وہ خودکشی کر لیتی ہے ۔کسم پندرہ سال کی عمر میں بیوہ ہو جاتی ہے اور سماجی بندش کی وجہ سے دوبارہ شادی نہیں کر سکتی اس لیے خودکشی کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے ۔خدیجہ مستور نے مختلف کرداروں کے ذریعہ تقسیم وطن کے زیر اثر ہونے والے تمام اہم مسائل کو اپنے ناول میں سمیٹ لیا ہے ۔موضوع اور مواد میں اتنی ہم آہنگی ہے کہ یہ ناول فنی تکمیل کا احساس دلاتا ہے ۔آنگن کا شمار اردو کے چند اہم ناول میں ہوتا ہے ۔

اداس نسلیں

''اداس نسلیں'' نہ صرف دو خاندانوں کی زندگی کا جائزہ ہے بلکہ یہ پنجاب کے اس دور کے کسانوں ،مزدوروں اور جاگیرداروں کے ساتھ ہندوستان کے مختلف طبقات کا نسل در نسل جائزہ بھی ہے ۔

پنجاب کے کسانوں اور کاشتکاروں کی زندگی یقیناً اداس نسلیں ، میں بڑے تجزیاتی اور تجرباتی اور فنکارانہ ڈھنگ سے پیش کی گئی ہے ۔معلوم نہیں ۔یہ تجربے عبداللہ حسین کے کتنے شخصی ہیں اور کتنے محض سن سنا کی باتوں سے انہوں نے لے کر یہ کہانی تیار کی ہے ،تاہم ''اداس نسلیں'' کا ہی حصہ ،اس ناول کا یادگار حصہ ہے جس کی وجہ سے یہ ناول قدر اول کی چیز بنتا ہے اور شاید اسی زندگی کی پیشکشی کی وجہ سے یہ ناول ،اردو ناولوں کی تاریخ میں باقی رہے گا ۔

تلاش بہاراں

جمیلہ ہاشمی کا ناول ''تلاش بہاراں'' مقبول ترین ناول ہے ۔اس ضخیم ناول کے تمام کردار ہندو ہیں اور یہ مصنفہ کے وسیع تجربات اور کشادہ ذہن کا ثبوت ہے کہ انہوں نے ان کرداروں کے وسیلے سے غیر منقسم ہندوستان کے دانشور طبقے کی ذہنی عکاسی کی ہے ۔آزادئ ملک اور تقسیم ہند کے زیر اثر فرقہ وارانہ فسادات نے ہندوستان کی مخلوط فضا کو یکسر بدل دیا ہے ۔ہر جگہ قتل وخون کا سماں نظر آتا ہے لیکن اس کسم پرسی کے ماحول میں چند ایسی روشن خیال ہستیاں بھی ہیں جو امن وآشتی اور قومی خیر سگالی سے باز نہیں آئیں ۔یہ ہستیاں بعض دفعہ اپنی جان جوکھم میں ڈال کر

اپنے مقصد کو قائم رکھنا چاہتی ہیں۔

انہیں روشن خیال لوگوں کی نمائندہ کنول کماری ٹھاکر بھی ہے جو ذات پات اور مذاہب کی تفریق سے بہت بلند ہے۔ناول کے آخر میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہونے پر وہ اپنے کالج کی مسلم طالبات کی عزت وحرمت بچاتے ہوئے جان دے دیتی ہے۔اس طرح شوبھا بنرجی دو قومی نظریے اور مذاہب کی بنیاد پر برتے جانے والے تعصب کو ناپسند کرتی ہے اور اس غیر انسانی وغیر فطری تقسیم کو ذہنی طور پر قبول نہیں کرتی۔

لہو کے پھول

اس حقیقت سے انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ حیات اللہ انصاری نے اس ناول کو اپنے ہی نقطۂ نظر کو ملحوظ خاطر رکھا ہے۔حیات اللہ انصاری کانگریس کے ایک سرگرم رکن تھے اسی لیے ناول میں کانگریسی نظریات کی تبلیغ اور کانگریسی رجحانات کا غلبہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ، کمیونسٹ پارٹی وغیرہ سے متعصّبانہ رویہ صاف نظر آتا ہے۔حیات اللہ انصاری کی ایک باتِ قابل ستائش ہے وہ یہ کہ کانگریسی نظریے سے وابستہ ہونے کے باوجود کانگریس کی خامیوں کو نظر انداز نہیں کیا ہے اور جہاں ضرورت پیش آتی ہے کانگریس پر تنقید اور طنز بھی کر جاتے ہیں کانگریس اور گاندھی جی کے سلسلہ میں ضرورت کے پیش نظر طنز بھی کر جاتے ہیں۔کانگریس اور گاندھی جی کے سلسلہ میں ضرورت کے پیش نظر کیا طنز کرتے ہیں ناول کا یہ اقتباس پڑھیے:

> ''دوسری غلطی گاندھی جی نے کی کہ وہ ہندوستانی کو مانتے مانتے، ہندی ہندوستانی کو ماننے لگے اور سخت ہندو رجعت پسندوں سے انہوں نے اشتراک عمل کرلیا۔اب بتایئے کہ مسلمان کس طرح گاندھی جی یا کانگریس کی طرف آئیں''۔(19)

انقلاب

اس ناول میں سیاسی نظریوں، گروہوں اور تحریکوں کا جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۳ء تک شروع ہوئی تھیں انہیں کا تفصیلی ذکر ملتا ہے جس سے مارکس کی اشتراکیت، گاندھی جی کی اہنسا، کانگریس پارٹی، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، سبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ، خان عبدالغفار خان، راج گوپال

آچاریہ، راج گرو، سکھ دیو، کسانوں اور مزدوروں وغیرہ کے سیاسی نظریوں اور تحریکوں پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف ہندو مسلم فساد اور اتحاد کا بھی ناول نگار نے کہیں کہیں ذکر کیا ہے، سماج میں طوائفوں، رئیسوں اور مغلوں کی گھریلو زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوگز زمین

دوگز زمین عبدالصمد کا پہلا ناول ہے جس میں تقسیم ہند کو موضوع بنایا گیا ہے تحریک آزادی ، سیاسی جماعتوں کی کشمکش ،آزادی کے بعد فرقہ وارانہ فسادات جیسے موضوعات کو بہت موثر ڈھنگ سے اٹھایا گیا ہے۔

مسلمانوں کی حکومت کے تئیں وفاداری کے مسئلے کے تجزیے میں عبد الصمد نے حقیقت نگاری کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ حکومت کے سیکولر ہونے کی دعویداری کا پردہ فاش ہوتا نظر آتا ہے ۔حکومت ایک طرف تو سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے لیکن دوسری طرف مسلمانوں کی وطن دوستی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے اور مسلمانوں کے اندر حکومت کے لیے اور اپنے وطن کے لیے اس قدر خلوص پایا جاتا ہے کہ اختر حسین بنگلہ دیش سے آئے ہوئے اپنے بیٹے حامد کو پناہ دے سکتے تھے لیکن ان کی وطن دوستی ان کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی ، لہٰذا انہوں نے اپنے بیٹے کو پناہ دینے سے انکار کر دیا۔

ایوانوں کے خوابیدہ چراغ

نورالحسنین کا یہ ناول اس لیے اہم ہو جاتا ہے کہ اس میں گم نام انقلابیوں کے ساتھ ساتھ ان تمام کرداروں پر بھی روشنی پڑتی ہے جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کسی نہ کسی طور پر شامل تھے اور اپنی جان کی بازی لگا کر یا اپنی حکمت عملی سے ملک کو غلامی سے نجات دلانا چاہ رہے تھے لیکن ہم یہ جنگ ہار گئے اور کئی برسوں تک ہمیں غلامی جھیلنی پڑی۔ یقیناً یہ ناول ایک اہم ناول ہے کیوں کہ پہلی بار کسی ناول نگار نے ان گمنام انقلابیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک تاریخ کا حصہ نہیں بن پائے تھے۔

☆☆☆

حوالہ جات باب پنجم

(1) نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے، ص ۲۰

(2) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۱۵

(3) نورالحسن ہاشمی، ناول کیا ہے، ص ۲۳۔۲۲

(4) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات، ص ۶۷

(5) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص ۲۰۱

(6) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص ۱۱۱

(7) ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، ناول کیا ہے، ص ۳۰

(8) ڈاکٹر تاراچند، تاریخ تحریک آزادی ہند، ص ۵

(9) پیش لفظ، لہو کے پھول حیات اللہ انصاری، ص

(10) یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول۔ ص ۳۶۴

(11) ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب ص ۱۹۶

(12) ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب ص ۲۳۰

(13) ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی، اردو ناول کے اسالیب ص ۲۳۰

(14) پریم چند، زمانہ کانپور، ص ۲۷

(15) منشی پریم چند، چوگان ہستی، ص ۴۳۴

(16) سجاد ظہیر، لندن کی ایک رات ص ۲۳

(17) ڈاکٹر یوسف سرمست، بیسویں صدی میں اردو ناول، ص

(18) قرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، ص

(19) پیش لفظ لہو کے پھول، حیات اللہ انصاری، ص ۱۶۰۰

☆☆☆

حاصل مطالعہ

ہندوستان کی مقدس سرزمین انگریزوں کے ناپاک قدم سے ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو پاک ہوئی اور ہندوستان کا ہر فرد خوشی ومسرت سے جھوم اٹھا اس لیے کہ مغلیہ سلطنت کا آفتاب غروب ہو جانے پر انگریزی سلطنت کا دور شروع ہوا تھا اور ہمارا ملک ہندوستان ایک طویل عرصے تک انگریزوں کی غلامی میں جکڑا ہوا تھا۔ ہندوستان میں غلامی کی بنیاد ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے بعد ہی پڑ گئی تھی اور اسی وقت سے جدوجہد آزادی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ چونکہ طاقت کے نشہ میں چور انگریز حکومت نے ہمیشہ ہندوستانیوں کو حقارت کی نظر سے دیکھا اور ہندوستانیوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ ظلم کی انتہا مظلوموں کو حوصلہ عطا کرتی ہے۔ نتیجتاً ظالم کو مظلوم ہونا پڑتا ہے اور ظلم کی انتہا نے ہندوستانی قوم کو بیدار کر دیا تھا۔

ہندوستانی عوام کے دلوں میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کا جذبہ دھیرے دھیرے طوفان کی شکل اختیار کرتا گیا۔ لاکھوں ہندوستانیوں میں موجزن یہ طوفان ۱۸۵۷ء میں ایک انقلاب کی شکل میں رونما ہوا، جس سے ملک کے بیشتر حصوں میں حکومت برطانیہ کے تسلط کے خلاف جنگ کا اعلان ہوا، جس کو ہم انگریزی اقتدار کے خلاف پہلی اور باقاعدہ جنگ آزادی کا نام دیتے ہیں اس پہلی جنگ آزادی کو انگریزوں نے زبردست وسائل اور وحشیانہ مظالم سے ناکام کر دیا تھا جس کی عکاسی ''ابن الوقت'' ناول میں ہوئی ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ناکام ضرور ہوگئی تھی، لیکن انگریز ہندوستانی عوام کے جوش وجذبے کو کچلنے میں ناکام رہے۔ ہندوستانیوں کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ انگریز ناقابل شکست نہیں ہیں۔ اگر ان سے برابری کی سطح پر جنگ کی جائے تو اس پر فتح پائی جاسکتی ہے۔ ۱۸۸۵ء میں سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کا وجود عمل میں آیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے آگے چل کر وطن کی آزادی میں زبردست حصہ لیا اور ملک میں قوم پرستانہ خیالات

وتصورات کوفروغ دیا۔اسی جماعت نے تقسیم بنگال کی مخالفت کی اور برطانوی امتیاز کا بائیکاٹ کیا نیز سودیسی تحریک شروع کی ۔اس تحریک نے بہت جلد قومی تحریک کی شکل اختیار کر لی ۔اس کے بعد یکے بعد دیگرے بہت سی تحریکات ؛ مثلا خلافت تحریک ، ریشمی رومال تحریک ،عدم تعاون تحریک ، ہندوستان چھوڑ وجیسی متعدد تحریکات شروع ہوئیں ۔ان تحریکوں نے ہندوستانیوں کے دلوں میں برطانیہ دشمنی کی لہر کو بڑھانے اور انہیں متحد و متفق ہوکر عزم وارادے کے ساتھ جدو جہد آزادی میں شریک ہونے کا حوصلہ بخشا ۔'' خلافت تحریک'' کے سلسلے میں ''عدم تعاون تحریک'' کا آغاز ہوا تو اس میں ہندوستانیوں نے بے مثال جوش وخروش کا مظاہرہ کیا اور ایک طرح سے پورے ملک میں ہلچل مچادی اور وطن کی آزادی کا کارواں آگے ہی بڑھتا رہا اور ایک طویل جدجہد کے بعد ۱۵/اگست ۱۹۴۷کو ہندوستان سے انگریزی حکومت کا خاتمہ ہوا ۔ اس مقالے میں انگریزوں کی آمد سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات کو جدو جہد آزادی کے خصوصی حوالے سے پیش کیا گیا ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کن مراحل سے گزرنے کے بعد ملک کو آزادی جیسا حسین تحفہ ملا۔

اردو ادب کی ایک نہایت اہم صنف ناول ہے،جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ناول ایک ایسا آئینہ خانہ ہے جس میں انفرادی واجتماعی زندگی کے اندرونی وبیرونی سارے روپ دیکھے جاسکتے ہیں۔

چنانچہ جب ہم نے جدو جہد آزادی کی عکاسی کے حوالے سے اردو ناولوں کا جائزہ لیا تو اس سلسلے میں ہمیں بڑی مایوسی ہوئی اس لیے کہ آزادی سے قبل لکھے گئے اردو ناولوں میں جدو جہد آزادی کی عکاسی بہت کم نظر آتی ہے ۔آزادی سے قبل ڈپٹی نذیر احمد، پریم چند،سجاد ظہیر اور عزیز احمد ایسے ناول نگار ہیں جن کے ناولوں میں جدو جہد آزادی کی عکاسی ملتی ہے ۔ پریم چند نے جس وقت اپنے ناولوں میں جدو جہد آزادی کے واقعات وسانحات کو پیش کر رہے تھے اس وقت آزادی کی لڑائی شباب پر تھی ۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دوسرے ناول نگار بھی اس موضوع پر قلم چلاتے ،شاید اس وقت کے حالات اس کی اجازت نہ دیتے رہے ہوں اس لیے کہ اس زمانے

میں ہر ہندوستانی انگریزوں سے ڈرا اور سہما ہوا تھا۔ پریم چند بھی جب تک سرکاری ملازم تھے اپنی تخلیقات میں کھل کر انگریزوں کی مخالفت نہیں کر پاتے تھے ۔ اس لیے انہوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔اس کے بعد کھل کر انگریزوں کے خلاف لکھتے رہے۔

پریم چند نے اپنے ناولوں میں جس عہد کی ترجمانی کی ہے اس عہد کا انہوں نے خود تجربہ اور مشاہدہ کیا تھا۔ پریم چند نے ساحل پر کھڑے ہو کر صرف طوفان کا نظارہ نہیں کیا تھا بلکہ اس طوفان کے شکار بھی ہوئے تھے۔

پریم چند نے اس ناول میں اپنے عہد کے سیاسی حالات کو بڑے سلیقے اور ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ چوگانِ ہستی کا زمانۂ تحریر ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک ہے۔ یہ وہی وقت ہے جب پورے ملک میں عدمِ تعاون تحریک اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی تھی اور گاندھی جی پر سول نافرمانی تحریک کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا چنانچہ مہاتما گاندھی نے مجبور ہو کر سول نافرمانی تحریک شروع کرنے کا اعلان کر دیا۔ گاندھی جی نے عوام سے اپیل کی تھی کہ تحریک پوری طرح سے پرامن ہونی چاہیئے ،لیکن ایسا نہیں ہو سکا اور چوری چورا کا واقعہ پیش آ گیا۔ اس واقعے سے گاندھی جی اتنا متاثر ہوئے کہ انہوں نے ۱۲ر فروری ۱۹۲۲ء کو اس تحریک کو نامعلوم مدت کے لیے روک دی۔

تحریک آزادی کے دوران میں گاندھی جی کے اس روپ کو پیش کرنے کے لیے پریم چند نے ''چوگان ہستی'' جیسا ناول لکھا۔ اگر دیکھا جائے تو ایک طرح سے پریم چند کا یہ ناول گاندھی جی کے خیالات اور ان کی تعلیمات کی مکمل تفسیر ہے۔

سورداس ہندوستان کی جدوجہد آزادی کی ایک روشن علامت ہے جو گاندھی جی کی سرپرستی وقیادت میں عدم تشدد کے ذریعے لڑی جا رہی تھی ۔سورداس اپنے حق کے لیے لڑتا ہے جب کہ جان سیوک اس کا حق چھین لینا چاہتا ہے۔ چوگان ہستی کے ذریعے پریم چند نے جدوجہد آزادی کی پوری فضا ہمارے سامنے پیش کر دی جو اس وقت موجود تھی۔

''میدان عمل''میں پریم چند نے ایک بار پھر ہندوستان کی قومی اور سیاسی جدوجہد کو موضوع بنایا ہے۔

یہ ناول پریم چند نے ۱۹۲۹ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۳۰ء میں ختم کیا۔ تمام تحریکیں زور پکڑ چکی تھیں۔ اس سال سائمن کمیشن آیا۔ کانگریس اور کئی سیاسی جماعتوں نے اس کا بائیکاٹ کیا، ہر جگہ اس کمیشن کے خلاف کالی جھنڈیوں کے ذریعے مظاہرے کیے گئے۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء میں کانگریس نے مکمل آزادی کا مطالبہ شروع کیا اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ چنانچہ اپریل ۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی کی سرکردگی میں ڈانڈی کے مقام پر نمک کے قانون کی خلاف ورزی کی گئی اور ملک کے کئی مقامات پر قانون توڑ کر نمک تیار کیا گیا۔ اسی زمانے میں کانگریس کے صدر پنڈت جواہر لال نہرو کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس طرح آزادی کی یہ جنگ تیز سے تیز تر ہوتی گئی اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کو جیل جانا پڑا۔ یہ تھے اس وقت کے سیاسی حالات جس میں پریم چند نے اپنا ناول ''میدان عمل'' لکھا۔ میدان عمل میں تمام حالات کی عکاسی پریم چند نے بڑے فنکارانہ انداز میں کیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ سیدھا سادھا ہے۔

امرکانت اس ناول کا مرکزی کردار ہے، وہ ایک قوم پرست اور حریت پسند نوجوان ہے۔ امرکانت اپنے رئیس باپ کو چھوڑ کر گاندھیائی فلسفے کے زیر اثر کھدر بیچ کر زندگی بسر کرنے لگتا ہے۔ ادھر امرکانت کے گھر چھوڑنے کے بعد اس کی بیوی سکھدا کی زندگی میں بڑی تبدیلی آتی ہے۔ وہ بھی قومی سرگرمیوں میں لگ جاتی ہے۔ مزدوروں کی تحریک میں حصہ لیتی ہے اور جدوجہد کرتی ہے۔ آخر میں سکھدا اپنی ان تحریکوں میں کام کرنے کے باعث جیل چلی جاتی ہے اور اس کا شوہر امرکانت اس تحریک کو آگے بڑھاتا ہے لیکن وہ بھی گرفتار ہو کر جیل چلا جاتا ہے۔ اس کے بعد امرکانت کا باپ سمرکانت بھی اس تحریک میں شامل ہو جاتا ہے اور گرفتار ہو جاتا ہے۔ اس کے گرفتار ہونے کے بعد تحریک میں جان آجاتی ہے ایک ایک کر کے سب اس تحریک میں شامل ہو جاتے ہیں۔

سلیم کا سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے کر اس جدوجہد میں شریک ہونا عدم تعاون کی تحریک کو نمایاں کرتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ پریم چند نے اس ناول میں ہندوستان کی پوری سیاسی ،سماجی اور معاشی زندگی کو سمیٹنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

''لندن کی ایک رات'' ترقی پسند تحریک کے زیر اثر لکھا جانے والا اولین ناول ہے۔جس وقت یہ ناول تصنیف کیا گیا اس وقت ہندوستان جن حالات سے دو چار تھا اور جو خیالات نوجوانوں میں پرورش پا رہے تھے اس ناول میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں، یہ وہی وقت تھا جب ملک کے نوجوانوں میں انقلابی رجحان پیدا ہو رہا تھا۔اس لیے کہ اس وقت اشتراکی خیالات پروان چڑھ رہے تھے۔اس ناول میں اعظم اور راؤ کے درمیان جو گفتگو ہوئی ہے اس میں وہ ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

''وطن کی بھلائی کے لیے کوشاں ہیں۔ذرا مجھے بتایئے تو سہی کسی کو یہ تک معلوم نہیں، وطن کی بھلائی کس چڑیا کا نام ہے،اس لیے کوشاں ہونا تو درکنار زنانہ بن کر چرخہ کاتنے میں وطن کی بھلائی ہے یا مہاتما کی طرح سچ کی کھوج کرنے میں وطن کی بھلائی ہے یا کونسل کی ممبری میں یا منسٹری میں وطن کی بھلائی ہے یا سوشل ریفارم اور اچھوت کانفرنس میں حصہ لینے میں وطن کی بھلائی ہے''

اس ناول میں انگریزی سامراجیت کے خلاف اندر اندر دہکتی آگ کے اثرات بھی دیکھے جاسکتے ہیں اس ناول کے کردار داخلی انتشار اور کشمکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔سجاد ظہیر نے ہندوستان کے سیاسی وسماجی حالات کے پس منظر میں اس طبقے کی تصویر کشی کی ہے جو پرانی قدریں چھوڑتا بھی نہیں اور نئی قدروں کو اپناتا بھی نہیں۔لندن میں زیر تعلیم طلباء جو مغربی افکار ونظریات سے متاثر ہیں ان میں سے ایک احسان بھی ہے جو اشتراکی خیالات سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے اور شاید یہی سبب ہے کہ وہ انگریزی سامراج اور ہندوستانی سرمایہ دارانہ نظام دونوں کو نہ صرف یہ کہ ناپسند کرتا ہے بلکہ اس کی خرابیوں پر بھی کھل کر تنقید کرتا ہے۔

عزیز احمد نے ''آگ'' میں کشمیر کے معاشرتی اور تہذیبی حالات اور مسائل کو پیش کیا ہے۔ کشمیر میں مختلف قسم کی آگ بھڑک رہی تھی۔یہی آگ اس ناول کا موضوع بھی ہے اور

پس منظر بھی ۔اس ناول میں ۱۹۰۸ء سے ۱۹۴۵ء تک کا زمانہ پیش کیا گیا ہے ۔اتنے طویل زمانے کو عزیز احمد نے بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کیا ہے اور تین سو صفحات میں مکمل کر دیا ہے ۔ناول نگار کا یہاں سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان کے پس منظر میں کشمیر کے حالات کی عکاسی کی گئی ہے، نیز بیداری، نئی سماجی اور سیاسی تبدیلیاں کشمیری زندگی میں سرایت کرتی دکھائی گئی ہیں ۔

جیسے جیسے ناول آگے بڑھتا ہے ویسے ویسے ناول میں سیاسی حالات کی عکاسی بڑھتی جاتی ہے، علاوہ ازیں ہندوستان میں سیاسی بیداری اور آزادی کی جدوجہد بڑھتی جاتی ہے ۔کانگریس اور لیگ کے اختلافات، دوسری جنگ عظیم کے اثرات، پاکستان کے قیام کی بحثیں، اشتراکیت کی طرف میلان، آزادی حاصل کرنے کی خواہش اور اس کے لیے جدوجہد، سیاسی شورشیں اور ہنگامے، غرض حقیقی زندگی کے یہ مختلف پہلو اور ساری افراتفری ''آگ'' ناول میں نظر آتی ہے ۔

ناول ''آگ'' میں جہاں ایک طرف کشمیری عوام کی غریبی اور جہالت کو بیان کیا گیا ہے وہیں دوسری طرف یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ مسلم کانفرنس کی شکل میں ایک سیاسی قوت وادیٔ کشمیر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جما رہی تھی جو ایک طرف ڈوگرہ شاہی کے ظلم وستم کو چیلنج کر رہی تھی تو دوسری طرف ڈوگروں اور مقامی سرمایہ داروں کے اصل آقا انگریزوں کے خلاف بھی لڑ رہی تھی ۔وادیٔ کشمیر میں مسلم کانفرنس وہی مجاہدانہ کردار ادا کر رہی تھی جو گاندھی جی، نہرو اور مولانا آزاد کی قیادت میں کانگریس ہندوستان میں کر رہی تھی ۔

آزادی کے بعد جن ناول نگاروں نے اردو ناول کو نئی سمت ورفتار عطا کی ہے ان میں قرۃ العین حیدر کا نام سرفہرست ہے ۔ان کی کاوشوں سے اردو ناول کے سرمایے میں قابل قدر اضافہ ہوا۔ ''آگ کا دریا'' قرۃ العین حیدر کا تیسرا ناول ہے ۔جو ۱۹۵۹ء میں منظر عام پر آیا۔اس ناول کو اردو ناول کی تاریخ میں موضوع وہیئت دونوں اعتبار سے اہم مقام حاصل ہے ۔

۱۹۴۷ء ہماری تاریخ کا ایک اہم مرحلہ ہے، ہندوستان تقسیم ہو کر آزاد ہوا، ملک ہی نہیں، تہذیب، خاندان اور گھر بار حتی کہ انسان کا وجود ختم ہو گیا ۔اسی تقسیم کا درد وکرب ہندوستان کے

سارے ادب خصوصاً اردو ادب میں زیادہ ملتا ہے۔اس لیے پر سارے ادیب ایک آواز ہو کر چیخ اٹھے۔اس پورے درد و کرب کا اظہار اردو ناول اور افسانوں میں بھر پور ہوا ہے۔ان ناولوں کے پس منظر میں جنگ آزادی کی وہ تمام چھوٹی بڑی تحریکات ،واقعات اور اس کے ردعمل کا احاطہ پر اثر انداز میں کیا گیا ہے۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں ہر طبقے کے لوگوں کو دکھایا گیا ہے اور اس کے بعد ہندوستان کی تقسیم پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جن میں معاشرتی ،معاشی ،جذباتی ،مذہبی اور سیاسی مسائل خاص اہمیت رکھتے ہیں ان میں سے چند پہلوؤں کو چن کر ہندوستان کے روح کی عکاسی کرداروں کے ذریعے کی گئی ہے۔

اس طرح ''آگ کا دریا'' میں ہندوستانی تہذیب کے ارتقاء کی کہانی ، ہندو مسلم مشترکہ تہذیب انگریزی سماج کی چیرہ دستیاں اور پھر اس کا زوال ،مختلف قومی تحریکیں ، ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد اور پھر آزادی کے بعد تقسیم کے مسئلیکا احاطہ بڑے کامیاب ڈھنگ سے کیا گیا ہے۔

اسی طرح جدوجہد آزادی کے عظیم رہنما مہاتما گاندھی ،اہر لال نہرو بھی اس ناول کے پس منظر میں موجود ہیں جن کی اعلیٰ انسانی خدمات اور روحانیت کے فلسفے کو سراہا گیا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''آگ کا دریا'' میں کسی نہ کسی حوالے سے جدوجہد آزادی کا تذکرہ ملتا ہے۔

''آخری شب کے ہمسفر'' قرۃ العین کی ایک نہایت اہم تصنیف ہے۔انہوں نے یہ ناول ۱۹۷۹ء میں لکھا ہے۔ یہ ناول بنگال کی دہشت پسندی اور انقلابی تحریک ۱۹۴۲ء کے آندولن ،مطالبہ پاکستان تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔اس ناول میں دیپالی سرکار، متوسط ہندو طبقے کی ایک تعلیم یافتہ دوشیزہ ہے جو حصول آزادی کے لیے ریحان کے ساتھ مل کر دہشت گردی میں حصہ لیتی ہے۔ پھر روزی بنرجی جو ایک غریب پادری کی بیٹی ہے وہ سین پر نمودار ہوتی ہے، انگریزوں کے خلاف تحریک میں حصہ لیتی ہے، لاٹھی چارج میں حصہ لیتی ہے۔ لاٹھی چارج میں زخمی ہو کر جیل جاتی ہے اور پھر ضمانت پر رہا ہوتی ہے۔

اس ناول میں ناول نگار نے دیپالی کا کردار سنوارنے میں بڑی محنت کی ہے اور دیپالی کو

سچا محبّ وطن ثابت کیا ہے ۔تحریکِ آزادی اور انقلابی تحریک کو موثر بنانے میں دیپالی سرکار کا کردار اپنی مثال آپ ہے ۔ ہندوستانیوں کے خلاف انگریزوں کی سازش کا پردہ فاش کرنے کی غرض سے کلکٹر کی کوٹھی پر کلثوم کا روپ اختیار کر کے گھریلو ملازمہ تک بن جاتی ہے ۔ان واقعات اور کرداروں سے اس جدوجہد آزادی کی عکاسی ہورہی ہے جو اس وقت پورے بنگال میں پھیلی ہوئی تھی اور اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ سارے ملک کے باشندوں کو انگریزوں سے نجات پانے کی کتنی شدید خواہش تھی اور اس آزادی کے حصول کے لیے سخت سے سخت محنت ومشقت برداشت کرنا گوارا تھی ۔

''آنگن'' خدیجہ مستور کا بے حد دل چسپ ناول ہے ۔اس ناول میں ایک اچھے ناول کی قریب قریب ساری خوبیاں موجود ہیں ۔اس ناول کا آغاز تحریکِ آزادی ہند سے ہوا ہے اور تحریک عدم تعاون کی تحریک کے مناظر کو پیش کرتا ہوا، فرقہ وارانہ، فسادات، تقسیم ہند اور اعلانِ آزادی پر ختم ہوجاتا ہے ۔

بیسویں صدی کے ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور اقتصادی کشمکش میں ہندوستان کے متوسط طبقے نے جو حصہ لیا ہے اس کا ذکر خدیجہ مستور نے اس ناول میں پیش کیا ہے ۔مسلم خاندان کا وہ متوسط طبقہ جس نے جدوجہد آزادی میں اپنی ذہنی صلاحیت اور جان و مال لٹانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی اس ناول کے پلاٹ کا مرکز ہے ۔ یہ خاندان اتر پردیش سے تعلق رکھتا ہے ۔ یہ ناول مختلف کرداروں کے ذریعے آگے بڑھتا ہے ۔

اس ناول کا ہر کردار اپنے دائرۂ عمل میں ایک علامت ہے ۔خصوصاً بڑے چچا کا کردار ایک علامت ہے کہ آزادی کی قربان گاہ پر سب کچھ قربان کردینے والوں میں سے ہیں ۔تحریک آزادی میں گھر پھونک کر شریک ہوئے اور متعدد بار جیل کاٹ چکے ہیں ۔آزادی کے متوالوں نے آزادی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا، گولیاں کھائیں، جیل گئے اور تختۂ دار پر مسکراتے ہوئے چڑھ گئے ۔ بڑے چچا بھی اپنی جان وطن عزیز پر قربان کردیں ۔

اس ناول میں متوسط طبقے کے ایک گھر کی قومی سیاست کے زیرسایہ بدلتی ہوئی اقتصادیات

اورنفسیاتی کیفیات کا احاطہ کیا گیا ہے ۔اس گھر کے افراد تحریک آزادی سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ ہیں اسی لیے گھر کے آنگن میں ہر وقت مختلف اور مخالف سیاسی نظریات کا اکھاڑا بنا رہتا ہے ۔

جدید ناول نگاروں میں عبدالصمد کا مقام ومرتبہ بہت نمایاں ہے ۔''دوگز زمین'' عبدالصمد کا مقبول ترین ناول ہے۔عبدالصمد کا یہ ناول آزادی کے بعد نصف صدی سے زائد کا زمانہ گزرنے کے باوجود بھی تحریک آزادی کے بعض دلچسپ گوشوں کو پیش کرتا ہے۔''دوگز زمین '' کی ابتداء بہار کے ایک ایسے گاؤں سے ہوتی ہے جس کے زمین دار، شیخ الطاف حسین ہیں، جو تحریک خلافت کے زبردست حامی ہی نہیں بلکہ اس تحریک کے ایک مخلص کارکن کی حیثیت کے حامل ہیں ۔ یہ حصولِ آزادی اور خلافت تحریک میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔انہوں نے تحریک خلافت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور سیاست پر خوب روپیہ بھی خرچ کیا۔ ''دوگز زمین '' کانگریس پارٹی کی ابتداء سے ۱۹۸۱ء تک کے سیاسی اور سماجی حالات کا خصوصی تجزیہ ہے۔اس ناول سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ کس طرح کانگریس کا مقصد آزادی سے قبل انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اور عوام کی بہبود وسلامتی تھا۔عبدالصمد کے ناول ''دوگز زمین'' کا آغاز تحریک خلافت سے ہوتا ہے ۔تحریکِ خلافت اس زمانے کی تحریک تھی جس وقت تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی ۔ ہندو مسلم اتحاد خلافت کے عہد میں بے مثال تھا۔

''اداس نسلیں'' عبداللہ حسین کا ایک بہت مقبول ناول ہے ۔ یہ ناول پہلی جنگ عظیم سے ہندوستان کی جنگ آزادی تک محیط ہے ۔

نعیم اس ناول کا مرکزی کردار ہے ۔وہ عالم گیر جنگ سے واپس آکر ملک کی آزادی کی تحریک میں شامل ہوجاتا ہے ۔ پہلے اس نے دہشت پرست قوم پرستوں کی تنظیم میں شمولیت حاصل کی ۔اس کے بعد وہ کانگریسی تحریک سے وابستہ ہوگیا۔آزادی کی تحریک سے وابستگی کے نتیجہ میں ملک کی متعدد طاقتوں، سیاسی لہروں اور قومی دھاروں کی آئینہ دار ہوتی ہے ۔

''مسلم لیگ'' کا زور ''جلیان باغ والا'' حادثہ، نمک تحریک، عدم تعاون تحریک' صوبۂ

سرحد میں کانگریس تحریک کا اثر ، سائمن کمیشن ، تبادلہ آبادی وغیرہ معاملات ومسائل وغیرہ کہیں ہلکے اور کہیں گہرے رنگ میں پیش کیے گئے ہیں کسی کا نقش سیدھا سادھا اور وقتی ہے اور کسی کا پیچیدہ اور دیرپا۔

نعیم کانگریس کے بہت سے پروگراموں میں شریک ہوتا ہے، وہ رولٹ ایکٹ کے خلاف مظاہرہ کراتا ہے ۔جلیان باغ والا ، کے قتل عام کی انکوائری کمیٹی میں حصہ بھی لیتا ہے ۔گاؤں گاؤں گھوم کر انگریزوں کے خلاف تقریر کرتا ہے اور عوام کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کرتا ہے ۔جیل جاتا ہے ،حکومت اس کا کراس ضبط کر لیتی ہے لیکن آزادی کی تحریک زور پکڑتی جاتی ہے اور بالآخر ملک آزاد ہوتا ہے اور یہ پوری قوت سے پکار اٹھتا ہے ۔انقلاب زندہ آباد

آزادی کے بعد لکھے گئے ایسے ناول جن میں کسی نہ کسی حیثیت سے جدوجہد آزادی کی عکاسی ہوئی ،اس میں ایک جمیلہ ہاشمی کا مقبول ترین ناول ''تلاش بہاراں'' بھی ہے ۔اس ناول میں ناول نگار نے دکھایا ہے کہ سو برس تک ایک قوم بہادروں کی تلاش اور روشن مستقبل کی جستجو میں منہمک رہتی ہے اور اس کا انجام فرقہ وارانہ فسادات اور قتل وغارت گری کی شکل میں آتا ہے۔

اس ناول کا مرکزی کردار کنول کماری ہے ۔وہ اعلیٰ ذات سے تعلق رکھتی ہے مگر وہ ذات پات کی تفریق اور تعصب سے بہت اونچی ہے، چنانچہ یہ عورت کرشنا کی حمایت میں پرزور بیان دیتی ہے پھر اس عورت کا تعلق مختلف قسم کی سماجی تحریکوں سے ہو جاتا ہے ۔جب ملک کی آزادی کی جنگ لڑی جاتی ہے تو کنول بھی عورتوں کو اپنے نقطۂ نظر کے تحت منظّم کرتی ہے ۔سیاسی لڑائی میں وہ کسی کے پیچھے نہیں رہتی ۔

اس ناول کا آخری حصہ ملک کی آزادی ،کانگریس اور مسلم لیگ کے سیاسی اختلافات ، پاکستان کے قیام اور فرقہ وارانہ فسادات پر مشتمل ہے۔

حیات اللہ انصاری کا شمار اردو کے ممتاز ناول نگاروں میں ہوتا ہے''لہو کے پھول'' ان کا ایک اہم ناول ہے،''لہو کے پھول'' کو کافی شہرت ومقبولیت ملی ہے ۔لہو کے پھول اردو کے کچھ ضخیم ناولوں میں شامل ہے ۔یہ ناول پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس ناول میں حیات اللہ

انصاری نے تقسیم ملک سے قبل اور تقسیم کے بعد کے ہندوستان کی سماجی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی اور مذہبی حالات کو بڑے ہی فنکارانہ طور پر پیش کیا ہے۔ یہ ناول دہلی دربار ۱۹۱۱ء سے شروع ہوکر یوم آزادی اور پھر ہندو مسلم فسادات اور گاندھی جی کے المناک حادثہ سے ہوکر ہندوستان کے پہلے پنج سالہ منصوبہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی خیال ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد ہے۔ اس ناول میں جدوجہد آزادی سے متعلق، تاریخی واقعات وسانحات کو کرداروں کے حوالے سے پیش کیا گیا ہے اس ناول میں بے شمار کردار ہیں اور سینکڑوں کہانیاں ہیں، اہم کرداروں کی حیثیت سے راحت اور فرخ کا کردار سامنے آتا ہے۔

خواجہ احمد عباس کا ناول ''انقلاب'' ایک سیاسی ناول ہے اس ناول میں خواجہ احمد عباس نے تحریک آزادی کے ابتدائی مراحل کے واقعات کو موضوع بنایا ہے جس میں ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۲ء تک کے ہندوستان کے سیاسی حالات کو بڑی ہنرمندی اور سلیقے سے پیش کیا ہے۔ یہ ناول جلیاں والے باغ کے خونی واقعات سے شروع ہوکر ''نمک ستیہ گرہ'' اور ''گاندھی ارون پیکٹ'' پر ختم ہوجاتا ہے۔ اس ناول میں مختلف سیاسی نظریات، گروپوں اور تحریکوں جو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۳۲ء تک شروع ہوئی تھیں۔ ان کا تفصیلی ذکر ملتا ہے، جس سے جدوجہد آزادی کے واقعات کی بھرپور عکاسی ہوئی ہے۔ مثلاً مارکس کی اشتراکیت، گاندھی جی کی اہنسا، کانگریس پارٹی، مسلم لیگ، جمعیۃ العلماء، سبھاش چندر بوس، بھگت سنگھ، خان عبدالغفار خان، راج گوپال آچاریہ، راج گرو، سکھ دیو وغیرہ۔ اس ناول میں کسانوں اور مزدوروں وغیرہ کے سیاسی نظریات اور تحریکوں پر روشنی پڑتی ہے۔

''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' دور جدید کے ناولوں میں سے ہے، یہ نورالحسنین کا دوسرا ناول ہے۔ میرے خیال میں اردو کا پہلا ناول ہے جس میں مکمل طور پر جدوجہد آزادی کی عکاسی ملتی ہے اس طرح کے ناول لکھنے کی تحریک نورالحسنین کو کہاں سے ملی، انہیں کے الفاظ میں سنیے وہ اس ناول کے دیباچے میں ''دو باتیں آپ سے'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

''اس ناول کو لکھنے کا خیال میرے دل میں اس طرح آیا ہے کہ میں ڈاکٹر معین الدین جینا

بڑے کی تنقیدی کتاب، ''اردو میں بیانیہ کی روایت'' پڑھ رہا تھا۔اس میں انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء کا اتنا بڑا المومنٹ مکمل طور پر ہمارے کسی ناول کا حصہ نہ بن سکا۔ اسے پڑھ کر مجھے بھی حیرت ہوئی اور میں نے بھی اس چیلنج کو قبول کیا اور آٹھ فروری ۲۰۱۲ء کی رات دو بجے اس ناول کی پہلی سطر نے کاغذ کی سطح پر آنکھ کھولی اور آٹھ مئی ۲۰۱۲ء کی رات دو بجے اس ناول کی آخری سطر نے اپنے مکمل ہونے کا اعلان کیا''

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ زیرِنظر ناول ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی پر محیط ہے۔ ہماری تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ جنگ آزادی کی تاریخ میں صرف انہیں لوگوں کے نام درج ہیں جو کسی نہ کسی طور پر معروف ہیں لیکن ان لوگوں کے نام تاریخ کے صفحات سے غائب ہیں جنہوں نے شہرت و ناموری کی پرواہ کیے بغیر صرف اپنے حوصلے، طاقت اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر اپنی جانوں کا قیمتی نذرانہ ملک کی آزادی کے لیے پیش کیا ہے۔نور الحسنین نے اپنے اس ناول میں ایسے ہی گم نام جانبازوں کو سامنے رکھ کر اس ناول کو ترتیب دیا ہے، جو یقیناً قابل ستائش ہے، اور وہ بے انتہا مبارکباد کے مستحق ہیں۔

جدوجہد آزادی کی ایک اہم تحریک، جس کو تاریخ میں ''ریشمی رومال کی تحریک'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔اس تحریک کے روح رواں اور قائد حضرت شیخ الہندؒ تھے وہ اس کے لیے بہت عرصے سے تیاری کر رہے تھے یہ عجلت میں تیار کیا ہوا کوئی پلان نہیں تھا۔اگر یہ تحریک کامیاب ہوگئی ہوتی تو اس وقت ہندوستان کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا۔مگر کسی بھی ناول نگار نے اس تحریک کا ذکر نہیں کیا۔

جنگ آزادی میں جہاں مردوں نے اپنی قربانیاں پیش کی ہیں وہیں عورتیں بھی اس میں شامل رہی ہیں۔مگر ناول نگاروں نے عورتوں کی خدمات کا تذکرہ بہت کم کیا ہے۔اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کی ایک اہم جماعت جمعیۃ علماء ہند ہے۔یہ جماعت شروع سے اخیر تک آزادی کی جنگ میں شریک رہی مگر اردو ناولوں میں سوائے خواجہ احمد عباس کے کسی نے تذکرہ نہیں کیا ہے، ضرورت اس بات کی ہے ہمارے ناول نگار اس طرف بھی توجہ مرکوز کریں۔پھر بھی

بحیثیت مجموعی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اردو کے بہت سے ناولوں میں جدوجہد آزادی کی عکاسی ہوئی ہے۔ چنانچہ ہم نے ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''ابن الوقت'' اور پریم چند کے ناول ''چوگانِ ہستی'' سے نورالحسنین کے ناول ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ'' تک کے مختلف ناولوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے۔

☆☆☆

کتابیات

بنیادی مواد:

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
	ابن الوقت	ڈپٹی نذیر احمد	کتاب گھر دہلی	
۱	منشی پریم چند	چوگانِ ہستی	نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا	۲۰۰۵ء
۲	منشی پریم چند	میدانِ عمل	مکتبہ جامعہ نئی دہلی	۲۰۰۷ء
۳	سجاد ظہیر	لندن کی ایک رات	آزاد کتاب گھر دہلی۔۶	۱۹۹۵ء
۴	حیات اللہ انصاری	لہو کے پھول	کتاب داں لکھنؤ	
۵	عبداللہ حسین	اداس نسلیں	بسمہ کتاب گھر دہلی	۲۰۱۲ء
۶	قرۃ العین حیدر	آخری شب کے ہم سفر	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۸ء
۷	قرۃ العین حیدر	آگ کا دریا	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۲ء
۸	عزیز احمد	آگ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	
۹	خدیجہ مستور	آنگن	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۰ء
۱۰	جمیلہ ہاشمی	تلاش بہاراں		
۱۱	خواجہ احمد عباس	انقلاب	نیا سنسار بمبئی۔۵۴	
۱۲	عبدالصمد	دو گز زمین	ایجوکیشنل بک ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
۱۳	نور الحسنین	ایوانوں کے خوابیدہ چراغ	عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی	۲۰۱۳ء

ثانوی مواد

نمبر شمار	مصنف کا نام	کتاب کا نام	مقامِ اشاعت	سن اشاعت
۱۴	سمت سرکار	جدید ہندوستان	قومی کونسل نئی دہلی	۲۰۰۳ء
۱۵	تاراچند	تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند جلد اول	قومی کونسل نئی دہلی	۲۰۱۱ء
۱۶	تاراچند	تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند جلد دوم	قومی کونسل نئی دہلی	۲۰۰۱ء
۱۷	تاراچند	تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند جلد سوم	قومی کونسل نئی دہلی	۲۰۰۲ء
۱۸	تاراچند	تاریخِ تحریکِ آزادیِ ہند جلد چہارم	قومی کونسل نئی دہلی	۲۰۰۱ء
۱۹	طفیل احمد منگلوری	روشن مستقبل		
۲۰	پروفیسر ناز قادری	اردو ادب کی ادبی تاریخ	گلشن پبلشر	۱۹۹۳ء
۲۱	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	آج کا اردو ادب	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۸ء
۲۲	علی عباس حسینی	اردو ناول کی تاریخ اور تنقید	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۸
۲۳	جمیل جالبی	تاریخ ادبِ اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، دہلی	۲۰۰۲ء
۲۴	سیدہ جعفر و گیان چند جین	تاریخ ادبِ اردو	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، دہلی	۱۹۹۸ء
۲۵	ابوالکلام قاسمی (مترجم)	ناول کا فن	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، دہلی	۲۰۰۱ء
۲۶	احسن فاروقی	ناول کیا ہے	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، دہلی	۲۰۰۶ء
۲۷	ڈاکٹر ابن کنول	داستان سے ناول تک	شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی	۲۰۰۱ء
۲۸	ڈاکٹر یوسف سرمست	بیسویں صدی میں اردو ناول	ترقی اردو بیورو نئی دہلی	۲۰۰۰ء
۲۹	وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، دہلی	۲۰۰۳ء
۳۰	دردانا قاسمی	داستان ناول اور افسانہ	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، دہلی	۱۹۹۹ء
۳۱	سید احتشام حسین	اردو ادب کی تنقیدی تاریخ	قومی کونسل، دہلی	۲۰۰۶ء
۳۲	محمد مجیب	تاریخ تمدن ہند	مکتبہ جامعہ لیمیٹیڈ نئی دہلی	۱۹۹۹ء
۳۳	نگینہ چپن	اردو ناول کا سماجی و سیاسی مطالعہ	کیشو پرکاش الہ آباد	۲۰۰۲ء
۳۴	رام بابو سکسینہ	تاریخ ادب اردو	ادارہ کتاب الشفا نئی دہلی	۲۰۰۲ء

۳۵	سہیل بخاری	اردو ناول نگاری	اطہر پبلیکیشن، دہلی	۱۹۷۲ء
۳۶	زرینہ عقیل	اردو ناول میں سوشلزم	الہ آباد	۱۹۸۲ء
۳۷	محمد حسن	اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی	۱۹۹۸ء
۳۸	ڈاکٹر خالد اشرف	برصغیر میں اردو ناول	گلشن راوی، لاہور	۱۹۹۵ء
۳۹	ڈاکٹر انور پاشا	ہندو پاک اردو ناول	پیش رو پبلی کیشنز	۱۹۹۲ء
۴۰	نورالحسن نقوی	تاریخ ادب اردو	ایجوکیشن بک ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۸ء
۴۱	پنڈت کنہیالال کپور	تاریخ بغاوت ہند	بک کارپوریشن دہلی	۲۰۰۸ء
۴۲	ڈاکٹر ہمایون اشرف	فکشن کی بازیافت	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
۴۳	ڈاکٹر منتظر مہدی	ترقی پسند اور اردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵ء
۴۴	ڈاکٹر زرینہ عقیل احمد	اردو ناولوں میں سوشلزم	اسرار کریمی پریس الہ آباد	۱۹۸۲ء
۴۵	سید محمد میاں	علماء ہند کا شاندار ماضی	فیصل انٹرنیشنل دہلی	۲۰۱۴ء
۴۶	سید ابوظفر ندوی	مختصر تاریخ ہند	شبلی اکیڈیمی، اعظم گڑھ	
۴۷	محمد الیاس ندوی	تاریخ ہند	الحسنات بک پرائیوٹ لمیٹیڈ	۲۰۱۲ء
۴۸	سید صباح الدین	ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک	شبلی اکیڈیمی، اعظم گڑھ	۱۹۹۰ء
۴۹	سید محمد میاں	تحریک شیخ الہند	نگارشات، ٹمپل روڈ لاہور	۱۹۹۱ء
۵۰	محمد سلمان منصور پوری	تحریک آزادی ہند میں علماء اور عوام کا کردار	کتب خانہ نعیمیہ، دیوبند	۲۰۰۴ء
۵۱	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی	جدید ہندوستان کے سیاسی اور سماجی افکار	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی	۲۰۰۴ء
۵۲	ڈاکٹر علی جاوید	اردو کا داستانوی ادب	اردو اکادمی دہلی	۲۰۱۱ء
۵۳	عبدالقیوم ابدالی	فکشن اور قاری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۱ء

۵۴	ڈاکٹر محمد شاہد صدیقی	جنگ آزادی کے سرخیل	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۳ء
۵۵	ڈاکٹر عبدالرشید خان	اردو کہانی میں وطنیت اور اتحاد	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۱ء
۵۶	ڈاکٹر مبارک علی	آخری عہد مغلیہ کا ہندوستان	مکتبۃ الحسنات، دہلی	۲۰۱۳ء
۵۷	اسیر ادروی	تحریک آزادی اور مسلمان	دارالمولفین، دیوبند	۲۰۱۴ء
۵۸	ڈاکٹر انور سدید	اردو ادب کی تحریکیں	کتابی دنیا دہلی	۲۰۰۸ء
۵۹	ڈاکٹر احمد صغیر	اردو ناول کا تنقیدی جائزہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۲۰۱۵ء
۶۰	پون چندر، مترجم: سعید احمد	حصول آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی	۲۰۱۴ء
۶۱	پروفیسر قمر رئیس	اردو میں بیسویں صدی کا افسانوی ادب	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۴ء
۶۲	سید محمد عقیل	جدید ناول کا فن	سرسوتی آفسیٹ پریس، الہ آباد	
۶۳	پروفیسر ظفر احمد نظامی	تاریخ ہند عہد جدید	انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، دہلی	۲۰۱۵ء
۶۴	ڈاکٹر منظر اعظمی	اردو ادب کے ارتقاء میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ	اتر پردیش اردو اکادمی لکھنو	۲۰۰۹ء
۶۵	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	اردو ناول کے اسالیب	تخلیق کار پبلیشر، دہلی	
۶۶	ڈاکٹر درخشاں تاجور	ہندوستان کی جدوجہد آزادی پر ایک نظر	نصرت پبلیشر لکھنو	۱۹۹۱ء
۶۷	مانک ٹالا	توقیت پریم چند	مکتبہ جدید نئی دہلی	۲۰۰۲ء
۶۸	ڈاکٹر سورج دیو سنگھ	اردو اور ہندی کے سیاسی ناول	ایجوکیشنل پبلیشنک ہاؤس، دہلی	۲۰۰۶ء
۶۹	ڈاکٹر محمد نسیم	اردو ناول پر تقسیم ہند کے المیے کے اثرات	ایجوکیشنل پبلیشنک ہاؤس، دہلی	۲۰۱۲ء
۷۰	ڈاکٹر ریاض احمد	ترقی پسند تحریک اور اردو ناول		۲۰۰۷ء

☆☆☆

رسائل وجرائد

نمبر شمار	رسالہ کا نام	جلد نمبر	شمارہ نمبر	مقام اشاعت	سن اشاعت
۱	ایوان اردو	۲۱	۹	اردو اکادمی، دہلی	۲۰۰۸ء
۲	نیا سفر (فکشن نمبر)	۔	۱۸۔۱۹	سرسوتی پریس، الہ آباد	۲۰۰۲ء
۳	ادیب (پریم چند نمبر)	خصوصی شمارہ		جامعہ اردو، علی گڑھ	۔
۴	اردو جرنل	خصوصی شمارہ	۔	شعبہ اردو، پٹنہ، یونیورسٹی، پٹنہ	۲۱۰

☆☆☆☆